بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
اگست 2021
www.pklibrary.com
پی۔کے لائبریری
ڈاٹ کام
www.pklibrary.com
KIRAN SHUAA & KHAWATEEN
DIGEST FAN'S

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — آذر ریاض

مدیرہ اعزازی — امت الصبور

فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار کراچی

واٹس اپ
03172266944

pklibrary.com

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 8
حمد، تنویر بھول 9
نعت، ایم یوسف وحید 9
نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 10

انٹرویو

نئے چراغ جلیں گے، حبیب خان 22
طلعت حسین سے ملاقات، شاہین رشید 30
دستک، شاہین رشید 248
جب تجھ سے ناتا، ر۔ و 19
بیٹھ کر سیر دو جہاں کرتا، آمنہ زریں 15

ناول

نورالقلوب، تنزیلہ ریاض 186
شام کی حویلی میں، رخسانہ نگار عدنان 36

مکمل ناول

عسر یسرا، حنا حنیف 144
وہ تیری یاد تھی، نعیمہ ناز 64
طلوع عشق، عنبرین ابدال 100

ناولٹ

تم پہ قربان، فرحانہ انجم 170

افسانے

گرہ، عندلیب زیب 59
عید بقر عید، ہاجرہ عمران 95
بھرم، حوریہ بتول 141
مرد یا عورت، ہاجرہ ریحان 224
دل، دیا، جیا، قرۃ العین سکندر 214

نظمیں، غزلیں

غزل، ساغر صدیقی 231
نظم، منیر نیازی 231
غزل، سوفی تبسم 232
نظم، محمود ایاز 232

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 960/- روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ——— 17,000/- روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ——— 20,000/- روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلے کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

pklibrary.com

رکن آل پاکستان نیوز پیپر ز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ز ایڈیٹرز
MEMBER APNS CPNE

مستقل سلسلے

خط آپ کے		رضیہ جمیل	238	آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	254
مسکراہٹیں		ادارہ	233	موسم کے پکوان	واصفہ سہیل	256
باتوں سے خوشبو آئے		شگفتہ جاہ	235	خوبصورت بننے	ادارہ	258
کھلتا کسی پہ		خالدہ جیلانی	247			
تاریخ کے جھروکے		امت الصبور	252			

اگست 2021
جلد 35 شمارہ 12
قیمت 80 روپے

رضیہ جمیل فاؤنڈیشن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

pklibrary.com

مدیحہ جمیل

اداریہ

اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

37 واں سالگرہ نمبر۔

رب کریم کے حضور سربہ سجود ہیں کہ شعاع نے ایک اور سال کی مسافت کامیابی کے ساتھ طے کرلی۔

محمود ریاض صاحب نے جب ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی تو بنیادی طور پر ان کے پیش نظر خواتین کی شخصیت کی تعمیر اور ان کی ذہنی تربیت تھی۔ ایک عورت جس سے پورا خاندان و معاشرہ جڑا ہوتا ہے، جو نسلوں کی تہذیب و تربیت کی ضامن ہوتی ہے۔

فرد معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس فرد کو عورت جنم دیتی ہے۔ اس کی تربیت کرتی ہے۔ اگر ابتدا میں ہی ایک فرد کی تربیت میں خلوص، محبت، دیانت، نیکی، سچائی اور محبت کے اوصاف شامل ہوں، اس کے راستہ بھٹکنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔

شعاع، خواتین ڈائجسٹ کی ہی ایک کڑی تھی۔ اس نے بھی یہی راہ اپنائی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہم جس مقصد کو لے کر چلے تھے، اس میں کامیابی ملی۔ آج بے شمار ہمیں خط لکھ کر اعتراف کرتی ہیں کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں، ان کی مثبت سوچ میں اور ان کی تربیت میں ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے پرچوں کا بڑا حصہ ہے۔

شعاع کی کامیابی میں ہماری مصنفین ہمارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے قارئین کو مثبت سوچ دی۔ صبر و شکر، خلوص و وفا کا سبق دیا۔ مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی پاسداری کا سبق دیا۔ ہم اپنی مصنفین کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

شعاع کی قارئین سے تو ہمارا دل کا رشتہ ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں یہ ساتھ ہمیشہ قائم رہے۔

اگست کے مہینے کی سب سے بڑی خوشی آزادی کا انمول تحفہ ہے۔ 14۔ اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک معرض وجود میں آیا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی بااصول اور بے ریا قیادت نے اپنے قلم اور اپنے عزم سے دنیا کے نقشے کو بدل دیا۔ علامہ اقبال کے خواب کو تعبیر دی۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کے تسلط سے نجات دلائی۔

آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ کوئی خوشی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے ملک کو تاقیامت قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- وہ تیری یاد تھی ۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول، ، عمر یسرا ۔ حسنہ حسین کا مکمل ناول،
- طلوعِ عشق کی پہلی کرن ۔ عنبرین ابدال کا مکمل ناول، ، نذرا ہنجرا کا ناولٹ ۔ تم پہ قربان،
- عندلیب زہرا، ہاجرہ عمران، حوریہ بتول، ہاجرہ ریحان اور قرۃ العین سکندر کے افسانے،
- نئے چراغ جلیں گے ۔ ابھرتے ہوئے مصنفین کا تعارف، ، مدیحہ ناز فنکار طلعت حسین سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک، ، پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

باری تعالیٰ

حمد

الٰہی نہیں کوئی تجھ سا شفیق
ہے لاریب تُو ربِ بیتِ شفیق

تُو ہی مالک ملک و مختار ہے
تُو ہی میرا والی ہے تُو ہی رفیق

نہیں جانتا اپنا خود حال میں
کہ دل کا سمندر ہے بے حد عمیق

ہر اک فتنۂ دہر سے دے نجات
رہوں بحرِ رحمت میں تیرے غریق

ترے اور تری خلق کے سب حقوق
گراں بار ہیں، بخش ربِ خلیق

مجھے رکھ تُو زمرے میں ابرار کے
کہ ہوں راہِ جنّت میں میرے رفیق

بس اب قلبِ مسلم پہ آسان کر
مقابل ہیں جتنے مسائل دقیق

ابوالامتیاز

سلام

مُصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

مہرِ چرخِ نبوت پہ روشن درود
گُلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام

شہریارِ ارم تاجدارِ حرم
تو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد درود
ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اُس دلافروز ساعت پہ لاکھوں سلام

ایک میرا ہی رحمت پہ دعویٰ نہیں
شاہ کی ساری اُمّت پہ لاکھوں سلام

کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور
بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام

امام احمد رضا خان

pklibrary.com

دعا کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتا، اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے۔'' (ترمذی)

فوائد و مسائل:

(1) دعا ایک عبادت ہے کیونکہ اس میں بندہ اللہ کے سامنے اپنے فقر اور عجز کا اظہار کرتا ہے، اور اللہ کی عظمت و قدرت کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے اپنی حاجت پوری ہونے کی درخواست کرتا ہے۔ بنابریں دعا نہ کرنا عبادت سے اعراض ہے، اس لیے اللہ کی ناراضی کا باعث ہے۔

(2) دعا میں ان آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے جو احادیث میں بیان ہوئے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''دعا ہی عبادت ہے۔'' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔

''اور تمہارے رب نے فرمایا: مجھے پکارو میں تمہاری پکار قبول کروں گا۔'' (ابوداؤد)

فائدہ:

(1) کسی مخلوق سے ایسی چیز کا سوال کرنا جو صرف اللہ کے اختیار میں ہے، اس مخلوق کی عبادت ہے، لہٰذا شرک ہے۔ وہ مخلوق خواہ بے جان پتھر، سورج، ستارے، درخت وغیرہ ہوں یا کوئی حیوان، جن، فرشتہ، ولی یا نبی، ان سے اسباب سے ماورا طریقے سے کچھ طلب کرنا شرک ہے۔

عزت والی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ہاں دعا سے بڑھ کر کوئی چیز عزت والی نہیں۔'' (ترمذی)

فوائد و مسائل:

(1) دعا کے ذریعے سے اللہ کے ہاں عزت اور رفعت حاصل ہوتی ہے۔

(2) دوسرے اعمال کے ذریعے سے بھی اللہ کے ہاں بلند مقام حاصل ہوتا ہے لیکن ان کے ساتھ بھی دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(3) اعمال کی قبولیت کے لیے اللہ سے دعا کی جاتی ہے، اس لیے بھی دعا کو اہمیت حاصل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے۔ ''اے میرے رب! میری مدد فرما، اور میرے خلاف (دشمن کی) مدد نہ فرما۔ اور میری تائید فرما، اور میرے خلاف (دشمن کی) تائید نہ فرما۔ اور میرے حق میں تدبیر فرما، اور میرے خلاف تدبیر نہ فرما۔ اور مجھے ہدایت دے، اور ہدایت کو میرے لیے آسان کردے۔ اور جو مجھ پر زیادتی کرے اس کے خلاف میری مدد فرما۔ اے میرے رب! مجھے ایسا (بندہ) بنا جو تیرا بہت شکر کرنے والا ہو، تیرا بہت ذکر کرنے والا ہو۔ تجھ سے بہت ڈرنے والا ہو، تیری اطاعت کرنے والا ہو، تیرے سامنے عاجزی کرنے والا ہو، تیری طرف ہی رو رو کر رجوع کرنے والا (اور توبہ کرنے

والا) ہو۔ اے میرے رب! میری توبہ قبول فرما، میرے گناہ دھوڈال، میری دعا قبول کر، میرے دل کو ہدایت دے، میری زبان سیدھی رکھ، میری دلیل کو (پختہ اور) قائم رکھ، اور میرے دل سے کینہ نکال دیے۔"

ابوالحسن طنافسی رحمتہ اللہ نے کہا: میں نے وکیع رحمتہ اللہ سے کہا: کیا میں وتر میں یہ دعائیں مانگ لیا کروں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:۔

(1) مسنون دعائیں یاد کر کے نمازوں میں پڑھی جائیں۔ نماز کے علاوہ بھی دعا مانگتے ہوئے یہ دعائیں پڑھی جاسکتی ہے۔

(۲) ہر قسم کی مشکل اور مصیبت میں اللہ سے دعا مانگنی چاہیے۔ اس دعا میں دشمنوں کے خلاف مدد بھی مانگی گئی ہے اور اپنی اخلاقی خامیوں سے نجات اور خوبیوں کے حصول کی درخواست بھی کی گئی ہے، اس لیے یہ ایک جامع دعا ہے۔ (۳) زبان سیدھی ہونے کا مطلب ایسی توفیق کا حصول ہے کہ زبان سے گناہ یا گمراہی کی بات نہ نکلے۔

(۴) دلیل قائم رکھنے سے مراد حق کی تبلیغ کے دوران میں صحیح، پختہ اور واضح دلائل پیش کرنے کی توفیق بھی ہوسکتی ہے اور قبر یا قیامت میں حساب کتاب کے موقع پر ایسا جواب دینے کی توفیق بھی جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو کر گناہ معاف فرمادے اور جنت میں داخل کردے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک خادمہ عطا فرمانے کی درخواست کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"میرے پاس تو (غلام یا لونڈی) نہیں ہے جو تجھے دے سکوں۔"

وہ واپس چلی گئیں۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا:

"کیا تجھے وہ چیز پسند ہے جو تو نے مانگی تھی یا وہ جو اس سے بہتر ہے؟"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: کہو: نہیں، بلکہ وہ چیز (مطلوب) جو اس سے بہتر رہے۔"

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہی جواب دے دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یوں کہا کر: "اے اللہ! اے ساتوں آسمانوں کے مالک! اے عرش عظیم کے مالک! اے ہمارے رب اور ہر چیز کے رب! اے تورات، انجیل اور قرآن عظیم کے نازل کرنے والے! تو اول ہے، تجھ سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ تو آخر ہے، تیرے بعد کچھ نہیں۔ تو ظاہر ہے، تجھ سے اوپر کچھ نہیں۔ تو باطن (پوشیدہ) ہے، تجھ سے پوشیدہ تر کچھ نہیں۔ ہمارا قرض ادا فرما اور فقر سے (نجات دے کر) ہمیں غنی کردے۔"

فوائد و مسائل

(۱) اللہ کا ذکر دنیا کے مال سے بہتر ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اول و آخر ہے۔ وقت مخلوقات پر اثر انداز ہوتا ہے، خالق پر نہیں، اس کے لیے سب زمانہ برابر ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ سب سے بلند و بالا اور سب پر غالب ہے، اور اس کی قدرت مخلوق کے ہر ذرے پر محیط ہے اور علم و قدرت کے لحاظ سے وہ سب سے قریب ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ سے اس کی صفات کے وسیلے سے دعا کرنی چاہیے۔

(۵) فقر و غنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا قرض و فقر سے نجات کے لیے مسنون دعا کے ذریعے سے اللہ کی مدد حاصل کرنی چاہیے۔

رسول اللہ علیہ وسلم کی دعا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

''اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ، پاک دامنی اور استغنا کا سوال کرتا ہوں۔''

فوائد و مسائل:۔

(۱) اللہ تعالیٰ ہی ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھنے والا ہے۔

(۲) یہ دعا کئی طرح کے شر سے حفاظت کا سوال ہے۔ ہدایت گمراہی سے، تقویٰ گناہ سے، عفاف وعفت غیر شریفانہ عادتوں اور بے حیائی سے، غنائے قلب طمع اور بخل سے اور غنائے ظاہری دنیوی ضروریات کے لیے کسی کے سامنے سوال دراز کرنے سے حفاظت کا باعث ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

''اے اللہ! تو نے مجھے جو علم دیا ہے اس سے مجھے فائدہ دے، اور مجھے وہ علم عطا فرما جو مجھے فائدہ دے اور میرے علم میں اضافہ فرما۔ ہر حال میں اللہ کی تعریف ہے اور میں آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ کا طالب ہوں۔''

دل کی حفاظت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے فرمایا کرتے تھے۔ ''اے اللہ! میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ۔''

ایک آدمی نے کہا! اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کو ہمارے بارے میں (گمراہ ہونے کا) خطرہ ہے؟ حالانکہ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں اور جو کچھ (ایمان وعمل کے احکام) آپ لائے ہیں ان کو سچ مانتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ انہیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔''

امام اعمش رحمتہ اللہ نے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے دو انگلیوں سے اشارہ کیا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

(۱) ہدایت مل جانے پر اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

(۲) موجودہ دور میں نئے نئے فتنے سامنے آرہے ہیں۔ باطل کو مزین کر کے پیش کیا جارہا ہے، قرآن وحدیث کی نصوص کو غلط تاویلوں کے ذریعے سے غلط موقف کی تائید میں پیش کیا جارہا ہے۔ ان حالات میں نہ صرف عوام کو بلکہ علماء کو بھی اللہ سے مدد مانگتے رہنے کی ضرورت ہے۔

(۳) ہدایت ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا ہدایت کی درخواست اسی سے کرنی چاہیے۔

(۴) قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور انگلیوں وغیرہ کے جو الفاظ آئے ہیں، ان پر ایمان رکھنا چاہیے لیکن ان کی حقیقت سے صرف اللہ ہی باخبر ہے۔

تعظیم کے لیے کھڑے ہونا

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عصا کے سہارے ہمارے پاس تشریف لائے۔ جب ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو (احتراماً) کھڑے ہوگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس طرح نہ کرو جس طرح فارسی لوگ اپنے سرداروں کے ساتھ کرتے ہیں۔'' ہم نے کہا۔: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: ''(اللھم ! اغفرلنا وارحمنا وارض عنا وتقبل منا، وادخلنا الجنة، ونجنا من النار، واصلح لنا شاننا کله)

ترجمہ: ''اے اللہ! ہماری مغفرت فرما، ہم پر رحمت فرما، ہم سے راضی ہوجا، ہماری دعائیں قبول فرما، ہمیں جنت میں داخل فرما، ہمیں جہنم سے نجات دے اور ہمارے سارے کام سنوار دے۔''

ہم نے مزید دعا کے لیے خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا: ''کیا میں نے تمہارے لیے سب کچھ جمع نہیں کر دیا؟'' (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

ترجمہ: ''اے اللہ! میں چار چیزوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اس علم سے جو فائدہ نہ دے، اس دل سے جس میں عاجزی نہ ہو، اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو سنی نہ جائے۔''

فائدہ:

اس میں علم پر عمل کی توفیق، تقویٰ اور قناعت کی دعا ہے اور دعا کی قبولیت کی درخواست بھی۔ مومن کو اپنے اندر یہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اللہ سے اچھی امیدیں رکھنی چاہئیں۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے۔

(اللھم انی اعوذبک من فتنة النار وعذاب النار.....والمأثم والمغرم)

ترجمہ: ''اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں (جہنم کی) آگ کی آزمائش اور (جہنم کی) آگ کے عذاب سے، قبر کی آزمائش اور قبر کے عذاب سے، دولت کی آزمائش کے شر سے اور مفلسی کی آزمائش کے شر سے اور مسیح دجال کی آزمائش کے شر سے۔ اے اللہ! میری غلطیوں کو برف اور اولوں کے پانی سے دھو ڈال، اور میرے دل کو گناہوں سے اسی طرح پاک کردے جس طرح تو سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کردیتا ہے۔ میرے اور میرے گناہوں کے درمیان اسی طرح دوری کردے جس طرح تو نے مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے سے دور کردیا ہے۔ یا اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں سستی سے، انتہائی بڑھاپے سے، گناہ اور تاوان سے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) جہنم کی آزمائش اور قبر کی آزمائش سے مراد وہ گناہ ہیں جو جہنم میں لے جاتے ہیں یا عذاب قبر کا باعث بنتے ہیں۔

(2) دولت کا فتنہ یہ ہے کہ انسان مغرور ہو کر ظلم کرنے لگے یا حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرے یا مال کو گناہ کے کاموں میں خرچ کرے۔ ایسا شخص اس آزمائش میں ناکام ہوا جو اللہ نے دولت دے کر کی۔

(3) مفلسی کا فتنہ اور آزمائش یہ ہے کہ انسان روزی کمانے کے حرام طریقے اختیار کرے یا دل میں اللہ پر ناراض ہو یا زبان سے اللہ کا شکوہ کرے۔ ایسا شخص مفلسی کے امتحان میں ناکام ہے۔

(4) مسیح دجال ایک خاص شخص ہے جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ جو شخص اس کا ساتھ دے گا، اسے دنیا کے مال کی فراوانی اور راحت حاصل ہوگی، جو اس کے دعوے کو سچ ماننے سے انکار کردے گا، اس پر مصیبتیں آئیں گی اور مال و دولت سے محروم ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ دولت کے لالچ میں یا مفلسی کے ڈر سے اس کے ساتھی بن جائیں گے اور ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ بہت سے لوگ اس کے عجیب و غریب شعبدے دیکھ کر اس کے دعوے کو سچ مان لیں گے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل سے اس کے بارے میں بیان کیا ہے تاکہ مومن اپنا ایمان محفوظ رکھ سکیں۔ آخر کار وہ سچے مسیح یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں فلسطین کے ملک میں لد کے مقام پر قتل ہوگا۔

(5) غلطیوں اور گناہوں کا تعلق جہنم کی آگ سے ہے، اس لیے انہیں آگ سے تشبیہ دے کر پانی اور برف سے دھونے کی دعا کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل کو گناہوں سے پاک صاف کر کے اطمینان اور سکینت کی ٹھنڈک عطا فرمادے۔

(6) سستی انسان کو بہت سی نیکیوں اور دنیا و آخرت کے فوائد سے محروم کردیتی ہے۔ مومن کو نیکی کے معاملے میں ہوشیار ہونا چاہیے۔

(7) انتہائی بڑھاپے سے عمر کا وہ حصہ مراد ہے جب انسان دوسروں کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ہر قوت کمزور ہو جاتی ہے، اس لیے وہ پہلے کی طرح نیکیاں نہیں کرسکتا۔

(8) تاوان سے مراد کسی ایسی ادائیگی کا لازم ہونا ہے جو ناگوار اور مشکل ہو مثلاً غیر ارادی طور پر کسی کا

نقصان ہوجائے اور وہ نقصان پورا کرنا پڑے یا غیر ارادی طور پر قتل ہوجائے جس کا خون بہا دینا پڑے یا کسی جرم کا ارتکاب ہوجائے اور اس کا جرمانہ ادا کرنا پڑے۔ دعا میں ایسی تمام صورتوں سے پناہ مانگی گئی ہے۔

حضرت فروہ بن نوفل اشجعی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ ''میں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے بارے میں سوال کیا، جو آپ مانگتے رہے ہوں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

ترجمہ: ''اے اللہ! میں اس عمل کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں جو میں نے کیا اور اس عمل کے شر سے بھی جو میں نے نہیں کیا۔''

فائدہ:

دو غلطی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ جو کام نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ کر دیا۔ دوسرے یہ کہ جو کام کرنا چاہیے تھا، وہ نہیں کیا۔ دونوں طرح کی غلطی کے دنیوی نقصانات بھی ہوتے ہیں اور اخروی نقصانات بھی۔ اس دعا میں دونوں طرح کی غلطیوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یہ دعا اس طرح سکھاتے تھے، جس طرح قرآن مجید کی سورت سکھاتے تھے

(اللھم انی اعوذبک..... من فتنہ المحیا و الممات)

ترجمہ: ''اے اللہ! میں جہنم کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ کا طالب ہوں اور مسیح دجال کے فتنے سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور تجھ سے زندگی اور موت کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:۔

(1) مسنون دعائیں کوشش اور اہتمام سے سیکھنا اور سکھانا ضروری ہیں۔

(2) قبر کا عذاب حق ہے۔ اس پر ایمان رکھنا فرض ہے اور ان تمام کاموں سے اجتناب ضروری ہے، جو عذاب قبر کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً: ایک شخص کی بات دوسرے کو بتا کر ان میں لڑائی کرا دینا یا جسم اور لباس کو پیشاب کے چھینٹوں سے بچانے کے لیے مناسب احتیاط نہ کرنا، وغیرہ۔

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے بستر پر نہ پایا، چنانچہ میں نے (اندھیرے میں ٹٹول کر) تلاش کیا تو میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے تلووں پر پڑا جو کھڑے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی جگہ میں (سربسجود) تھے اور فرما رہے تھے (اللھم انی..... انت اکما اثنیت علی نفسک)

''اے اللہ! میں تیری ناراضی سے تیری خوشنودی کی پناہ میں آتا ہوں۔ تیری ناراضی سے تیری معافی کی پناہ میں آتا ہوں اور تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ میں تیری پوری طرح تعریف نہیں کر سکتا۔ تو ویسے ہی ہے جیسے تو نے اپنی تعریف خود فرمائی۔''

فوائد و مسائل:

(1) نماز تہجد بڑا افضل عمل ہے کیونکہ اس میں اللہ کے سامنے عجز و انکسار کا زیادہ اظہار ہو سکتا ہے۔

(2) سجدہ نماز کا اہم رکن ہے لہٰذا نفلی نماز میں سجدے کی حالت میں خوب دعا مانگنی چاہیے۔

(3) اللہ کی صفات کا ذکر کر کے پناہ مانگنا درست ہے کیونکہ وہ اللہ سے پناہ مانگنے میں شامل ہے۔

(4) ''تجھ سے تیری پناہ'' کا مطلب یہ ہے کہ تیرے عتاب اور غضب سے مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ صرف تو ہی رحمت کر کے معاف کر دے تو میں تیرے عذاب سے بچ سکتا ہوں۔

(5) انسان اللہ کی تعریف کما حقہ کرنے سے عاجز ہے۔ اس بات کا اقرار کرنا بھی اس کی عظمت کا اعتراف ہے۔

☆

شمال کی جانب ہجرت کا موسم

مصنف۔ طیب صالح
ترجمہ۔ ارجمند آرا
تبصرہ۔ آمنہ زرین

تو کیا ہم جزو ہیں یا کل؟
قطرہ یا سمندر؟
خواب یا حقیقت؟

آدم سے آدمیت کے سفر میں ارتقا، عروج، زوال کی حدود کا تعین تو مشکل ہے کہ ہر زمانہ ان سب ہی مرحلوں سے نبرد آزما رہتا ہے۔ مگر خواہش کا پھل چکھنے کی سرشت نے آدمی کا راستہ خوب مقرر کر رکھا ہے۔

پھل جس کا ظاہر سیب تھا اور باطن ترغیب

ہر زمانے میں رنگ، رخ بدل بدل کر آدم زاد کے مقابل کھڑی خواہش اس کے انتخاب کو تقدیر کی صورت گری میں ڈھالتی ہے۔ پھر وہ مصر رہے یا رجوع کرے۔ یہ بھی اس کی مرضی۔

خیال کے ٹھہر جانے پر بھی نہ ٹھہرنے والی، ہر حال میں اگلی حالت تک پہنچ جانے والی شے زندگی کہلاتی ہے۔

اور جب یہ تھوڑے اتار چڑھاؤ دیکھ لینے کے بعد ٹھہر جانے کا بھرا دیتی ہے۔ تب پیچھے مڑ کر دیکھنے سے نہ ہنسی آتی ہے۔ نہ رونا۔

اب حقیقت کے واضح ہونے کے دن پیش نظر ہیں اور یہ تمہاری خصوصیت ہے کہ سنگلاخ زمین میں ڈھل جاؤ یا پھر لہلہاتے ہوئے راستے کی شاد باد منزل کو پالو۔

تو کیا تم جانتے ہو کہ تحریر میں تخیل کی جادوگری کو منتقل کر دینے کی صلاحیت کس قدر سحر انگیز ہے؟

اس سحر کو پھونکنے والا ایک ایسے جادوئی سفر پر لیے جاتا ہے کہ تمہاری آنکھیں، وفور تحیر سے بھری بھری۔ سانس کی رفتار مدھم اور دل و دماغ میں مدوجزر کی اچھلتی کیفیت کے سوال جواب اودھم مچاتے ہیں۔ بے یقینی کی شدت خود کلامی کرتی ہے۔ ارے ایسا کیسے؟

کتاب کا مختصر حجم آپ کے فہم کو خوش گمانی میں مبتلا کرتا ہے۔ مگر ایسا ہونے والا نہیں۔ سوڈانی ادیب طیب صالح کا 1966ء میں لکھا گیا، عربی زبان کا یہ ناول اپنے اختصار کے باوجود ایسی انفرادیت کا حامل ہے کہ اسے جدید عربی کا شاہ کار قرار دیا جاتا ہے۔ سادگی و پرکاری کا امتزاج لیے۔ سیدھی روش پر چلتی کہانی، کس موڑ پر گتھم گتھا ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے ہاتھ میں صرف اشتباہ نظر کی ڈوری رہ جاتی ہے اور وہ بے اختیار ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی آرزو کرتا ہے۔

کہانی کا آغاز گاؤں کی صبح کے منظر سے ہوتا ہے۔

"میں نے ہوا کی آواز کو دھیان سے سنا۔ اس آواز سے یقیناً میں خوب واقف تھا جو ہمارے گاؤں میں چنچل سرگوشی جیسی لگتی تھی۔ کھجور کے درختوں سے گزرتی ہوا کی آواز اس وقت کتنی بدل جاتی ہے جب وہ مکئی کے کھیتوں سے گزرتی ہے۔ قمری کی کوک کان

میں پڑی، اور میں نے کھڑکی سے پرے صحن میں لگے کھجور کے درخت کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ زندگی میں ابھی سب بخیر ہے۔"

پردیس سے پلٹ کر گاؤں کی پہلی صبح کے منظر کی اس روداد کا یہ جملہ آپ کے تخیل کی سیٹ بیلٹ باندھ دیتا ہے۔ ہوا کی آواز اس وقت کتنی بدل جاتی ہے جب وہ۔

پڑھنے والے کے دھیان کو باقی سے ہٹا کر خود پر مرتکز کر دینے کی صلاحیت، تحریر کا اوج کمال ہے۔ اپنی حسیات کے چوکس ہونے کا تجربہ اور لطف، قاری کے لیے ناقابل فراموش اسی لیے ہوتا ہے۔

گاؤں ہوا اور کھیتی باڑی نہ ہو؟

فضا کی خوشبو، پرندوں کی اڑانیں، ہوا اور دھوپ کے مزاج، دریا کے پاٹ اور پانی کا بہاؤ، بوائی اور کٹائی کے منظر.....

مانو کہ تمہارا تخیل بھی کندھے پر تھیلے کی گرہ باندھے، ہاتھ میں اوزار پکڑے، کھیتوں کی اور چلا جا رہا ہے۔

کلے والے کھیتوں سے جنہیں پانی لگایا گیا ہے، بھری دوپہر میں دھوپ کی شدت سے گرم بھاپ اٹھ رہی ہے۔ تیز ہوا کا ہر جھونکا لیموں، سنترے اور یوسفندی نارنگیوں کی خوشبو بکھیر دیتا ہے۔

لیکن یہ سادگی کب پرکاری میں ڈھلنے والی ہے اس کی تمہیں کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

فکشن کو حقیقت سمجھنا ایک خاص عمر کا مشغلہ ہوتا ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ فکشن کو جھٹلانے کا، جو کہ لطف تو لے لیا مگر مبالغہ و افترا سمجھتے رہے۔ مگر ایک مرحلہ جو اس فہم کا اگلا پڑاؤ ہے کہ فکشن ایک منظم خیال بندی تو ہو سکتی ہے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ہمارے اردگرد سے کوئی بھی علاقہ نہ رکھتی ہو؟ کیا ہمارے آس پاس کے کردار اچھے، برے، مختلف، نفسیاتی مریض یا واہموں کی تجسیم نہیں ہوتے؟

اعتدال سے ہٹا ہوا کوئی واقعہ پیش نہیں آتا؟ نہیں دنیا کے کسی اور خطے میں تو آتا ہوگا؟

تو بس فکشن حقیقت سے سراسر لاتعلق نہیں، بلکہ ایک خاص فہم کے مطابق، اس حقیقت کی مخصوص تفہیم بھی ہو سکتی ہے۔ گاؤں سے نکل کر کہانی اجنبی دیس کا کشٹ اٹھاتی ہے۔ لیکن خارجی مقام، داخلی سفر پر کبھی کبھی بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔

بیان کی راہ پر رواں دواں راوی، کبھی آپ سے تو، کبھی خود سے کلام کرتا ہے لیکن اپنا نام نہیں بتاتا۔ میں اور وہ کا ذکر گر بہ پانی سے قدم جمانے لگتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں تحیر و تخیل کی پری ظاہری سادگی کی تہہ دار الجھنوں کی خبر لیے بغیر، دشت حیرت سے فسوں پھونک کر خود دھواں ہونے والی ہے۔

دوہری شخصیت رکھنا ایک ابتلا ہے جس میں مبتلا فرد کی حقیقت پہچاننے میں زمانوں کا زیاں، زندگی کے ہم رکاب رہتا ہے۔ کہانی کی بنت میں کرداروں کو نکتے سے تصویر کرنا، لکھنے والوں کی خداداد صلاحیت کا مظہر ہے۔

دنیا میں ہر صلاحیت درجہ بندی کے مطابق مقام حاصل کرتی ہے۔ جرم جب ذہین فطین لوگوں کا انتخاب بنتا ہے تو اس کی نوعیت اور طریقہ کار بھی انوکھے ہوتے ہیں۔ مصطفیٰ سعید بھی غیر معمولی ذہنی استعداد کا حامل شخص تھا۔

معمول سے مختلف ہونا اسے سرد مہری سے سفاکی تک کیسے لے گیا؟ کردار جب تشکیل پاتے ہیں تو کون جانتا ہے کہ وہ کس درجہ کا عروج پائیں گے؟

تحریر جس بھی ہیئت، زمانے میں لکھی جائے، زندگی سے جڑے داخلی اور خارجی معاملات پر گرفت کی سند، اس کے زندہ رہنے کا راز اور وصف ہوتی ہے۔ کہانی کا سیاسی شعور حیران کن تو ہے ہی..... ساتھ ہی ساتھ قدر مشترک کا وصف بھی متاثر کن ہے۔

"میرے بیٹے، میرے الفاظ کو ذرا غور سے

گلو۔ کیا ملک اب بھی ان کے قبضے میں ہے؟ کیا ہمارا ملک خود مختار نہیں ہو چکا؟ کیا ہم اپنے ملک کی آزاد باشندے نہیں بن چکے؟ لیکن یقین رکھو کہ وہ دور بیٹھ کر بھی ہمارے معاملات چلائیں گے۔ اس وجہ سے کہ اپنے پیچھے وہ ایسے لوگ چھوڑ گئے ہیں جو ان ہی کی طرح سوچتے ہیں۔"

آشنائی کا کوندا لپکتے ہی خیال روشن ہوتا ہے کہ یہ تو ہماری بات ہو رہی ہے۔ مگر تحریر کا وطن تو سوڈان ہے۔

اور پھر مزید "میں نے منصور کو رچرڈ سے کہتے ہوئے سنا، تم نے اپنی سرمایہ دارانہ کمپنیوں کے سوا، جنہوں نے ہمارا خون نچوڑ لیا ہے اور اب بھی نچوڑ رہی ہیں تم نے ہمیں دیا ہی کیا ہے؟ رچرڈ نے جواب میں اس سے کہا تھا "اس سب سے پتا چلتا ہے کہ تم ہمارے بغیر جی نہیں سکتے۔ تم استعماریت کے شاکی رہے ہو اور جب ہم چلے گئے تو تم نے نو استعماریت کی پوشیدہ اسطور بنالی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہماری موجودگی، چاہے وہ پوشیدہ ہو یا ظاہر تمہارے لیے ہوا اور پانی کی طرح ناگزیر ہے۔"

سیاسی شعور رکھنے والا ذہن استحصالی رویے کی خوب پہچان رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عوامی قوت کو اس کے شعور سے بے بہرہ رکھنے کی منظم کوشش ہر قوت مقتدرہ کی ترجیح رہی ہے۔

ایک اور جگہ بھی پاکستانی فضا محسوس ہوتی ہے۔ جب کہانی کار اوی جو کہ سرکاری ملازم بھی ہے۔ اپنے کسان دوست کو ایک ایسی کانفرنس کا احوال بتا رہا ہے جو عالی شان ماحول میں نو دن تک برپا رہی۔ جس کا مقصد افریقہ میں تعلیم کی اہمیت اور ترویج پر غور و فکر والی تقریریں کرنا تھا اور پھر.....

"محبوب کو کس طرح بتاتا کہ یہی آدمی گرمیوں کے مہینوں میں افریقہ کی گرمی سے بچ کر لیک لوکارنو چلا جاتا ہے اور اس کی بیوی لندن کے ہیرڈز میں اشیائے صرف خریدتی ہے۔ جہاں سے اس کا خریدا ہوا سامان خصوصی طیارے کے ذریعے اس کے پاس بھیجا جاتا ہے۔"

1966ء کو گزرے گو کہ صدیاں نہیں گزریں۔ جدیدیت کے زعم نے گرچہ بہت بڑی کروٹ لی ہے لیکن قدامت کو اس جدت کے ساتھ تم اپنی فطری جبلت کی بدولت جڑا ہوا پاؤ گے۔ متن کی روح کو اپنی زبان کے پیراہن میں ڈھالنا ترجمہ نگار کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جسے پڑھتے وقت احساس ہی نہ ہو کہ یہ اس کا اصل نہیں۔ تو اندھا کیا چاہے کے مصداق۔ پڑھنے والوں کو دو آنکھیں مترجم کی بدولت ملتی ہیں۔

عربی زبان سے ہماری واقفیت ناواقفوں جتنی ہی ہے۔ چند کتابوں کا ترجمہ پڑھ لینے کے اتفاق نے یونہی ایک خیال کو جھلا رادیا کہ پڑھنے والوں پر ترجمے کا احسان تو مترجم کی بدولت ہے۔ مگر ایک احساس جو امنڈا چلا آتا ہے کہ حاکم وقت نے محکوموں کی ترقی و فلاح کے منصوبے تشکیل دیے۔ جدیدیت کے جھنڈے گاڑے اور عربی و فارسی کے سیکھنے کو مطعون و متروک ٹھہرایا۔ مگر اچنبھا تو یہ ہے کہ عربی ناول پہلے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ عربی و فارسی کو قدامت پسندی کا غلاف چڑھا کر طاقِ نسیاں پر رکھوا دیا اور خود عربی کو نہ چھوڑا؟ اور ہم کہ دو فورغلامی محکومی۔ آج اردو کی سمجھ نہ رکھنے کو روشن خیالی و ترقی و بہبودِ زمانہ خیال کیے جانے کی منزل مراد کو پہنچ چکے ہیں۔

انگریزی کو جوانوں کے لیے ستارہ بنا ڈالا۔ جس پر کمند ڈالتے نوجوان بوڑھوں میں تبدیل ہوئے جاتے ہیں۔ مگر کمند.....؟

فصیح و بلیغ عربی زبان کا ادبی آہنگ متاثر کن ہے۔ دیکھیے۔ صحرائی موسم کی شدت بتانے کا انداز۔

"کیونکہ اس سرزمین میں، جہاں سورج نے قاتل کے لیے قتل کرنے کو کچھ نہیں چھوڑا۔"

"یہاں سورج سے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں ہے جو بلا عجلت آسمان کی سیڑھیاں چڑھتا جاتا ہے۔ اس

کی شعاعیں زمین پر اس طرح بکھرتی ہیں جیسے ان کے اور اہل زمین کے مابین ایک قدیمی خونیں جنگ چلی آ رہی ہو۔"

مرد و زن دنیا کے لیے لازم و ملزوم سہی۔ مگر اس تعلق کے بیچ و خم میں انا نے جب بھی بیج بویا۔ فساد ہی پھوٹا۔

انسانی ذہن وادیوں، جنگلوں، صحراؤں، سمندروں اور پاتال سے زیادہ عمیق پہنائیوں، وسعتوں اور تاریکیوں کی آماجگاہ ہے اور اس عجیب و غریب پر بیتنے والی ہر واردات کو لفظ کا وجود عطا کرنا ایک مزید نادر وصف ہے۔

ناول کی زمین کا تیسرا طواف ان نکتوں تک رسائی تک ہے جو بعد میں تصویر بننے والی ہیں۔ ہر کردار کے بام عروج سے قبل ارتقائی مرحلہ دلیل کے ساتھ اس کی صراحت پیش کرتا ہے۔ جیسے وہ رئیس جو ستر سالہ بوڑھا ہو کر بھی عورتوں میں اپنی اوائل عمری جیسی دلچسپی کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچا۔ اور بنت مجذوب جو بے باک گفتگو اور مردانہ طور طریقوں کے لیے معروف تھی۔ اپنی اسی صفت کی بدولت قتل کی واردات کی واحد راوی بنی، محجوب جو ایک کسان تھا۔ دھرتی سے جڑے ہوئے فرد کی صورت گری میں ظاہر ہوا اور اسی تیسرے طواف میں سادہ اور بے ضرر سے معلوم ہونے والے جملے بھی ملتے ہیں جو پیش بینی کے مقام پر فائز تھے۔

تو مکئی کی خوشبو سے بھری فضا میں قتل کی انہونی واردات کیسے جذب ہو گئی؟

سلسلہ وار خودکشیاں اور سفاکانہ قتل ایک ہی تصویر کے دو رخ کیسے بنے؟ عشق و محبت کی دل فریب رنگینی کیسے تار عنکبوت ثابت ہوئی؟ اور پھر یہ کیسے ہوا کہ ان سب کا عکس..... کسی دوسرے خطے میں ہونے والے دوہرے قتل کی واردات کی صورت میں ظاہر ہوا؟

اور پھر یہ ہوا کہ پردہ گرنے سے پہلے ایک ایسا چہرہ ابھرا۔ جس نے دیکھنے والوں پر بے یقینی کا صور پھونک دیا۔ کیا وہ قتل سعید ہی تھا؟

مگر اس نے تو کہا تھا کہ وہ بچپن میں یتیم ہو گیا تھا۔

تو کیا اس کے تذکروں کی تکرار نے نظر آنے والی ہر حقیقت پر جالا بن دیا تھا؟ ارے کیا وہ واہمہ تھا؟ تو کیا پڑھنے والے کا ذہن ہی وہ کائنات ہے جس کو مسخر کر دینے کا ہنر لکھنے والے کو ودیعت کیا گیا ہے؟

چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔ مگر جھنجھوڑ دینے کی قوت تحریر کے پرشکوہ ہونے کا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔

بہت پہلے زمانے میں اور بہت بعد کے زمانے میں انسان خود کو ہمیشہ نیا ہی محسوس کرتے ہیں۔ گزر جانے سے پہلے وہ خود کو قدیم کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر ایک غیر مرئی قوت کی بدولت اس قدیم کو جدید کے ساتھ جوڑنا دشوار نہیں۔ جس کا نام جبلت ہے۔

پھل چکھنے سے لے کر پہلے قتل تک کا ارتقائی سفر تو سب کو معلوم ہے۔

تو کیا شجر ممنوعہ کی جڑیں نسل انسانی پر محیط نہیں ہیں؟

تو کیا اس شجر پر خواہش کا پھل ابھی بھی ہمیشگی کے فریب میں مبتلا نہیں کرتا؟

پھر چکھنے والے کا انتخاب ہے کہ اس پر مصر رہے۔ یا رجوع کرے۔

☆

س: شادی کب ہوئی؟

ج: میری شادی الحمدللہ 2010ء میں بہت خوش گوار ماحول میں ہوئی کیونکہ ہم سات کزنوں کی اکٹھے شادی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ کہ میرے ابو، چچا لوگ سعودیہ میں ہوتے تھے۔ وہاں سے جلدی چھٹی ملنا مشکل تھی لیکن پھر بھی ایک چچا جن کا نام خالد ہے، انہیں چھٹی نہیں ملی۔ میں نے اپنی کزنوں کی شادی میں خوب ہلہ گلہ، ڈانس کیا کیونکہ جس گھر میں میری شادی ہوئی، اس گھر سے میری دونوں کزنوں، نندوں کی شادی ہوئی میرے کزنوں کے ساتھ۔ جس دن میری کزنوں کی بارات تھی تو اگلے دن میری مایوں تھی۔ میں کیونکہ اکلوتی تھی، تو میرے ماموں، ممانی، خالہ سب رشتہ دار کراچی سے آئے تھے۔ کیا دن یاد کروادیے آپ لوگوں نے۔ بہت یادیں وابستہ ہیں اپنے بزرگوں، چھوٹے بھائیوں، ماموں، چچاؤں کی دعاؤں میں رخصت ہوئی۔

س: شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

ج: شادی سے پہلے دوستوں سے ملنا، پھوپھی کے گھر جا کر رہنا۔ صائمہ پھوپھی زاد بہن کے ساتھ مل کر شرارتیں کرنا، ریڈیو سننا، ان کی طرف کال کرنا اور بچوں کو سپارہ پڑھانا۔ اب بھی پابندی کوئی نہیں لیکن بندہ بعد میں مصروف ہو جاتا ہے۔

س: اس شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے کے آگے سر جھکایا؟

ج: ہمارے ہاں جو بات بڑوں نے کردی تو اس سے انکار کیسا۔ بڑے جو فیصلہ بھی کرتے ہیں، ہمارے اچھے کے لیے کرتے ہیں کیونکہ بڑے بزرگوں نے کچھ دیکھ کر ہی اتنا بڑا شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ بڑوں کی رضا میں ہماری بھی رضا شامل۔

س: ذہن میں جیون ساتھی کے لیے کوئی تصور تھا اور وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ج: ہم سب کزن ایک ساتھ رہتے تھے۔ ایک ساتھ بڑے ہوئے، بچپن بچپن ہی ہوتا ہے۔ میری تو بہت ہی جلدی شادی ہوئی تھی، کچھ سمجھ ہی نہیں تھی، بعد میں آئی۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ میری شادی کزن سے ہوگی کیونکہ ہماری منگنی بچپن میں طے ہوگئی تھی۔ جیون ساتھی کے حوالے سے یہی سوچا تھا کہ اچھا ہو۔ خیال رکھنے والا ہو کیونکہ میں خود ایسی ہوں تو دھوکا کبھی نہ دے، جھوٹ نہ بولے جو بات ہو سب بتادے کیونکہ آج کل یہ جو لڑکیاں لڑکوں سے فون پر بات کرتی ہیں، اس سے ڈر لگتا تھا کیونکہ میں سادہ مزاج۔ لڑکی کی خواہش تھی کہ بس جیون ساتھی ہمیشہ ہی خیال رکھنے والا ہو۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی؟ شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی، ملاقات وغیرہ؟

ج: منگنی..... ہم لوگ چھوٹے تھے، اسکول میں پڑھتے تھے تو تب ہوئی۔ ہر وقت آمنا سامنا، فون تو اس وقت بہت تھوڑے ہی تھے۔ یہ گھر میں کزنوں میں بڑے تھے۔ ابو، چچا سعودیہ میں تھے۔ کہیں آنا جانا ہو تو وہ بھی ساتھ ہوتے تھے لیکن جب شادی کی تاریخ طے ہوئی تو میری نازیہ خالہ کراچی سے میری شادی پر آئیں تو انہوں نے کہا، پردہ کرنا ہے اب تم نے، ورنہ روپ نہیں آئے گا۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟

ج: خیالات..... وہ تو ہر ایک کے ذہن میں آتے ہیں لیکن میری شادی چچا کے گھر ہو رہی تھی کیونکہ میں پہلے ہی اپنے چچاؤں، ماموں سب کی لاڈلی لیکن جس کزن سے شادی ہوئی تو زیادہ مرضی میرے چچا کی ہی تھی۔ تو برے خیالات ذہن میں نہیں آئے۔ چچی، کزنیں بھی سب اچھی ہیں۔

س: شادی کے لیے آپ کو تعلیم وغیرہ ادھوری

چھوڑنی پڑی یا کوئی قربانی دینا پڑی؟

ج: ایسی قربانی تو نہیں دینی پڑی۔ پڑھنے کی بے حد شوقین تھی۔ جب میری شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ ایف اے کا رزلٹ آیا تھا پرائیوٹ، کیونکہ میٹرک کے بعد کوئی سہولت نہیں تھی تو میری امی اور میری مرضی تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ لیکن ہر بات، ہر خواب پورا نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد نہیں پڑھ سکی۔ پابندی کوئی نہیں تھی لیکن مصروف ہوگئی شادی شدہ زندگی میں۔

س: شادی بخیر وخوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے میں کوئی بدمزگی ہوئی؟

ج: گاؤں میں گھر ہی اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ شادی ہال میں جانے کا سوچا ہی نہیں جاسکتا۔ میں دو دن مایوں بیٹھی، خوب دوستوں، کزنوں نے ہلہ گلہ، ناچ گانا کیا ڈیک پر، ڈھولک نہیں رکھی۔ باقی دوستوں، کزنوں سے جو ہوسکا کیا۔ 25 جولائی 2010ء کو بارات ہوئی کیونکہ ہمارے ہاں رواج ہے، ڈولی میں لے کر آتے ہیں، گرمی اتنی تھی۔

میری بہن تو کوئی نہیں، خالہ زاد کزن وردہ نے انہیں دودھ پلایا اور انہوں نے سونے کی انگوٹھی پہنائی وہ بھی خوش گوار ماحول میں۔ جیسی شادی ہماری ہوئی، ایسی کسی کی نہیں ہوسکتی۔ الحمدللہ سب کچھ ہی بہت اچھا ہوا، میرا استقبال بھی اچھا ہوا۔ کیوں نہ ہوتا، یہ بھی اکلوتے بھائی، میں بھی اکلوتی بہن تو استقبال تو پھر شان دار ہی ہونا تھا۔

س: شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج: ہائے جی کیا یاد دلا دیا آپ نے۔ سلام کیا۔ پاس بیٹھے۔ پوچھا، مہندی کس نے لگائی ہے۔ اچھی لگائی ہے، تمہارے ہاتھوں پر بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔ اور تم بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔ منہ دکھائی میں انگوٹھی دی، میری بہنوں کا بہت خیال رکھنا۔ تم ویسے بھی خود اکیلی ہو تو تمہیں کمی محسوس نہیں ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔"

س: شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

ج: تبدیلی، جو ہر لڑکی میں آتی ہے۔ بچپنا ختم ہوجاتا ہے، سمجھ داری آجاتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی جلدی جاگ جاتی تھی، بعد میں تو اس چیز کا زیادہ خیال رکھا کہ دیر تک نہ سوؤں۔ شروع سے ہی قرآن مجید پڑھتی تھی صبح سویرے، بعد میں بھی ایسا ہی کرتی رہی ہوں اور ہر بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کوئی ناراض نہ ہوجائے۔ باتیں نہ سننی پڑیں۔ کام کرنا مشکل نہیں، باتیں سننا مشکل ہے۔ جس سے بچتی آئی ہوں لیکن اب تو ایسی بیمار ہوئی، سب ہی خیال رکھتے ہیں۔ امی، چچی، کزنیں سب ہی، شوہر بھی۔ اللہ کرے ایسا ہی خیال رکھتے رہیں سب، آمین۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ج: یہ تو اتنا یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ پہلے شوہر کو شربت بنا کر دیا، وہ کزن کی شادی کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ جب گھر آئے، بہت گرمی تھی تو شربت بنایا۔ سب گھر والوں نے کزن عظمیٰ کی مایوں پر جانا تھا۔ شادی کے بعد پہلی شادی کزن کی ہوئی تو دیر ہو رہی تھی تو چچی نے روٹی بنائی، میں نے بھنڈی بنائی، جو سب کو پسند آئی۔

س: میکے اور سسرال میں کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟"

ج: نہیں۔ ذائقے تو اتنے مختلف نہیں تھے، میکے میں ذرا نمک تیز کھاتے تھے لیکن سسرال میں کم۔ باقی ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ایک بات مزے کی یہ ہے کہ میکے میں زیادہ بریانی چاہیے، آلو کی ہو یا چنے کی یا جیسی بھی، سب کو پسند تھی۔ لیکن سسرال میں میٹھے چاول دودھ والے وہ زیادہ پسند تھے۔ چچی یہ چاول بہت مزے کے بناتی ہیں۔ لیکن تھوڑا فرق تھا۔ میرے شوہر بھی بریانی کے شوقین، میں بھی۔ اگر گھر میں نہ بھی بنے تو بازار سے لے آتے ہیں۔ اس بات کے لیے ان کا شکریہ، ہر بات کا خیال رکھا انہوں نے۔ مجھے ان سے بہت محبت ہے۔ ان جیسا شوہر ہر ایک لڑکی کو نصیب ہو لیکن ان جیسا کوئی نہیں ہوسکتا۔ جتنے بھی ڈر وسوسے تھے، سب جاتے رہے۔ میں نے بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور نہ ہی دوں گی، ان شاءاللہ۔

س: میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس ہوا؟

ج: نہیں جی، میکے سسرال کا ایک جیسا ماحول کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟

ج: تنقید تو کسی بات پر نہیں ہوئی اور نہ ہی موقع دیا، تعریف ہی کہہ سکتی ہوں کہ سب بولتے تھے کہ نماز پڑھتی ہے۔ اس بات کی خوشی ہے، گھر والوں نے نہیں لیکن البتہ ان کی مطلب شوہر کی، انہوں نے کہا شادی کے بعد لگتا ہے صوم صلوٰۃ کی پابند ہوگئی ہے۔ جواب کبھی کسی کو نہیں دیا لیکن انہیں دینا پڑا کہ الحمدللہ میں بچپن سے نماز پڑھتی آرہی ہوں، یہ بات ذرا بری لگی۔

س: سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟

ج: جن معاملات میں رائے دینی ہو، دی بھی جاتی ہے لیکن چچا اور شوہر کے ہوتے ہوئے ہمیں رائے دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی کوئی بات اگر کر بھی دی تو چچا نے کبھی اعتراض نہیں کیا، اہمیت ہی دی ہے۔

س: سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج: ایسی کوئی توقعات ہی نہیں تھیں جو پوری نہ ہوں۔ سب لوگ اچھے، خیال رکھنے والے، ماشاءاللہ، اچھا سسرال ملا۔

س: پہلے بچے کی پیدائش سب سے بڑا امتحان ہوتی ہے؟ اس موقع پر آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا؟

ج: کیا بات یاد دلادی آپ نے، مجھ میں جب یہ تبدیلی آئی مجھے اتنی سمجھ ہی نہیں تھی لیکن امی، چچی خاص کر شوہر نے بہت خیال رکھا کہ پہلا پہلا بچہ ہے۔ آخری دنوں میں الٹیاں بہت ہوئیں، بی پی ہائی ہوگیا۔ مسرت ڈاکٹر نے الغازی ہاسپٹل میں ریفر کردیا لیکن شکر ہے، آپریشن سے بچ گئی۔ ماشاءاللہ پہلا بیٹا ہوا، سب بہت خوش تھے کیونکہ یہ اکیلے تھے، اس وجہ سے تو پہلے بچے کا نام اس کے دادا ابو نے رکھا احمد۔ ماشاءاللہ مٹھائیاں بانٹیں لیکن یہ بات بھول نہیں سکتی کہ میرے شوہر کو غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔

میری امی نے ان کی امی کو بولا کہ یہ اتنی سمجھ دار نہیں تو اس کا اور بچے کا خیال رکھیں۔ بس ان کو غصہ آگیا، مجھے امی کی طرف بھیج آئے، اس بات پر میں بہت روئی لیکن ایک رات گزری، دوسری رات لینے چلے آئے کہ چلو گھر میں بھی غصے میں تھی، ان کی کوئی بات نہیں ٹالی لیکن میں نے کہا، اس ٹائم کوئی بات نہیں سنی، میں اب نماز پڑھ کر گھر آؤں گی۔ ان کی غصے والی عادت سے ڈر لگتا ہے، اچھے بھی بہت ہیں لیکن سب بچوں کی پیدائش پر میں نے انہیں یہ بات یاد دلائی اور یاد خود بھی کرتی رہوں گی، ماشاءاللہ چار بچے ہوئے، ایک آپریشن کے دوران فوت ہوگیا لیکن اب خود بیمار ہوں، آپ سب سے دعا کی اپیل ہے لیکن شکر ہے سب ہی خیال رکھتے ہیں۔ امی اور شوہر زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ شوہر کی طرف سے ہمیشہ ڈر لگا رہا، انہیں غصہ بہت آتا ہے، غصہ کے بہت تیز ہیں۔

س: آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟

ج: جس گھر میں چاہنے والے لوگ ہوں تو جوائنٹ فیملی سسٹم اچھا لگتا ہے لیکن اگر نہ پسند کریں تو علیحدہ ہوجانا ہی بہتر ہے۔ لیکن میرے خیال میں جوائنٹ فیملی سسٹم اچھا ہے، بچوں کی تربیت اچھی ہوتی ہے۔ دوسرا کوئی بچوں کا خیال رکھنے والا ہو، آپ کا کیا خیال ہے؟

س: آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی، کس حد تک کامیاب ہوئیں اس کوشش میں؟

ج: سسرال میں ایسا ماحول ہی نہیں تھا جس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتی، سب اچھا تھا۔ اگر کوئی چیز ادھر اُدھر رکھ بھی دی، کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ الحمدللہ۔

آپ سب سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کرنی ہے، میں ٹھیک ہوجاؤں اور سسرال میرا بہت اچھا ہے کیونکہ آپ خود اچھے ہو تو پھر کوئی برا نہیں ہوسکتا اور میرے شوہر میرے ساتھ بہت اچھے ہیں، اللہ کرے ایسے ہی اچھے رہیں، آمین۔

اب آپ سب نے بتانا ہے، کیسا لگا میرا سسرال۔

شعاع کا اجراء کیا گیا تو پیش نظر یہ بھی تھا کہ باصلاحیت، ذہین اور تخلیقی صلاحیت رکھنے والی باشعور خواتین کی صلاحیتوں کو سامنے آنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ وہ خواتین جو تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مثبت سوچ بھی رکھتی ہیں۔ وہ اپنے قلم کی طاقت سے گھرداری میں مصروف، گھر کی چاردیواری میں رہنے والی خواتین کی رہنمائی کریں۔

خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے بہت سی تخلیقی صلاحیت رکھنے والی خواتین کو موقع ملا۔ ان کو سراہا گیا اور قارئین نے ان کی تحریروں کو قبول عام کی سند بخشی۔ لیکن تخلیق کاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش یہ ناکافی تھا۔ شعاع کے اجراء سے بہت سی نئی لکھنے والی خواتین کو اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا موقع ملا۔ اور ان کی صلاحیتیں سامنے آئیں۔

ہم ہر ماہ پرانی مصنفین کے ساتھ ساتھ نئی مصنفین کو بھی موقع دیتے ہیں اور ان کی تحریریں شامل کرتے ہیں۔

پچھلے ایک سال کے دوران جو نئے نام سامنے آئے۔ ان میں سے بہت سی مصنفین بہت اچھا اور تواتر سے لکھ رہی ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ مسلسل محنت اور کوشش سے یہ اپنی تحریر کی خامیاں دور کر کے اپنا منفرد مقام بنالیں گی۔

سالگرہ نمبر میں ہم نے پچھلے ایک سال کے دوران ابھرنے والی نئی مصنفین سے کچھ سوالات کیے ہیں۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ لکھنے کی تحریک کیسے ملی؟ شعاع سے کیسے متعارف ہوئیں؟

2۔ پہلا افسانہ شائع ہونے پر آپ کے کیا تاثرات تھے۔ پہلی تحریر بھجوانے کے بعد شائع ہونے تک کتنا انتظار کرنا پڑا۔

3۔ پہلی تحریر ہی شائع ہوگئی تھی یا کچھ تحریریں مسترد بھی ہوئیں؟

آیئے دیکھتے ہیں کہ ہماری باصلاحیت مصنفین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

نئے چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

حبیبہ خان

نوشین فیاض

میں اپنی یادداشت کنگھالتے بچپن کی سوچیں کھولوں تو مجھے وہاں بھی کہانیوں کے خاکے اور محدود مناظر میں مختلف کردار باتیں کرتے مل جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ کردار ان کہانیوں کے ہوتے ہیں جو میں نے پڑھی تھیں مگر کچی عمر سے ہی جب مجھے کسی مصنف کے ساتھ اختلاف ہوتا تو جہاں تک میری مرضی ہوتی کہانی کے ساتھ چلتی اور اس کے بعد ان ہی کرداروں کے ساتھ اپنے ذہن میں کہانی بن لیتی۔ اس وقت تک بلکہ کچھ سال پہلے تک میرا مصنفہ بننے کا نہ کوئی ارادہ تھا نہ خواہش، اسی لیے بھی لکھنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ڈائری میں کہانیوں کے خاکے لکھا کرتی تھی۔ ان میں سے ایک خاکہ جانے کیسے مکمل ناول میں تبدیل ہوا اور دو ہزار تیرہ میں تجرباتی طور پر اپنا یہ ناول کرن میں اور افسانہ شعاع کے لیے پوسٹ کر دیا۔ اس کے بعد خاکوں سے ڈائری بھرتی رہی اور صفحات کالے ہوتے رہے مگر کہانی نہیں بن سکی۔ شادی کے بعد جب فیاض کو میرے شوق کا علم ہوا تو میری زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دو ہزار سترہ سے اب تک کی لکھی گئی تحریروں کا سہرا ان ہی کے سر جاتا ہے کہ میں تو ابھی تک قاری ہونا پسند کرتی ہوں۔ پہلے کا میں نہیں جانتی

مکراب لکھنے کی تحریک یہی ہیں۔

میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، وہ کوئی ادب دوست ماحول نہیں تھا۔ ادبی ماحول نہ ہونا الگ بات اسے "بے ادب" بھی کہہ لیا جائے تو دروغ گوئی نہ ہوگی۔ ایسے میں دو رسالے ہمیشہ خستہ حالت میں جانے کہاں سے آجاتے تھے۔ اور میرے عیش ہو جاتے۔ ابو رسائل کو شدت سے ناپسند کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امی یہ رسائل لانے کے باوجود کبھی پڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ مجھے آج تک علم نہیں کہ امی یہ استعمال شدہ رسالے لاتی کہاں سے تھیں۔ پہلا رسالہ میں نے چھ سال کی عمر میں پڑھا تھا اور ظاہر ہے چھپ کر ہی پڑھا تھا۔ یہ وہ پہلی کھڑکی تھی جس سے میں نے باہر کی دنیا کا نظارہ کیا تھا۔ یہ لکھتے ہوئے بھی میرے ذہن کے پردے پر شعاع کا وہ نام جگمگا رہا ہے جسے دیکھ کر میں اکثر سوچتی تھی کہ اس کتاب کا نام شعاع کیوں ہے؟ یہی میرا شعاع سے تعارف ٹھہرا۔

2۔ یہ دو ہزار سترہ کے رمضان کی بات ہے۔ ستائیسویں روزے کو امی کی طرف افطاری پر ہم سب موجود تھے۔ نورین نے فیس بک آئی ڈی بنائی تو مجھے کہنے لگی۔ سب گھر والوں کو فرینڈز میں ایڈ کر دو۔ ان دنوں میں اس نام سے فیس بک پر تھی جس سے مجھے گھر والے پیار سے پکارتے ہیں اور پہلے پہل لکھتی بھی اسی نام سے تھی۔ اس نام کی میں واحد بندی تھی فیس بک پر۔ سرچ میں جا کر اپنا نام لکھا اور رزلٹس میں ڈائجسٹ کے کچھ صفحات آگئے۔ میں نے عادتاً پڑھنا شروع کر دیا اور سب جانا پہچانا لگا۔ اپنا نام بعد میں دیکھا تھا۔ فون ہاتھ سے چھوٹ کر گود میں جا گرا۔ امی نے پوچھا "کیا ہوا؟" تو آہستہ سے بتایا "میرا افسانہ لگا ہے شعاع میں۔" اس کے بعد جو شور اٹھا وہ الگ۔ میں نے شکر کا سجدہ ادا کیا تھا کہ مجھ جیسی ایک عام سی لڑکی میں کچھ تو خاص ہونے والا ہے۔

بنیادی طور پر میں ایک ناول نگار ہوں اور اپنا مستقبل بھی ناول نگاری میں ہی دیکھتی ہوں۔ اس کے باوجود شعاع میں دو ہزار تیرہ کے وسط میں پہلا افسانہ بھیجا تھا۔ سنا تھا کہ ان رسائل میں نئے لوگوں کو جگہ نہیں ملتی جب تک کہ آپ کے پاس سفارش نہ ہو۔ مسترد ہونے کا امکان نظر میں رکھتے ہوئے میں نے افسانہ بھیجنا زیادہ مناسب سمجھا۔ جس کے شائع ہونے کا انتظار بالکل بھی نہیں کیا تھا۔

ایک تو میں ذاتی طور پر خود کو مصنفہ بننے کے لیے "ان فٹ" سمجھتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میری تحریر خام ہے اور مجھے ابھی بہت محنت کرنی چاہیے۔ (یہ تو خیر ابھی بھی لگتا ہے)۔ دو ہزار اسی سال میری شادی ہو گئی تھی۔ لاپروا تو میں سدا سے تھی، کام وام بھی کچھ نہیں آتا تھا، اس لیے شادی کے پہلے کچھ سال بہت محنت کرنی پڑی۔ ڈائجسٹ آتے تو پڑے رہتے۔ پڑھنے کا وقت نہیں ملتا تھا اور اگر کوئی گھڑی فرصت کی نصیب ہوتی تو پہلی ترجیح یہی ہوتی کہ کچھ آرام کر لیا جائے۔ نیند پوری ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائجسٹ گھر میں ہونے کے باوجود مجھے دو ہزار چودہ کے کسی شمارے میں لگے افسانے کا تین سال بعد فیس بک کے ذریعے پتا چلا۔

3۔ اللہ پاک کا یہ خاص کرم رہا کہ میری زندگی کی پہلی تحریر جو کہ ایک ناول تھا، کرن کے صفحات پر جگہ پا گیا اور پہلا افسانہ شعاع کے اوراق پر جلوہ گر ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک کچھ زیادہ اور قابلِ ذکر تو نہیں لکھا مگر جو بھی لکھا، جلد یا بدیر شائع ضرور ہو گیا۔ ماسوائے ایک ناولٹ اور دو تین افسانوں کے، جن کے بارے میں واصفہ جی نے کچھ بتایا نہیں اور اب میں پوچھتی بھی نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اگر پہلا ناول اور افسانہ نہ بھی شائع ہوتے تو مجھے لگنا ہی تھا۔ یہ جو ادارے میں موجود ہیں بہت پیارے لوگ ہیں، اگر کچھ مسترد بھی کر دیں تو سر آنکھوں پر۔ میں جانتی ہوں۔ میں ابھی سیکھنے کے عمل سے گزر رہی ہوں۔ میرا لکھا حرفِ آخر تو ہے نہیں تو اگر اب مسترد بھی ہو جائے تو میں دل چھوٹا نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی شائع شدہ کہانیوں میں سے بھی خود ہی غلطیاں نکالتی رہتی ہوں اور شکر گزار ہوتی ہوں کہ ان اغلاط کے باوجود انہیں میرے بچپن کے "کرش" ڈائجسٹ میں جگہ ملی۔

ریحانہ چوہدری.....مدو کے رندھیر

ہوتی۔ لینے کی ماما جی کیا یہ سارے خط اکٹھے ہوتے ہیں جو ڈائجسٹ میں شائع ہوئے ہوتے ہیں۔

تو بات ہو رہی تھی تاثرات کی تو جناب ارجمند نے شعاع پکڑا اور اسٹیٹس یہ لگا دیا پھر تو سب بھانجیاں وغیرہ بھی لگا دیتیں۔ اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جونہی کوئی شعر یا خط شائع ہوتا ہے تو سب پڑھ کے خوش ہوتے ہیں۔ میری دوستیں کوثر، نغمہ نوید، انجم اور سمیرا رشید خاص طور پر بہت خوش ہوتی ہیں بلکہ کوثر نغمہ تو کہتی ہے کہ یہ شمارے میں نے خرید کر رکھ لینے ہیں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پڑھا کروں گی۔ آپا جی تو باقاعدگی سے پوچھتی ہیں۔ اب کچھ نہیں لکھا۔ میں ہنس کے چپ کر جاتی ہوں۔ (کچھ شائع جو نہیں ہوا ہوتا)

پہلی تحریر (افسانہ) شائع کرانے کے لیے چار پانچ ماہ انتظار کرنا پڑا کورونا کی وجہ سے ورنہ تیسرے مہینے شائع ہو جاتی۔

جی دو افسانے مسترد بھی ہوئے مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ یقیناً ان میں کچھ کمی ہوگی جب ہی تو شائع نہ ہو سکے۔ اگر الفاظ میں طاقت ہوتی تو وہ اپنی طرف مائل کر لیتے۔ یوں سمجھیں، جیسے پوری کلاس پیپر دیتی ہے پوچھنے یہ سب ہی کہتے ہیں۔ پیپر بہت اچھا ہوا مگر جب ہم چیک کرنے بیٹھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کیا کیا گل افشانیاں ہوتی ہیں تو ایسے ہی ہم سب اپنی طرف سے اچھا ہی لکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ تو ایڈیٹر صاحبان کی ہمت ہوتی ہے کہ ڈھیروں خطوط اور افسانے پڑھ پڑھ کے ان کے ساتھ کیا بیتتی ہے پھر اس ڈھیر میں سے کچھ خطوط اور افسانے سلیکٹ کرنا میں تو سلام پیش کرتی ہوں آپ سب کے حوصلے اور صبر کو۔

حمیرا شفیع

سب سے پہلے تو میں آپ سب کی ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس سروے میں شامل کیا اور اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ پہلا سوال ہی متاثر کن ہے۔

1۔ اگرچہ میرا تعارف ایک نئی رائٹر کے طور پر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ لکھنے لکھانے کی تحریک بچپن سے ہی میرے اندر جنم لے چکی تھی۔ پہلی تحریر (نام یاد نہیں) نوائے وقت کے بچوں کے صفحے ''پھول اور کلیاں'' میں اس وقت شائع ہوئی جب میں اسکول میں پانچویں جماعت طلبہ تھی۔

دراصل میرے والد محترم (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) مطالعہ سے بہت شغف رکھتے تھے۔ ہمارے گھر میں نوائے وقت، اخبار جہاں، خواتین ڈائجسٹ، شعاع، پاکیزہ وغیرہ باقاعدگی سے آتے تھے۔ مگر ہم بچوں کی رسائی صرف ''پھول اور کلیاں'' تک تھی۔

چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھتے پڑھتے ذہن میں بھی کئی کہانیاں ابھرنے لگیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ان دنوں ہمارے گھر دو گلیاں چھوڑ کر ایک کھمبے پر محکمہ ڈاک والوں نے ایک بڑا سا سرخ رنگ کا لیٹر بکس نصب کیا تھا۔

(جو کچھ عرصے کے بعد ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہاں سے ہٹا دیا گیا) اسکول جاتے ہوئے اس بکس پر نظر پڑی تو ایک نئے خیال نے چٹکی بھری۔ گھر آ کر رف کاپی سے صفحے پھاڑ کر ایک چھوٹی سی کہانی تحریر کی ابا جان کی فائل سے نیلا لفافہ اڑایا۔ رسالے سے ڈھونڈ کر ایڈریس لکھا اور اگلے دن اسکول جاتے ہوئے لیٹر بکس کے حوالے کیا۔

''ہفتے بعد ''پھول اور کلیاں'' دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ تحریر صفحے کے عین درمیان میں جگمگا رہی تھی۔

پھر کیا تھا، شوق اور طلب دونوں بڑھ گئے۔ اسکول جاتے ہوئے تحریر بکس میں ڈال دیتی اور اکثر وہ چھپ بھی جاتی۔ گھر والے خوش تو بہت ہوتے مگر ساتھ ہی خبردار بھی کیا کہ پڑھائی میں کوئی کمی نہیں ہونا چاہیے۔ پھول اور کلیوں کے علاوہ اخبار جہاں میں جو بچوں کے لیے صفحہ مخصوص ہوتا ہے۔ اس میں بھی کچھ تحریریں شائع ہوئیں۔ مگر وائے افسوس اس سلسلے کو زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکی۔ بچپن میں انتہائی ذوق وشوق سے جو سفر شروع کیا تھا۔ وہ زندگی میں آنے والے ناگہانی حالات کی وجہ سے جاری نہ رہ سکا۔

ا۔ الفاظ کے ساتھ ہی پیدا ہوتے ہی بن جاتا ہے۔ جب کانوں میں اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ایک علم دوست گھر میں پیدا کیا۔ والد صاحب پیشے کے لحاظ سے پٹواری تھے مگر شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی گھر میں بہت سی علمی وادبی کتابیں دیکھیں۔ پنجابی لوک ادب کی کتابوں کے بڑے بڑے نسخے موجود تھے۔ بڑی بہن (آپا جی) اور چھوٹے بھائی (مجھ سے بڑے) گل نواز (ذوالفقار علی خالد) مقابلی ڈائجسٹ منگواتے جاسوسی اور سسپنس۔ اس کے علاوہ عمران سیریز کے بے شمار ناول پڑھے۔ یوں پڑھتے پڑھتے کب لکھنا شروع کردیا کیا بتاؤں۔ یہ یاد ہے کہ کالج کے دنوں میں ہماری اردو کی لیکچرار محترمہ شاہین مفتی صاحبہ جو کالج میگزین کی ایڈیٹر تھیں۔ ان کی جانب سے نوٹس بورڈ پر ایک نوٹ آویزاں کیا گیا۔ ہم نے جھٹ ایک نظم اور ایک غزل لکھ بھیجی جب میگزین شائع ہوا تو یقین نہیں آرہا تھا۔ جیسے اب نہیں آرہا کہ مجھے جوابات لکھنے کی آفر ہوئی ہے۔ پھر کچھ گجرات کے مقامی ڈائجسٹ میں شاعری شائع ہوتی رہی جذبہ نام تھا رسالے کا۔ پھر شادی کے بعد سب کچھ چھوٹ گیا۔

پھر اسکول میں موقع بہ موقع اشعار کہنا۔ سچویشن کے مطابق اشعار لکھنا تو تقریباً ساری کولیگز مگر خاص طور پر نگہم افضل اور طیبہ کومل کہتی رہتیں کہ مس آپ لکھا کریں۔ پھر الفاظ پیچھا کرنے لگے۔ کردار ساتھ چلنے لگے۔ ڈائیلاگ کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ واقعات بے چین کرنے لگے تو یوں جناب قلم پکڑا اور کاغذ سے ایک نیا تعلق جوڑ لیا۔ ایک بات تو بھول ہی گئی۔ اصل تحریک تو ادارے کی طرف سے ملی جب آپ لوگوں نے میرے خط پڑھے تو مشورہ دیا کہ آپ میں صلاحیت ہے، آپ افسانوں کی طرف توجہ دیں۔ یوں آپ کی حوصلہ افزائی پر میں نے صفحہ قرطاس پر کرداروں کو جمع کرنا شروع کیا۔ یہ آپ کی گوہر شناس نظروں کا کمال ہے جو آج ریحانہ چوہدری اس سلسلے میں جوابات ارسال کررہی ہے۔

2۔ جاسوسی اور سسپنس جب شادیوال جاتی وہاں سے لے آتی اور رات کو کاموں سے فارغ ہوکے پڑھ لیتی۔ پھر میری بھانجی حمیرا ریاض (اللہ جنت نصیب کرے) میرے گھر کے سامنے ان کا گھر ہے یعنی میں اور میری باجی خالدہ دونوں کی شادی مدو کے ننھیال میں دو ماموؤں کے گھر میں ہوئی ہے۔ ان کی بڑی بیٹی جو ٹیچر تھی اور شادی کے ایک سال بعد ہی ایک بیٹے بالاج کی پیدائش پر اس کی ڈیتھ ہوگئی۔ تو پہلے اس نے پڑھنے شروع کیے۔ پھر اس نے مجھے دیا۔ آنٹی یہ پڑھیں اور میں جو پڑھنے کی جنون کی حد تک شوقین ہوں۔ پہلی دفعہ پڑھنا شروع کیا تو بس پھر جاسوسی اور سسپنس کو بھول گئی۔ مگر جب شعاع جلدی ختم ہوجاتا ساتھ ساتھ خواتین بھی منگوانا شروع کردیا۔

اب حالت یہ ہے کہ 20 تاریخ سے اگلے مہینے کے شعاع کا انتظار شروع ہوجاتا ہے۔ اور 26 سے دوکان کے چکر لگوانا شروع۔ اسکول میں بے چارے ملازمین اور گھر میں ارسلان اور دیور عمران یہ سب شعاع کے پیچھے جگہ جگہ چھاپے مارتے ہیں۔ میں گن کر بتا نہیں سکتی کہ خطوط کی محفل میں کتنی مرتبہ ایک ایک خط کا ایک ایک لفظ پڑھتی ہوں۔ اب تو میرا تعارف ہی شعاع بن گیا ہے سابقہ شاگردیں فون کرکر کے پوچھتی ہیں کہ شعاع میں ریحانہ چوہدری آپ ہی ہیں۔ یوں حمیرا کے ذریعے شعاع سے ہونے والا تعارف اب پورے علاقے میں میرا تعارف بن چکا ہے۔

3۔ جب میرا پہلا افسانہ شائع ہوا، اس کی اشاعت کی نوید تین مہینے پیشتر ہی مل چکی تھی پھر کورونا کی وجہ سے دو ماہ ڈائجسٹ شائع نہ ہوسکے جون میں تین مہینے کا مشترکہ شعاع ملا تو اس میں میرا پہلا افسانہ بہ عنوان راضی بہ رضا شائع ہوا۔ اپنے تاثرات کیا بتاؤں، ناقابل یقین خوشی تھی۔ یہ تو بات ہے افسانے کی مگر اس سے پہلے جب پہلی مرتبہ شعاع میں میرا شعر چھپا تھا۔ اس وقت کی کیفیت تو میں لفظوں میں بتا ہی نہیں سکتی۔ میری سارہ اور نور، ارجمند بہت خوش تھیں بار بار مجھ سے سارہ گلے ملتی اور نور تو اتنی حیران

ایک طویل عرصے تک تو میں قلم اٹھانا ہی بھول گئی جس کا اب شدید قلق ہے۔

2۔ شعاع کا ساتھ بھی بہت پرانا ہے۔ یہ رسالے عام طور پر بڑوں کے قبضے میں رہتے تھے۔ باقاعدہ اجازت ذرا دیر سے ملی تھی۔ پھر بھی چھپ چھپا کر پڑھ ہی لیتے تھے۔

''جہاں تک شعاع میں لکھنے کی بات ہے تو اس کا کریڈٹ میں اپنی تین دوشیزہ اور مخلص دوستوں کو دیتی ہوں جو خود بھی سالوں سے شعاع کی خاموش قاری ہیں۔ (پلیز ان کا ذکر مت کاٹیے گا) مس فاطمہ زاہد، مس روزینہ ناز اور مس حمیرا ناز ہوا یوں کہ ان دنوں مس روزینہ ناز صاحبہ اپنے کالج کے لیے سالانہ میگزین ''کونپل'' کے نام سے نکال رہی تھیں۔ اس سے پہلے بھی وہ یوم آزادی اور خواتین کے عالمی دن کے موقع پر مجھ سے کچھ نظمیں اور مضمون وغیرہ لکھواتی رہتی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ تم میگزین کے لیے دو افسانے تحریر کرو۔ ان کی فرمائش پر افسانے لکھ کر دیے جو انہیں بے حد پسند آئے۔ اس وقت مس حمیرا ناز بھی موجود تھیں۔ جواب کالج کی وائس پرنسپل ہیں، انہوں نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ دونوں کا خیال تھا کہ مجھے لکھنے لکھانے کا سفر دوبارہ شروع کرنا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے کسی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی اور شعاع سے بہتر پلیٹ فارم اور کیا ہوسکتا تھا۔ ایک افسانہ لکھ کر بھیجا جب وہ چھپ گیا تو تیسری مہربان دوست کا فون آیا۔ کیا یہ تم ہو.....؟'' بس پھر اس کے بعد کا سارا کام فاطمہ زاہد کا ہے۔ میں تو شاید ایک افسانے کے بعد پھر خاموش ہو جاتی مگر میری اس دوست نے مجھے کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ فون کر کر کے لکھنے پر اکساتی ہے اور پھر ہر تحریر پر فوراً ہی فیڈ بیک بھی دیتی ہے۔ شکریہ فاطمہ۔

3۔ شعاع میں میرا پہلا افسانہ ''دو لفظ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یقین کریں اتنی خوشی ہوئی کہ شاید پہلی تحریر کے چھپنے کی بھی نہیں ہوئی تھی۔

ایک طویل عرصے کے بعد قلم اٹھانا حیات نو کی نوید جیسا تھا۔ کمال اس میں میرا نہیں ان مہربان لوگوں کا ہے جنہوں نے مجھے پھر سے لکھنے کی ترغیب دی اور ان لوگوں کا بھی جنہوں نے میری تحریر کو اہمیت دی۔ اسے شائع کیا۔ شکریہ شعاع..... شکریہ امتل آپی۔

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ افسانہ بھیجنے کے ایک ماہ بعد ہی شائع ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں بھی ہزار خدشات تھے کہ چھوٹے شہر سے ہوں۔ کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ انسان اپنی سوچ مثبت رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

میری پہلی تحریر ہی شائع ہو گئی تھی۔ اب بھی کچھ تحریریں اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں۔ مسترد تو شاید کوئی نہیں ہوئی۔ ان شاء اللہ آئندہ کے لیے بھی اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔

زرقا سکندر

لکھنا ایک خداداد صلاحیت ہے اور انسان کے اردگرد ایسی بے شمار تلخ و شیریں زندگی کی حقیقتیں بکھری پڑی ہیں جو آپ کو لکھنے پر ابھارتی ہیں۔ اپنے تخیل اور قوت مشاہدہ سے کام لے کر انہیں الفاظ و بیاں کا لبادہ پہنایا جاسکتا ہے۔ بس ایسی ہی کچھ سچائیاں میرے بھی لکھنے کا سبب بنیں۔

شعاع سے پرانی شناسائی تو تھی ہی مگر اب دلی وابستگی بھی ہے۔ کچھ سالوں سے یہ مسلسل میرے زیر مطالعہ ہے۔ اس ادارے نے میری تحریروں کو اپنے ڈائجسٹ میں جگہ دے کر مجھے میری ہی نظر میں معتبر کر دیا ہے جس کے لیے میں اس ادارے کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ ویسے بھی میں شعاع کو اپنا میکہ ہی کہتی ہوں کیونکہ یہاں سے بھی مجھے وہی مان اور عزت ملی ہے جیسا میکے میں امی ابو دیتے تھے۔ ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

2۔ مجھ پہ خوشی کی وہ کیفیت طاری ہو گئی تھی جسے شاید لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہو۔ اپنا آپ اچھا لگنے لگا تھا جیسے کسی مہرباں نے آکر میری زندگی سجادی۔

پہلی تحریر شعاع کروانے کے لیے کتنا انتظار کرنا پڑا؟

سے لکھی تھی وہ تقریباً آٹھ ماہ بعد شائع ہوئی تھی۔ لیکن اب اللہ کا شکر ہے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ بہت جلدی لگ جاتی ہیں۔

شکر الحمدللہ۔ پہلی تحریر ہی شائع ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار مسترد ہو بھی جائے تو میں اسے دوبارہ مزید بہتر لکھ کر بھیج دیتی ہوں اور پھر قبولیت کی سند بھی مل جاتی ہے۔ یہاں میں ان لوگوں سے بھی کہوں گی جو کہانی مسترد ہونے پر ادارے کو مورد الزام ٹھہرانے لگتے ہیں۔ حالانکہ دوبارہ غور خوص سے اسے زیادہ اچھے طریقے سے لکھ کر بھیج سکتے ہیں۔

ادارے کی ترقی کے لیے بہت ساری دعائیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے وابستہ تمام افراد پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے۔

زارا ہنجرا.....اسلام آباد

ج: بچپن سے شوق تھا۔ سید محسن رضا گیلانی فیورٹ رائٹر تھے۔ سوچتی تھی بڑی ہوں گی تو ان کی طرح کی نام ور رائٹر ہوں گی فورتھ کلاس میں ڈراما لکھا (ہاہاہا) لیکن وہ نوٹ بک کہیں گم ہوگئی۔ باقاعدہ طور پر 2019 میں لکھنا شروع کیا۔ میرے فیملی ڈاکٹر ہیں ''ڈاکٹر بلال احمد'' ان کی اک تحریر پڑھی وہیں سے تحریک ملی۔ میرے اندر کی سوئی رائٹر جاگ گئی۔ پیپر پین اٹھایا اور افسانہ لکھ ڈالا۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ زندگی کا اک باب اندھیروں میں ہی گزر گیا۔ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والی بچی اردو ادب سے جس کا دور دور دور تک واسطہ نہ تھا لیکن میرے اندر کی رائٹر مجھے پش کرتی رہتی تھی سو ڈھونڈ لیا شعاع کو خواتین ڈائجسٹ کا سراغ لگایا۔ پہلے خواتین ڈائجسٹ کی کھوج لگائی۔ وہیں سے شعاع سے متعارف ہوئے اور اب تو ایسا لگتا ہے جسم اور روح کا تعلق بن گیا ہے ان سے۔ ایسا اٹوٹ تعلق جڑا ہے کہ آخری سانس تک ساتھ نظر آتا ہے۔

پہلی تحریر خواتین ڈائجسٹ میں بھیجی فوراً شائع ہوگئی بالکل انتظار نہیں کرنا پڑا جس کے لیے میں معزز مدیران بالخصوص محترمہ نسیم انعام نسیم واصفہ صاحبہ کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے میری ادنیٰ سی کاوش کو سراہ کر علم و ادب کے جہاں سے مجھے روشناس کرایا۔

ابھی تک کوئی تحریر مسترد نہیں ہوئی، چاہے خواتین ڈائجسٹ میں بھیجی ہو یا شعاع، کرن یا حنا میں۔ ہر جگہ سے عزت ملی ہے۔ بغیر کسی انتظار کے میری تحریریں فوراً شائع ہوئی ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ خاص میرے رب کا کرم اور ادارہ والوں کا حسن نظر ہے، میں تمام قارئین کی بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری کہانیوں پر اچھا فیڈ بیک دے کر میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

2۔ پہلا افسانہ چھپا تو ''او مائی گاڈ'' بے ساختہ ہی منہ سے نکلا تھا۔ اتنی ایکسائیٹمنٹ تھی کہ فوراً سیکنڈ کی تاخیر کیے بغیر پیپر پین اٹھایا اور افسانہ لکھنا شروع کردیا۔ ''میری فیملی، فرینڈز، یا کانیکٹ لسٹ میں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں نے کوئی کہانی لکھی تھی سو اشاعت کا بھی کسی سے شیئر نہیں کیا تھا بلکہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوسکا، یہ تو چند روز پہلے ہی دلچسپ اتفاق ہوا کہ یہ راز فاش ہوگیا اب یہ قصہ بھی سناتے چلیں ورنہ آپ کو تجسس رہے گا'' ہوا کچھ یوں کہ اس دن ابرار بھائی کے گھر بیٹھے تھے (ابرار الحق مشہور سنگر) چائے کا دور چل رہا تھا۔ اچانک میسج ٹون پر چونک کر موبائل دیکھا۔ ایک فرینڈ نے کرن ڈائجسٹ جولائی 2021 کے شمارے کی لسٹ سینڈ کی۔ خوشی سے بے ساختہ ہی غصہ سے نکل گیا۔ ''اوہ واؤ میری اسٹوری'' بس اس طرح راز فاش ہوا۔ ''بات کہاں سے کہاں جا نکلی اب پوائنٹ پر آتے ہیں۔'' پہلی تحریر پر جو خوشی ہوئی تھی وہ لمحے وہ فیلنگز نہیں بھول سکتی۔

ماریہ نواز

کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ کم عمری سے بھی کافی پڑھی یاد نہیں کہ پہلی بار کب سوچا لکھنے کے بارے میں۔ مگر لاشعوری طور پر شاید بچپن سے ہی تھا دل میں کہ کبھی نہ کبھی کچھ لکھوں گی۔ کیا لکھوں گی اور کب لکھوں گی۔ یہ پتا نہیں تھا پھر ایک دن ٹی وی پر

[illegible] کیوں نہ اس بے چاری [illegible] مختلف انداز میں لکھوں۔ پھر [illegible] میں چار سال لگ گئے۔ (انتہائی [illegible] عورت ہوں) مگر ایک دن لکھ ہی ڈالی۔

[illegible] ڈائجسٹ نہیں پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن ایک دفعہ کالج سے خواتین ڈائجسٹ لے کر آئیں۔ میں [illegible] میں تھی۔ چھپ کر پڑھا پھر ایک فیملی فرینڈ کے ہاں شعاع دیکھا تو وہ بھی لے کر پڑھ لیا پھر بہت ڈائجسٹ پڑھے امی سے چھپ چھپ کے۔

2۔ پہلا ناول چھپا تھا۔ بھیجا بڑے کانفیڈنس سے تھا کہ چھپ جائے گا مگر دو تین مہینے تک کوئی خبر نہیں ملی تو اپنا کانفیڈنس خود ہی کچھ بے جا لگنے لگا۔ ایسے میں اچانک فیس بک کے ایک پیج پر فہرست میں اپنا نام دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔

عندلیب زہرا

1۔ مجھے بچپن سے اپنے باؤجی سے کہانیاں سننے کا شوق تھا..... وہ انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے، ان کی کہانیوں کے کردار ڈلہوزی، شملہ پہاڑی، تبتی محلے میں سانس لیتے..... گھومتے پھرتے..... وہ ان کہانیوں کے ذریعے نوسٹلجیا میں ہوتے۔ میں ان کی سامع..... یوں کہانیوں کو سنتے سنتے لکھاری بن گئی۔

شعاع سے کیسے متعارف ہوئی..... میری امی کو ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق تھا شادی سے پہلے سے..... وہ خواتین کی قاری ہیں۔ کبھی نانا یا ابو نے پابندی نہیں لگائی..... امی لکھاریوں کا ذکر..... شاہین رشید امتل آپی یوں کرتیں جیسے وہ ہمارے قریبی عزیز..... بہن..... پھوپھو..... کزنز پڑھتیں..... تو بس تعلیم و تربیت نونہال پڑھتے پڑھتے میں شعاع کی قاری بن بیٹھی۔

میں جنگ میں مضامین لکھتی تھی۔ کالج میگزین میں بھی..... افسانے لکھنے کا سوچا نہیں..... خواتین کی رائٹر بہت ذہین لگتیں۔ امی نے کہا، تم یہاں کوشش تو کرو..... بس پہلا اقدم اٹھانے کا حوصلہ امی نے دیا۔

3۔ افسانہ چھپنے پر کیا تاثرات تھے..... شعاع ستمبر میں پہلا افسانہ شائع ہوا 2016..... پہلا ہی شائع ہوا جون میں بھیجا..... انتظار نہیں کرنا پڑا ہاں کسی کو نہیں بتایا۔ مطلب فرینڈز..... اچانک اپنا نام دیکھا تو پہلے شاک لگا..... اف یادگار لمحات..... بار بار اپنا نام دیکھتی افسانہ پڑھتی..... بے چینی سے قارئین کی رائے کا انتظار تھا..... سب نے مثبت رائے دی..... مجھے اپنا آپ معتبر لگا..... بہت بہت خوشی ہوئی تھی۔

پہلی تحریر کے لیے کتنا انتظار کرنا پڑا..... کوئی نہیں..... جون میں عید کا سروے اور افسانہ پوسٹ کیا..... جولائی، اگست میں نہیں تھا، میں سمجھی ناقابل اشاعت ہیں۔ لیکن ستمبر میں آ گیا۔

پہلی تحریر شائع ہو گئی تھی..... لیکن بعد میں جب افسانہ نگاری کے متعلق سنجیدہ ہوئی تو تحریریں مسترد بھی ہوئیں۔ کھو بھی جاتی تھیں اور آہستہ آہستہ لکھنے میں بہتری آ گئی..... آپ گرنے سے" ہارنے سے تحریر کے مسترد ہونے سے مت مایوس ہوں..... جب ہم چلنا سیکھتے ہیں، کتنی چوٹیں لگتی ہیں آخر سیکھ جاتے ہیں بس یہ ہی بات میں نے گرہ میں باندھ لی ہے..... دل مایوس ہو بھی جائے تو بھی میں کوشش نہیں ترک کرتی۔

پہلے سوال کا جواب ادھورا ہے..... میں اس کو مکمل کرتی ہوں۔

باؤجی کی وفات کے بعد میرا نقصان ہوا میں ایک قصہ گو سے محروم ہو گئی..... ابو میرے لیے سنو وائٹ سنڈریلا کی کہانیوں کی کتابیں لاتے..... مجھے خوب صورت ڈائریاں گفٹ کرتے جس میں بچکانہ باتیں سنجیدگی سے لکھتی..... سہیلی سے لڑائی..... امی سے شکوے..... گڑیا کی شادی کا حال..... باؤجی کی یادیں وغیرہ..... نونہال میں کہانی پوسٹ کی تو ایڈیٹر نے ناقابل اشاعت کے ساتھ واپس کی اور خط لکھا کہ آپ مزید کوشش کریں۔ ابو خوش کہ اتنے بڑے رسالے سے خط آیا ہے..... آخر بچوں کے جنگ میں کہانی شائع ہوئی تو ابو نے سب کو بتایا، چھوٹی سی کہانی کی بڑی خوشی منائی..... لکھنے کی تحریک ابو نے دی حوصلہ افزائی کر کر کے..... اسکول میں ٹیچر بھی تعریف کرتیں۔

مدد سے آپ آگے بڑھتے ہیں۔

آخر میں یہ کہوں گی کہ امتثال آپی..... واصفہ آپی خواتین کا ادارہ نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہمارا تخلیقی ہنر جو ہم سے بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کو امتثال آپی دریافت کرلیتی ہیں۔ شعاع کی سالگرہ کے موقع پر یہ ہی کہوں گی کہ یہ نئے لکھاریوں کے لیے۔ اچھوتے آئیڈیا کے لیے بہترین پلیٹ فارم ہے۔ کتنے قلم کار اس ادارے کی بدولت معتبر ہوئے ہیں..... ریاض صاحب کا لگایا پودا آج گھنا چھتنار درخت بن چکا ہے۔ جو پھل دار بھی ہے۔ سایہ دار بھی..... اور ایک اچھے ادارے کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے رہنما بھی ہے۔

گل ارباب

لکھنے کی تحریک پڑھنے سے پیدا ہوئی۔ بچپن میں جب عمرو عیار اور جنوں بھوتوں کی کہانیاں پڑھتی تھی۔ تو کاپی پینسل لے کر ویسی ہی کہانیاں لکھ لیتی تھی اسی طرح جب ڈائجسٹ پڑھنے شروع کیے تو میں خود سے کردار بنالی اور کہانی کو اچھا سا انجام دے دیتی لیکن یہ کہانیاں ذہن کے قرطاس پر ہی اتارتی تھی اور شعاع، کرن، خواتین کے ساتھ ساتھ میرا ایک خیالی ڈائجسٹ بھی ہر مہینے تیار ہوہی جاتا تھا جس کی رائٹر ریڈر میں خود ہی ہوتی تھی۔

2۔ شعاع سے تعارف اب بھی یاد ہے پہلے ہم تین سہیلیاں پیسے ملا کر خواتین خریدتی تھیں اور پھر ایک بار اخبار والا ساتھ شعاع بھی لے آیا۔ نئے خرچے نے پریشان تو کیا لیکن جب شعاع کو پڑھنا شروع کیا تو جیسے خواتین ڈائجسٹ ہی پڑھ رہی ہیں۔ اس سے پہلے خواتین جیسا دوسرا کوئی ڈائجسٹ نہیں تھا۔ ہم سہیلیوں نے سر جوڑ کر نئے خرچے کے ہر پہلو پر گفت وشنید کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ذرا سا اور خرچا کر کے دونوں ڈائجسٹ خریدا کریں گے۔ پہلے ہمیں افسوس ہوا کرتا تھا کہ خواتین کے لیے مہینہ بھر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اب مہینے میں دو مل رہے تھے تو جیب کرچ بچا کر خریدتے اور پڑھتے تھے پھر شعاع کے پچھلے شمارے بھی ڈھونڈ کر پڑھے۔ کیونکہ یہ چھپ تو رہا تھا لیکن ہم صرف خواتین سے واقف تھے اور یوں محبت دو اور پھر کرن کے بعد تین پر تقسیم ہوتی گئی، وہ دو ڈائجسٹ ہم باری پر پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے ایک رات میں مکمل ڈائجسٹ پڑھنا ہوتا تھا کیونکہ مجھے نئے کور ڈائجسٹ کی ہی طلب ہوتی تھی۔ پیسے بھی میں زیادہ ڈالتی تھی اور اگلی صبح دوسری سہیلی کو دینے کی شرط بھی پوری کرنی ہوتی تھی۔ کئی شعاع، خواتین میں نے ایک رات میں پڑھے۔ اکثر پڑھتے ہوئے آنکھیں بند ہوجاتیں اور پانی کے چھینٹے مار کر نیم غنودگی میں پھر سے کسی کہانی میں الجھ جایا کرتی تھی۔

3۔ کرن کے بعد پہلا افسانہ شعاع میں ہی چھپا تھا اور ایسی خوشی ہوئی کہ اس دن فون کارڈ ہی ختم کر ڈالا۔ ابو کو، بھابیوں کو، سہیلیوں اور رشتہ داروں سب کو فون کر کر کے بتایا کہ شعاع میں فلاں ناول آیا ہے۔ ضرور خریدیں اور اپنے قارئین کو چپکے سے بتادوں کہ ناول بھیج کر گاؤں کی ایک بزرگ غریب خاتون سے کہا تھا کہ دعا کریں، چھپ جائے اور ناول کا جو اعزازیہ ملا۔ وہ آپ کو دوں گی اور ایسا ہی کیا بھی تھا۔

پہلی تحریر تقریباً دو سال بعد چھپی تھی اور چھپنے والی جیسے ہی بھیجی، اسی مہینے چھپ بھی گئی تھی لیکن اس دوران جو تحاریر ریجیکٹ ہوئیں۔ ان سے مجھے مزید لکھنے کی تحریک ملتی رہی۔ میں نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور یہ ہی سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور مجھے اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا۔

اور ایسا ہی ہوا اللہ تعالیٰ محنت کا پھل ضرور دیتا ہے جب کوئی تحریر ریجیکٹ ہوتی تو میں یہ ہی سوچتی کہ میری محنت میں کمی رہ گئی تھی۔ اب کی بار مزید محنت سے لکھوں گی اور تخلیق کار کے پاس محبت تو ہوتی ہی ہے اور تجربہ یہ کہتا ہے کہ محنت اور محبت سے لکھنے کو پذیرائی ضرور ملتی ہے۔

مایہ ناز فنکار

طلعت حسین سے مُلاقات

شاہین رشید

معلوم نہیں کیوں آج کل ماضی کے فنکاروں سے ملنا اور ان سے انٹرویو کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو اکیڈیمی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''طلعت حسین'' کو کون نہیں جانتا۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل اسکرین سے غائب ہیں لیکن ہمارے درمیان موجود تو ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے اور لمبی زندگی عطا کرے۔

''السلام علیکم کیسے مزاج ہیں؟''

''جی الحمدللہ..... آپ ٹھیک ہیں؟''

''جی الحمدللہ..... آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟''

''میں آرٹس کونسل میں ڈرامہ، میٹک اور ایکٹنگ کے شعبے کا سربراہ ہوں..... اور ناپا اکیڈیمی لیکچرار ہوں۔ یا یوں سمجھیں کہ پڑھا رہا ہوں۔''

''ہم تو سمجھے کہ آپ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اور لائف کو انجوائے کر رہے ہوں گے؟''

''ارے نہیں۔ زندگی تو کام سے ہے اور کام اور مصروفیات سے بڑھ کر کیا انجوائے منٹ ہوگی۔ البتہ بیگم ریٹائرڈ زندگی گزار رہی ہیں اور یقیناً وہ زندگی کو انجوائے کر رہی ہیں۔ ان کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کی سربراہ تھیں۔''

''اور کیا روٹین ہے آپ کی؟''

''کوئی خاص نہیں۔ رات کو جلدی سو جاتا ہوں اور صبح جلدی اٹھ جاتا ہوں۔ اور پھر جو میری ذمہ داریاں ہیں، ان کو نبھاتا ہوں۔''

''فارغ وقت کیسے گزارتے ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ میری اتنی مصروفیات ہیں کہ مجھے فارغ وقت ملتا ہی نہیں کہ میں سوچوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق ہے اور میں پڑھے بغیر تو رہ ہی نہیں سکتا۔ یوں سمجھیں کہ مجھے نیند ہی نہیں آتی۔ اور کتابیں خریدنا بھی میری ایک طرح کی عیاشی ہے میرا ذاتی خرچ کتابوں پر ہی ہوتا ہے۔ اور.....''

''آپ کو لکھنے کا بھی تو شوق تھا..... وہ کیا ہوا؟''

''وہ ابھی بھی ہے۔ اور یہ سلسلہ میں نے دوبارہ شروع کر دیا ہے۔ ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ آج کل اور کچھ کہانیاں میں نے لکھی ہیں۔''

''سوال اگرچہ گھسا پٹا ہے۔ مگر میں پھر بھی سینئر سے ضرور پوچھتی ہوں کہ آج اور کل کے ڈراموں میں کیا نمایاں فرق آتا ہے؟''

''دیکھیں جی..... پہلے صرف ایک چینل ہوتا تھا۔ اب بے شمار چینلز ہیں۔ پہلے معروف رائٹرز سے ڈرامے لکھوائے جاتے تھے۔ اور سب بہت محنت اور توجہ کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ اور میں تو اپنی مرضی کے اسکرپٹ میں ہی کام کرتا تھا اور اپنی پسند کی پے منٹ بھی لیا کرتا تھا۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ بھارت کی نسبت آج بھی ہمارا ڈرامہ بہت اچھا ہے۔''

''پہلے صرف تیرہ اقساط پر مبنی ڈرامہ ہوتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ یہ اچھا قدم ہے یا..... مناسب؟''

''آپ خود سوچیں کہ جو ڈرامہ تیرہ اقساط سے بڑھ کر لاتعداد اقساط تک چالیس پچاس اقساط تک پہنچ جائے تو ''معیار'' کا کیا حشر ہوگا۔ اچھے اسکرپٹ بھی اس طوالت کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں۔ جب حالات ایسے ہوں تو اچھا اسکرپٹ کیسے سامنے آسکتا ہے۔''

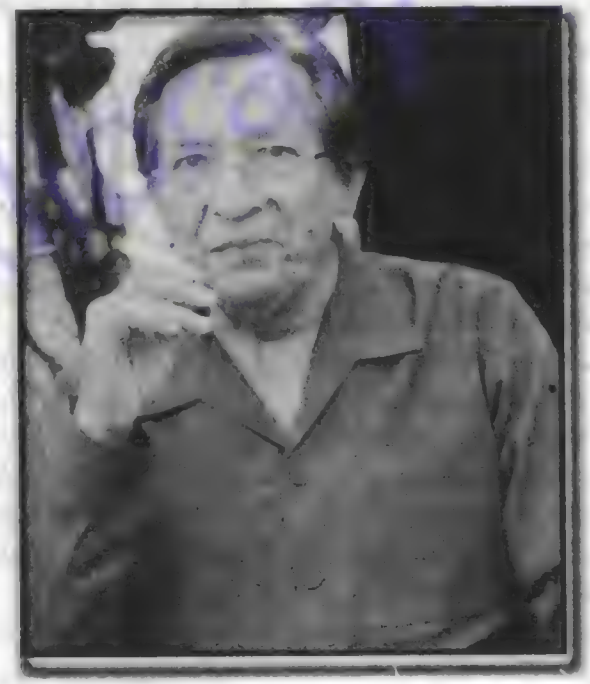

''آپ کی شخصیت میں بڑا رعب ہے۔ اپنی شخصیت کے بارے میں یا شخصیت کے کچھ راز بتائیے؟''

''راز تو کچھ بھی نہیں اور اگر راز بتا دیے تو پھر وہ راز کہاں رہیں گے۔ سب کو معلوم ہے کہ میں صاف دل کا اسٹیٹ فارورڈ انسان ہوں۔ کوئی بات دل میں نہیں رکھتا۔ جو دل میں ہوتا ہے، منہ پر کہہ دیتا ہوں۔''

''کہتے ہیں کہ آپ کو سمجھنا آسان نہیں اور شخصیت میں رعب اتنا ہے کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں؟''

''شخصیت میں رعب تو بھئی کیا کریں۔ اللہ نے ایسا بنایا ہے۔ اور ایسا کچھ نہیں کہ مجھے سمجھنا آسان نہیں ہے۔ بس تھوڑا سنجیدہ انسان ہوں..... مگر ایسا بھی نہیں کہ سنجیدہ ہی رہتا ہوں۔ بذلہ سنج ہوں..... یاروں کا یار ہوں۔ محفل میں ہنستا بولتا ہوں۔''

''مزید سوالات سے پہلے ہم آپ کو طلعت حسین کے بارے میں بتائیں کہ.....

طلعت حسین صاحب کے والد ''الطاف حسین وارثی'' کا تعلق بھارت کے شہر پٹیالہ سے تھا۔ جبکہ والدہ ''حیات النساء بیگم کا تعلق ''میسور'' سے تھا۔ بقول طلعت حسین صاحب کے کہ ہماری والدہ بہت ہی بارعب شخصیت کی مالک تھیں اور لوگ ان سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد سب پاکستان آگئے اور جب کراچی میں ریڈیو کا آغاز ہوا تو ''حیات النساء بیگم'' (جنہوں نے ''شائستہ بیگم'' کے نام سے شہرت پائی) نے ریڈیو پاکستان میں بہ حیثیت ''اناؤنسر'' کے ملازمت کرلی اور پھر آخری وقت تک اسی ملازمت سے وابستہ رہیں۔

طلعت حسین 18 ستمبر 1945 میں بھارت کے شہر پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ یہ تین بھائی ہیں سب سے بڑے طلعت حسین صاحب ہیں اور ان سے چھوٹے دو بھائی ہیں جن کے نام شجاعت حسین وارثی جو قیام پاکستان سے پہلے پیدا ہوئے اور سب سے چھوٹے بھائی عظمت حسین وارثی قیام پاکستان کے بعد پیدا ہوئے۔

طلعت حسین نے اعلیٰ تعلیم ''لندن اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈرامیٹک آرٹ'' سے حاصل کی۔ اور کچھ عرصہ ''بی بی سی'' سے بھی وابستہ رہے۔ لندن سے اعلا تعلیم حاصل کرکے پاکستان آئے اور پھر اس ملک سے عزت، شہرت اور دولت کمائی اپنے ملک نے انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ انہوں نے بہ حیثیت صداکار کے اپنے فنی سفر کا یا یوں کہہ لیں کہ اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ 1964 میں جب ٹی وی کا قیام عمل میں آیا تو ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے اور اپنے آپ کو ایک بہترین اداکار کی حیثیت سے منوایا۔

طلعت حسین نے خوب صورت آواز بھی پائی ہے بارعب لب ولہجہ کا فائدہ انہیں یہ ہوا کہ ''اہم دستاویزی فلموں اور ڈراموں کی ڈبنگ میں ان ہی کی آواز گونج رہی ہوتی ہے۔ اور طلعت حسین نے صرف اداکاری وصداکاری کو ہی اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا بلکہ ''ناپا'' اور دیگر یونیورسٹیز میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ بطور ڈائریکٹر بھی بہت کام کیا۔ ان خداداد صلاحیتوں کے علاوہ یہ بہترین کہانی نگار، افسانہ نگار اور شاعر بھی ہیں۔

''اپنے بچپن کے بارے میں بات کرتے ہوئے طلعت حسین صاحب نے بتایا تھا کہ

''میں پٹیالہ میں پیدا ہوا تھا اور وہاں ہمارا گھر ''حویلی'' کی مانند تھا۔ جہاں میرا بچپن گزرا۔ اتنے سال گزرنے کے باوجود آج بھی مجھے نہ صرف اپنی حویلی یاد ہے بلکہ وہاں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ بھی یاد ہے۔ ہمارے گھر کے قریب ایک ''نہر'' تھی جہاں شام کے وقت والد صاحب اکثر لے جایا کرتے تھے

اور ہم وہاں بہت انجوائے کیا کرتے تھے۔ مگر پھر جب دادا، دادی کا انتقال ہوگیا تو والد صاحب اس حویلی سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے اس حویلی کو چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ اور اس کو مکمل جمہ پہناتے ہوئے دہلی چلے گئے۔ اور وہاں والد صاحب نے ایک سرکاری ادارے میں جاب کرلی۔ اور جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ہم سب ہجرت کرکے پاکستان آگئے۔ اور یہاں مارٹن کوارٹر میں رہائش اختیار کی۔ ہم تو چھوٹے تھے..... زندگی کے نشیب وفراز سے ناآشنا، اس لیے ہم نے اپنے بچپن کو بہت انجوائے کیا۔

''پڑھائی میں آپ کیسے تھے؟''

''بہت اچھا..... بہت ذہین طالب علموں میں میرا شمار ہوتا تھا۔ میری انگریزی بہت اچھی تھی۔ والد صاحب نے ہماری انگریزی پر بہت توجہ دی تھی اور چونکہ انگریزی اردو دونوں ہی اچھی تھیں تو میں ملکی اور غیر ملکی ادب کی کتابیں بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اور مطالعہ سے ہی میرے دل میں بھی لکھنے کی امنگ پیدا ہوئی۔''

''والدین میں سخت مزاج کون تھا۔ بچوں کی تربیت کے معاملے میں؟''

''ہماری والدہ تھوڑی سخت مزاج تھیں۔ والد نہیں۔ کم سے کم وہ میری تو ہر بات مانتے تھے اور مجھ سے بہت پیار کرتے تھے..... میں گلوکار بننا چاہتا اور اس لیے انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ تمہیں ہارمونیم منگوا کے دوں گا مگر..... والدہ صاحبہ نے منع کردیا۔ اور یوں میرا شوق بیچ میں ہی رہ گیا۔ پاکستان آکر تو جیسا کہ میں نے بتایا کہ والد صاحب نے سرکاری ملازمت کرلی اور والدہ نے ریڈیو پاکستان میں۔''

''گاڑی کے دو پہیے چلیں تو گھر میں خوش حالی آجاتی ہے ایسا ہی تھا؟''

ہوتا تو ایسا ہی ہے۔ لیکن والد صاحب نے والدہ کو سختی سے منع کردیا تھا کہ آپ اپنی کمائی گھر پر

خرچ نہیں کریں گی۔ گھر کی ذمہ داری میری ہے اور میں ہی اسے پورا کروں گا..... اور یوں انہوں نے کبھی گھر کی ضرورت کے لیے والدہ کو خرچ نہیں کرنے دیا۔ اور پھر جب والد صاحب رخصت ہوئے تو ساری ذمہ داری والد پر آگئی۔''

''آپ نے جس ماحول میں پرورش پائی۔ اس لحاظ سے تو آپ کو تدریس کے شعبے سے وابستہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر آپ شوبز میں آگئے؟''

آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ اصل میں مجھے اس فیلڈ کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات نہ تھی۔ والدہ ریڈیو جاتی تھیں تو کبھی اس جانب توجہ نہ دی تھی۔ درحقیقت مجھے تو بچپن سے ہی پروفیسر اور ''سی ایس پی آفیسر'' بننے کا شوق تھا۔ والد صاحب اکثر پوچھا کرتے تھے کہ بھئی..... پڑھ لکھ کر کیا بننا ہے۔ تو میں کہتا کہ پروفیسر..... تو کہتے اس کے لیے انگریزی کا اچھا ہونا بہت ضروری ہے تو پھر وہ خود مجھے انگریزی پڑھایا کرتے تھے جس کی وجہ سے میری انگریزی

بہت اچھی ہوگئی تھی۔

مگر..... قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ والد صاحب دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اور امی اکیلی رہ گئیں اور ساری ذمہ داری ان پر آگئی۔ تو پھر جب میں انہیں ریڈیو جاتے ہوئے دیکھتا تو مجھے بھی شوق ہوا کہ میں والدہ کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن جاؤں اور دیکھوں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ تو میں اکثر اوقات چلا جاتا تھا اور اس خواہش کا اظہار کرتا تھا کہ میں بھی صدا کاری کروں..... مگر والدہ اس کے خلاف تھیں.....

خیر..... جب مجھے معلوم ہوا کہ ریڈیو کے آڈیشن ہورہے ہیں تو میں نے بھی آڈیشن دے دیا..... اور کامیاب ہوگیا..... اور یوں مجھے ڈراموں میں صدا کاری کا موقع ملا.....

اس زمانے میں ریڈیو بہت مقبول تھا کیونکہ ٹی وی کی نشریات کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اور نہ ہی کوئی ان چیزوں سے واقف تھا۔ خیر جب ٹی وی آیا 1967 میں۔ تو ریڈیو سے وابستہ لوگوں کو ہی بلایا گیا۔ اور چونکہ میں ریڈیو پر زیادہ تر اناؤنسمنٹ کرتا تھا تو میرا بھی دل چاہا کہ ٹی وی پر بھی اناؤنسمنٹ ہی کروں۔ مگر مجھے اسسٹنٹ پروڈیوسر کی جاب کی آفر آئی جو کہ میں نے رد کردی.....

''کیوں؟''

''انسان کام وہ کرے جس کا اسے شوق ہو۔ تو مجھے اناؤنسمنٹ اور اداکاری کا شوق تھا بہرحال دوبارہ آڈیشن دیا اناؤنسمنٹ کے لیے تو پھر مجھے اناؤنسمنٹ کے شعبے سے منسلک کردیا گیا اور مجھے ''نیوز'' کاسٹر کے طور پر ہائر کردیا گیا۔

''اسلم اظہر'' کے ساتھ میں ریڈیو پر کام کرچکا تھا۔ وہ بھی ریڈیو سے ٹی وی کی طرف آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ یہاں پر وہ کام کریں جو آپ میرے ساتھ کرتے چلے آئے ہیں..... چنانچہ میں نے ان کا کہنا مانا۔ مجھے تو اداکاری سے بھی لگاؤ ہو چلا تھا۔ مجھے مواقع ملتے رہے اور میں آگے آگے بڑھتا رہا۔''

''اپنے کام سے مطمئن ہیں؟''

''بھئی۔ میں تو آج تک اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کو کہاں پر کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ اسٹیج پر، ٹی وی پر، ڈراموں میں یا فلموں میں۔ تو سچ پوچھیں تو کام میں جو چاشنی آنی چاہیے تھی وہ نہیں آئی۔''

''اپنے بچوں کے بارے میں بتائیں؟''

''میرے ماشاء اللہ تین بچے ہیں۔ بڑی بیٹی کا نام ''تزئین'' ہے۔ جس نے چند ڈراموں میں کام کیا اور پھر اپنی گھریلو مصروفیات اور پڑھائی کی وجہ سے فیلڈ کو خیرباد کہہ دیا..... اس سے چھوٹی بیٹی کا نام ''روحینہ فیصل'' ہے جس نے ڈبل ایم اے کیا ہے اور آج کل کینیڈا میں قیام پذیر ہے۔ اور ایک بیٹا ہے ''اشعر حسین'' کراچی میں ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک کمپنی میں جاب کرتا ہے اور اس کے علاوہ وہ بہت اچھا ڈائریکٹر بھی ہے اور کافی ڈرامے ڈائریکٹ بھی کرچکا ہے اور ہاں روحینہ فیصل کے بارے میں بتاؤں کہ وہ کینیڈا میں ایک یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔''

''مزاج کے کیسے ہیں آپ؟ غصہ آتا ہے آپ کو؟''

''مجھے زیادہ غصہ نہیں آتا۔ بے شک میری پرسنالٹی ایسی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید میں غصہ کا تیز ہوں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ پوری لائف میں ابھی تک بہت ہی کم لڑائی ہوئی ہوگی اور یہ بات آپ کو میرے گھر والے بھی بتاسکتے ہیں کہ میرا غصہ بہت کم ہے بلکہ آتا ہی نہیں ہے۔''

''سالگرہ مناتے ہیں..... خود یاد رکھتے ہیں یا دوسرے؟''

''مجھے خود بھی اپنی سالگرہ یاد رہتی ہے اور میری فیملی کو بھی..... اور میری سالگرہ پر کافی اہتمام کرتی ہے۔''

''یہ تھی ایک نئی اور پرانی ملاقات..... اب اجازت دیں۔''

ماہنامہ

کرن

اگست 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

- ''جشن آزادی'' کے موقع پر شاہین رشید کا سروے،
- اداکار ''آغا طلال'' کہتے ہیں ''میری بھی سنیے''،
- اس ماہ ''اقصیٰ امان'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،
- ''دامن سحاب'' مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- ''گیت'' فلک تنویر کا مکمل ناول،
- ''نمکین پانیوں کا سفر'' منعم ملک کا مکمل ناول،
- ''میری بیداریوں کو خوابِ زلیخا نہ بنا'' سنیعہ مرزا کا مکمل ناول،
- ''جنہیں راستے میں خبر ہوئی'' نازیہ کنول نازی کا ناولٹ،
- ''گلزار'' منشا محسن علی کا ناولٹ،
- نفیسہ سعید، ام اقصیٰ اور مونا شاہ قریشی کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- **''کرن کتاب''**

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزیدار ریسپیز کے ساتھ

اگست 2021ء کا شمارہ شائع ہوگیا

ترجمانہ نگار عدنان

شام کی چھایا میں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر وا سے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ بھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رکھنے کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آفی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں جزم اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر وا سے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آفی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر جہان سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، رداغصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔

ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔

میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ بیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔

کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔

کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔

کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آ جاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔

حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔

موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔

موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دیتی اپنے بچے کے ساتھ جورات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئر پورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی

پہچانی آواز لگی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدتمیزی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسٹورنٹ پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر جیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مر جائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوتی ہے۔

موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کر دی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آذر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروا لیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پچھتاتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کریں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔ فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔

کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

بتیسویں قسط

باہر جیسے چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔
تیز بارش کے طوفان میں اس نے دروازہ کھولا اور لمحہ بھر کو بے یقین سی کھڑی رہ گئی۔
اسے یقین نہیں آ رہا تھا، دل کی مرادیں ایسے بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے سامنے زینب کھڑی تھی۔
زینب کے پیچھے موحد تھا۔
''یار! سامنے سے تو ہٹو، اتنی تیز بارش ہے۔ اب کیا پورا بھیگیں گے تو اندر آنے دو گی۔'' موحد نے اونچی آواز میں چلا کر کہا تو اسے ہوش آیا۔
وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے فوراً ہی زینب کے گلے سے لگ گئی۔
زینب کو اس سے اتنے بے ساختہ رویے کی توقع نہیں تھی۔
وہ بھی سب کچھ بھول کر اسے گلے سے لپٹائے پاگلوں کی طرح چومتی جا رہی تھی۔ کسی اچانک خوشی کی طرح دونوں جذبات سے مغلوب تھیں۔
''کشف! ابھی یہ مکمل فٹ نہیں، اللہ کے لیے رحم کروان پر۔ اندر تو لے جاؤ انہیں۔''
موحد نے زبردستی دونوں کو اندر کی طرف دھکیلا۔
اسی دم لائٹ چلی گئی۔
ان پہاڑوں میں لائٹ کا اس طرح جانا معمول تھا، یہاں لائٹ آتی کم تھی، جاتی زیادہ تھی۔
وہ دونوں اندر آ کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔
کشف پھر سے زینب سے لپٹ گئی۔ اب وہ بھی بے آواز آنسوؤں سے اداس تھی، زینب اس نے آنسو پونچھتے خود بھی رونے لگی۔
''کشف! آئی کو خشک کپڑے دو اور پلیز مجھے کوئی ٹاول دو، سارا بھیگ گیا ہوں میں بھی۔'' موحد کی دہائی پر کشف کو بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔
وہ موحد کو تولیہ اور کپڑے دے کر پھر زینب کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
''مجھے آنے کا بتایا کیوں نہیں؟'' وہ شکوہ کرتے ہوئے بولی۔
''مجھے جب موحد نے کال کر کے بتایا کہ میری کشف مجھے یاد کر رہی ہے، یقین مانو، میں نے گھر سے نکلنے میں ذرا دیر نہیں کی۔ جو کپڑے ہاتھ لگے، رکھے اور آ گئی۔'' زینب خوشی خوشی بتا رہی تھی۔
''آپ نے مجھے معاف کر دیا؟'' ذرا دیر بعد اسے خیال آیا تو کچھ شرمندہ سی بولی۔
''لو، میں بھلا تم سے ناراض کب تھی اور اتنی پیاری بیٹی سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے بھلا۔'' وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر محبت سے بولی۔
''آپ واقعی مجھ سے ناراض نہیں تھیں؟'' کشف بے یقین سی تھی۔
''نہیں ناں، میں ناراض نہیں تھی۔ بالکل بھی۔ بس شرمندہ اور نادم تھی کہ میں نے بہت پہلے تمہیں خود سے حقیقت کیوں نہیں بتائی، بتا دیتی تو تمہیں شاید اتنی تکلیف سے گزرنا ہی نہیں پڑتا۔''
زینب نے سارا الزام جیسے خود پر لے لیا۔
''آئی! آپ کا دل کتنا بڑا ہے۔'' وہ پھر سے زینب سے لپٹ گئی۔
''بڑا دل ایک خوف ناک بیماری کی نشانی ہوتا ہے۔'' موحد تولیے سے سر رگڑتے ہوئے آ کر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔
''آپ کو تو دن رات بس بیماریوں کا ہی خیال آتا ہے، ڈاکٹر سے شادی بھی نہ ہو کسی کی۔'' وہ رخ پھیرتے

ہوئے ذرا شوخی سے بولی۔ تو زینب نے حیرت بھری خوشی سے اسے دیکھا۔
کشف کتنی بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔
خوش، مطمئن اور بہت زندگی سے بھرپور.....
''وہ زندگی جو شاید میں اتنے سالوں میں اسے نہیں دے سکی۔'' اس نے دل میں سوچا۔
''انھیں ناں، آنی! میں نے آپ کے کپڑے نکال دیے ہیں اور ڈارک بلیو اپنا لانگ سوئٹر تو لے آتیں، وہ یہاں خوب کام آتا۔ یہاں کتنی ٹھنڈ ہے۔ آپ کو بہت جلد اندازہ ہو جائے گا اور یہ آپ کے سارے کپڑے کاٹن واٹن کے بے کار ہیں بچی۔'' اسے ایک گرم سوٹ نکال کر دیتے ہوئے کشف اس کے سوٹ کیس کا جائزہ لیتے ہوئے افسوس سے بولی۔
''اور صرف چار سوٹ..... آپ کیا واپسی خیال سے آئی ہیں، ہرگز نہیں۔ میں آپ کو واپس نہیں جانے دوں گی۔ میرے پاس ہی رہیں گی۔ آپ یہاں جب تک ہم یہاں ہیں۔'' وہ زینب کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کسی ضدی بچے کی طرح کہہ رہی تھی۔
زینب موحد کی طرف دیکھ کر کھل کر مسکرائی جو خود بھی مسکرا رہا تھا۔
''یار وہ اتنا لمبا ٹریول کر کے آئی ہیں، کچھ تو خیال کرو۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ آنی کو چینج کروا کے تم انھیں کھانے کے لیے کچھ دو، میں فرزند علی سے کہتا ہوں۔ وہ آ کر آتش دان میں آگ جلا دے، یہاں تو ہر چیز برف کی مانند ہو رہی ہے۔'' موحد گیلے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بھی سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔
کشف نے موم بتی جلا کر زینب کو کپڑے دے کر واش روم میں بھیجا۔
موحد خاموشی سے لالٹین جلانے لگا۔
''آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ آنی آ رہی ہیں۔'' وہ جلدی جلدی کمرے میں بکھرا سامان سمیٹتے ہوئے شکایتاً بولی۔
''تو پھر سرپرائز کا مزا کیا آتا۔ یوں بھی میں کچھ فعفی فعفی ہو رہا تھا۔''
وہ لالٹین اونچی کارنس پر سیٹ کرتے ہوئے بولا۔
''کیا مطلب فعفی فعفی۔''
''یار! تمہارا پتا نہیں چلتا ناں، تم کب ناراض ہو اور کب خوش۔ مجھے اندازہ نہیں تھا تمہارے ری ایکشن کا جو تم آنی کے آنے پر دکھاتیں۔''
وہ لالٹین کی پیلی روشنی میں اس کا سنہرا چہرہ دمک رہا تھا۔ رخساروں پر پڑتے لمبی پلکوں کے عکس کو موحد دیکھتا رہ گیا۔
کشف کچھ بولنے لگی پھر منہ بند کر لیا اور رخ پھیر لیا۔
''کیا ہوا، ناراض ہو گئیں؟'' موحد نے اسے کندھوں سے پکڑ کر ہولے سے اپنی طرف موڑا۔
تو جیسے اس کے پورے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا۔
وہ اس لمس کی عادی تھی نہ توقع کر رہی تھی۔
''پلیز۔'' وہ کسمسا کر اس کی قربت سے دور ہوئی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔
موحد بے حرکت گم صم سا کھڑا رہ گیا۔
کشف کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا، وہ ابھی تک اس رشتے کو اس کے تمام تر لوازمات کے ساتھ قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

دونوں میں اتنے دنوں کی بظاہر قربت کے باوجود صدیوں کی دوری تھی، دونوں ہی اس دوری میں خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔

کوئی بھی اس خود ساختہ دائرے کو توڑنے کے لیے پہل نہیں کر رہا تھا۔ موحد نے اگر دو ایک بار ایسی کوشش کی بھی تو کشف کے سرد ری ایکشن پر وہ خواہ مخواہ شرمندہ سا ہو گیا۔

شاید وہ ابھی مزید وقت لینا چاہ رہی تھی، موحد کو اس مقام پر تسلیم کرنے کے لیے جوان کے رشتے نے موحد کو دیا تھا۔

وہ گہرا سانس لے کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔

بند کواڑوں کے پیچھے سے بھی دھواں دھار برستی بارش کا شور دل میں اتھل پتھل سے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس شور کو سن رہا تھا۔

☆☆☆

بلال گم صم سا بڑے سے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

وہ یہاں کیوں آیا تھا، اسے خود بھی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

آفس سے چھٹی کے بعد گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کا والٹ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا تو اس میں سے وہ کارڈ بھی نیچے گر گیا جو حیدر نے اسے دیا تھا۔

''ثمینہ یہاں اپنی دوست کے ساتھ رہ رہی ہے۔''

ایڈریس زیادہ دور کا نہیں تھا۔

جانے کیسے اس کی گاڑی کا رخ اسی طرف ہو گیا۔

اب وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ثمینہ کا انتظار کر رہا تھا۔

دو ایک بار تو اس کا جی چاہا، یہاں سے اٹھ کر دور بھاگ جائے واپس چلا جائے۔ مگر اس کا وجود جیسے اٹھنے سے انکاری ہو گیا۔

''مجھے امید تو نہیں تھی تم آؤ گے، مجھے لگا، تمہارے اس زہریلے باپ نے تمہارے دل میں میرے خلاف زہر بھر دیا ہو گا۔''

ثمینہ کھلے بالوں کے ساتھ بغیر دوپٹے کے ماڈرن طرز کا سلیولیس لباس پہنے، اس کے سامنے طمطراق سے کھڑی تھی۔

بلال نے سلام کیا جو شاید اس نے سنا نہیں۔

اس کے بلیک ڈریس کا ڈیپ گلا اور باریک کپڑوں سے جھلکتا جسم بلال کو بے اختیار نظریں جھکانے پر مجبور کر گیا۔

''اور واقعی اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

وہ دل میں بہت پچھتایا۔

''کیا لو گے ٹھنڈا یا گرم..... آفس سے آئے ہو، چائے بنواؤں۔'' وہ بالکل اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں، میں آفس سے چائے پی کر نکلا تھا۔'' وہ نظریں ہنوز اپنے بوٹوں پر جما کر بولا۔

''میں اتنے سال وہاں اس کھڑوس شخص کے ساتھ گزارا کرتی رہی، اپنی پوری زندگی تباہ کر دی۔ بدلے میں مجھے کیا ملا۔''

وہ آج بھی اسی لہجے، اسی دبدبے کے ساتھ بات کر رہی تھی۔

اس نے اس کے علاج میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی، مہنگی حاضر، حری حاضر میں اتنے سال نباہ کرتی رہی مگر اس زینب کا جادو کسی دن تو سر چڑھ کر بولنا تھا۔ مجھے یقین تھا۔'' وہ ماں کے منہ سے انگارے ہر اپنی سماعتوں میں انڈیل رہا تھا۔

''آنی کا اس میں کیا ذکر؟'' وہ بمشکل کوفت سے بولا۔

''تم میرے سامنے اس عورت کی حمایت نہیں کر سکتے، جس نے ان چھبیس سالوں میں مجھے ایک دن بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔'' وہ تیز لہجے میں پھنکاری۔

''اب تو آپ سکون میں ہیں، اب تو آپ کو ان باتوں سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔'' جانے کیسے اس کے لبوں سے پھسلا۔

''فرق پڑتا ہے، میری جوتی کو۔'' وہ حقارت سے بولی۔ ''اور میں اس زینب کو اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ اس کا ذکر بھی کروں۔'' عجیب گھمنڈ بول رہا تھا ان کے ہر ہر انداز میں۔

''آپ کینیڈا جانے والی ہیں؟'' بلال کے منہ سے اچانک نکلا۔

''یہ زہر بھی تمہارے باپ کا گھولا ہوا ہے، مجھے اس عمر میں طلاق کا داغ دیتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی۔ جوان بیٹے کی ماں اس نے کسی بات کا کوئی خیال نہیں کیا۔'' وہ چہرے پر مظلومیت لاتے ہوئے بولی، جس کا ساتھ اس کے چہرے نے نہیں دیا۔

''یہ ہوائی بھی اس نے چھوڑی تھی کہ میں خود کینیڈا جانا چاہ رہی ہوں، جب کہ میرے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی۔ یہ خود اس کی گھڑی ہوئی کہانی ہے۔''

وہ شاید بلال کے دل کو اپنی طرف سے صاف کرنا چاہ رہی تھی۔ جبکہ اس کی ضرورت تھی نہ بلال کی خواہش۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں چلتا ہوں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''کیا اتنی سی دیر کے لیے آئے تھے تم مجھ سے ملنے۔ پھر آؤ گے؟'' وہ کچھ حیران سی ہو کر بولی۔

''پتا نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

اسے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ اب وہ پھر کبھی ثمینہ سے ملے گا یا کبھی اس سے ملنے کی خواہش بھی رکھے گا۔

''کچھ دیر تو رکتے۔'' جانے کیسے وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

وہ جواب میں کچھ بول ہی نہیں سکا۔

وہ اسے دروازے تک رخصت کرنے آئی۔

بلال نے جاتے ہوئے مڑ کر آخری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر ایک بار بھی نگاہ اس طرف پھیرے بغیر گاڑی کو ناک کی سیدھ میں لے گیا۔

وہ جو اتنے دنوں سے عجیب سا ملال اسے رات کو سوتے میں اٹھا دیتا کہ کچھ بھی سہی، وہ عورت اس کی ماں تھی۔ حیدر کو یوں اس کو ایک دم سے اپنی زندگی سے، اس گھر سے نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ جانے وہ کتنے گہرے صدمے میں ہو اور کس طرح بلال کو یاد کر رہی ہو، یہی خیال اکثر اسے دن میں بھی بے چین رکھتا۔

وہ اکثر حیدر سے یہ پوچھتے پوچھتے رہ جاتا، جو خود بھی ثمینہ کے جانے کے بعد بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

زینب کے جانے کے بعد جب حیدر صالحہ کو گھر لے کر آیا تو اسے دادی سے بھی عجیب ناراضی محسوس ہوئی کہ میری ماں کے جاتے ہی بابا کیسے اپنی ماں کو لے کر آئے۔ وہ اسی خفگی میں آج ثمینہ سے ملنے چلا آیا اور یہاں

آ کر اسے پچھتانا پڑا کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

ان کی پیکنگ تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔

زریں اپنی دوستوں کے لیے کچھ تحفے خریدنا چاہتی تھی۔

ایما کا اس کے ساتھ جانے کا بالکل دل نہیں تھا۔ زریں کے مجبور کرنے پر وہ اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے آ گئی۔

دو گھنٹے میں بمشکل زریں کی شاپنگ مکمل ہوئی۔

''ماما! بھوک لگ رہی ہے، کچھ کھالیں۔ فوڈ کورٹ میں۔'' ایما جو بے زار سی تھی، کچھ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

''ہاں چلو، چلتے ہیں۔ مجھے بھی پیاس لگ رہی ہے۔'' دونوں بھاری شاپنگ بیگز اٹھائے فوڈ کورٹ میں آ گئیں۔

گہری شام رات میں ڈھل چکی تھی۔

''ایما! یوں کرو، اب ایک ہی بار ڈنر کر لیتے ہیں۔ رات تو ہو ہی رہی ہے۔'' زریں نے کہتے ہوئے دونوں کے لیے کھانا آرڈر کیا۔

کھانا آتے کھاتے انہیں کافی وقت لگ گیا۔

باہر نکل کر دونوں کسی کیب کے لیے دیکھنے لگیں۔

ایما پارکنگ سے نکل کر ایک کیب والے سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھی، جب پاس سے گزرتے دو بائیک والوں میں سے ایک نے اس کا بیگ چھینا۔ ایما اس پر جھپٹی تو اس نے کوئی بھاری چیز ایما کے سر پر ماری، جس پر اس کی چیخوں پر پیچھے آتی زریں کے ہاتھ سے سارے بیگز گر گئے۔

☆☆☆

آزر اپنے سامنے آفس میں منصور کو دیکھ کر لمحہ بھر کو چونکا۔

دوسرے پل اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔

اس نے محض ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

اس کے برعکس منصور نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا، جسے آزر کو بے دلی سے تھامنا پڑا۔

''واپسی ہے ہماری کل شام کی۔'' منصور نے بیٹھتے ہوئے کچھ جتانے والے انداز میں کہا۔

''ہوں۔'' آزر کا انداز سرسری تھا۔

کمرے میں کچھ لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

''چائے یا کافی؟'' خاموشی توڑتے ہوئے آزر نے پوچھا۔

''چائے۔'' منصور شاید بیٹھنے کے لیے آیا تھا۔

آزر نے انٹر کام پر چائے کا کہہ دیا۔

منصور بات شروع کرنے کے لیے الفاظ سوچنے لگا۔

''لگتا ہے آج کل آفس میں کام زیادہ ہے جو تم رات گئے تک آفس میں ہی رہتے ہو۔'' منصور کا لہجہ جتانے والا تھا۔

''ایسا ہی ہے۔'' آزر کندھے اچکا کر بولا۔

"میں کیوں فرار ہوں گا اپنے گھر یا فیملی سے؟" وہ ابرو اچکا کر بولا۔
"تم نے سونیا کی حالت دیکھی ہے۔" منصور کچھ دیر بعد بولا۔
جواب میں آزر نے محض ہونٹ سکوڑے۔
"وہ پہلے ہی ردا کے غم سے گزر رہی ہے۔" منصور نے پھر کہا۔
"کیا یہ اس کا واحد غم ہے، ہم سب کے لیے یہ صدمہ ویسا ہی جان لیوا ہے، جیسے اس کے لیے۔" آزر نے طنز سے کہا۔
"وہ ماں ہے۔" منصور زور دے کر بولا۔
"ہونہہ۔" آزر ہنکارا بھر کر رہ گیا۔
منصور چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا پھر آگے ہو کر بیٹھ گیا۔
"آزر! میرے بھائی! ہم سب انسان ہیں۔ بہت کمزور، نادان انسان..... اور غلطی کس سے نہیں ہوتی، ہم سب سے ہوتی ہے۔" وہ رک رک کر بولا۔
"پلیز....." آزر نے ناگواری سے اسے بات کرنے سے منع کیا۔
"نہیں آزر! بات تو اس پر کرنی ہوگی۔ آج نہیں تو کل۔ مجھ سے سونیا کی حالت نہیں دیکھی جاتی۔" وہ رنج سے بولا۔
"بہن ہے تمہاری۔ تم سے اس کا درد نہیں دیکھا جاتا تو یوں کیوں نہیں کرتے۔ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ بہنوں کا بھی حق تو ہوتا ہے بھائیوں پر۔" آزر نے طنز سے مشورہ دیا۔
منصور اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"میں اسے یقیناً لے جاؤں اپنے ساتھ مگر میں جانتا ہوں، وہ میرے ساتھ نہیں جائے گی۔ کبھی بھی اپنا گھر چھوڑ کر اور خاص طور پر تمہیں چھوڑ کر۔" منصور نے اس پر نظریں جما کر احساس دلانے والے انداز میں کہا۔
"ایسا کوئی سین نہیں ہے، میں اس کی فطرت کو اچھی طرح سے سمجھ چکا ہوں۔" آزر کے لہجے میں نخوت تھی۔
"محبت کی ہے اس نے تم سے۔ اپنے بچوں سے، اپنے گھر سے۔" وہ زور دے کر بولا۔
"تم دونوں بہن بھائی کتنی دوہری شخصیت کے مالک ہو۔" وہ اسی طنز سے بولا۔ منصور اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گیا۔
"کیا تمہیں اچھا لگے گا، اس عمر میں تمہارا گھر ٹوٹے۔ تم دونوں کا ساتھ چھوٹے۔ ابھی رمشا ہے، حمزہ ہے۔" منصور نے پھر کہا۔
"پلیز، میرے بچوں کی کسی کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے بچوں کا خود بخوبی خیال رکھ سکتا ہوں۔" وہ اجنبی پن سے بولا۔
"سونیا بھی اپنے بچوں کو نہیں چھوڑنا چاہتی، پلیز تم کوئی درمیان کا رستہ نکالو۔ اسے تمہاری ضرورت ہے، اس وقت اس سے جو غلطی ہوئی۔ وہ نادانی کی عمر تھی اور....." منصور نے نرمی سے کہنا چاہا۔
"پلیز مجھے یہ سب سننے سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اس پر سوچنے سے اور بھی زیادہ۔" آزر ایک دم سے کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"تو پھر تم کیوں چاہتے ہو، یہ تکلیف باقی کی عمر کے لیے تمہارے اور سونیا کے حصے میں آجائے۔ آزر!

اپنے لیے اور بچوں کے لیے، اپنے گھر کی سلامتی کے لیے سونیا کو معاف کردو۔ وہ بہت دکھی ہے۔ اس کا دل بہت کمزور ہو چکا ہے۔ تمہاری بے اعتنائی وہ سہہ نہیں پائے گی، پلیز۔'' آزر لب بھینچے بس اسے تکے جا رہا تھا، بولا کچھ نہیں۔

☆☆☆

''ارے کشف! تم تو بہت اچھا کھانا بنانے لگی ہو۔'' زینب نے آلو گوشت کا پہلا نوالہ لیتے ہی کہا۔

''یہ کھانا گل نے بنایا ہوگا، ہے نا کشف؟'' موحد نے اسے چھیڑا۔

''جبکہ آپ کو معلوم ہے، گل دو دن سے چھٹی پر ہے۔ اس کے بھائی کی شادی ہے پھر بھی۔'' کشف تیز لہجے میں بولتی ایک دم سے آنکھوں میں آنسو لے آئی۔

اس کے آنسو دیکھ کر موحد کو لمحہ بھر کو شرمندگی سی ہوئی۔

''کشف! میری جان! موحد یوں ہی کہہ رہا ہے۔ تم دکھی کیوں ہو رہی ہو۔'' زینب نے اسے پیار سے اپنے ساتھ لگایا۔

''آنی! نہیں میرا کوئی بھی کام اچھا نہیں لگتا۔ ہر بات میں مجھے ٹوکتے ہیں۔ جیسے میں بالکل کوئی اجڈ یا گنوار ہوں۔'' وہ باقاعدہ زینب سے لگ کر رونے لگی۔

''ارے رے کشف! خدا کا خوف کھاؤ۔ میرے منہ پر جھوٹ بول رہی ہو۔ یار! تم نے اس دن جو پالک گوشت بنایا تھا جس میں پالک کے پتے شوربے میں تیر رہے تھے، اور گوشت ربڑ کی طرح کھنچ رہا تھا۔ میں خاموشی سے کھا گیا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا تم سے۔ یاد ہے ناں؟'' اس نے جلدی جلدی اپنی طرف سے اسے منانے کی کوشش کی۔

''دیکھا، دیکھا آنی! میں نے اس دن اتنی محنت سے پالک گوشت بنایا تھا۔ صرف گوشت تھوڑا گلا نہیں تھا، انہیں وہ بھی پسند نہیں آیا تھا۔'' وہ آنکھیں صاف کر کے بچوں کی طرح بولی۔

''موحد بھئی، یہ کیا میں تمہاری شکایتیں سن رہی ہوں اپنی بیٹی سے۔'' زینب نے موحد کو گھرکا۔

اس نے بے اختیار ہاتھ جوڑ دیے۔

''آپ کو لگتا ہے آنی! میں ان محترمہ کو کچھ ایسا ویسا کہہ سکتا ہوں یا یہ مجھے ایسا کچھ کہنے بھی دیں گی۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

زینب مسکرا کر رہ گئی۔

اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس طرح کے تو وہ خواب دیکھا کرتی تھی، جب حیدر اسے بس میں بٹھانے آیا۔ موحد کو اس کے سامنے کال کرائی۔ سارے سفر کے دوران یہ سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوتی رہی کہ پتا نہیں کشف اس سے بات بھی کرے گی یا نہیں۔ اگر اس نے بات نہیں کی تو وہ یہ غم شاید ہی سہار سکے۔

اور یہاں جس طرح کشف اس سے ٹوٹ کر ملی تھی، وہ اس وقت سے چپکے چپکے کتنی بار اپنی آنکھیں صاف کر چکی تھی۔

موحد کا فون آ رہا تھا مگر سگنلز بار بار کٹ رہے تھے۔

''آنی! حیدر انکل کا فون ہے، شاید وہ آپ کے خیریت سے پہنچنے کے بارے میں فکر مند ہوں گے۔ میں نے میسج کر دیا ہے، ابھی گیا نہیں۔ موسم بہتر ہوتا ہے تو یہاں فون کے سگنلز بھی بہتر ہو جاتے ہیں۔''

کشف اب کھانے کے برتن اٹھا رہی تھی، موحد فون میں مصروف تھا۔

زینب نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اپنا فون نکالا۔

اس کے فون پر بھی حیدر کی مسڈ کالز تھیں۔
"آنی! آپ قہوہ پئیں گی، یہ ڈاکٹر صاحب لازمی پیتے ہیں اس وقت۔" کشف اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
"تم بیٹھ جاؤ۔ میں بنالوں گی۔" زینب اس کی طرف پیار سے دیکھ کر بولی۔
"خدا کے لیے، آنی کو آتے ہی کام سے نہیں لگا دینا۔" موحد باہر جاتے ہوئے پھر اسے چھیڑ کر بولا۔
"کشف! میں خوش ہوں کہ تم نے جذباتی پن میں جو اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا، میرے رب نے اس کی لاج رکھ لی۔ موحد واقعی وہ شخص ہے جسے تمہارا جیون ساتھی ہونا چاہیے تھا۔" زینب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔
"تم خوش ہو ناں کشف؟" وہ اس کی خاموشی پر بولی۔
"پتا نہیں آنی! لیکن یہ جگہ اتنی خوب صورت ہے کہ مجھے اب کچھ بھی یاد نہیں رہتا، نہ اپنی محرومیاں، نہ وہ سارے جھگڑے جو میں نے آپ سے اپنے باپ کے لیے کیے اور نہ لوگوں کے بدصورت رویے۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔
"لیکن تم نے میرے سوال کا جواب ابھی بھی نہیں دیا۔"
"تم خوش ہو ناں موحد کے ساتھ۔" وہ اس کو دیکھ کر بولی۔
"آپ کو کیا لگتا ہے آنی؟" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔
"مجھے لگتا ہے، تم سے زیادہ موحد بہت خوش ہے۔ وہ بار بار کسی بھی بہانے تم سے مخاطب ہونا چاہتا ہے۔"
وہ بے اختیار ہنس پڑی۔
"آپ نے ٹھیک کہا آنی! موحد بہت خوش ہیں اور میں ان کی خوشی میں خوش ہوں اور آنی! جس طرح موحد یہاں آ کر کام کر رہے ہیں، لوگوں کی مدد کر رہے ہیں، اتنی اپنائیت سے سب لوگوں کا علاج کرتے ہیں، ان سے اتنے مہربان انداز میں پیش آتے ہیں شاید میں بھی ان کی جگہ ہوتی تو الجھن محسوس کرتی مگر آنی! آپ نے ٹھیک کہا۔ موحد ہی وہ شخص ہیں جنہیں میرا ہم سفر ہونا چاہیے تھا۔ میں واقعی خوش قسمت ہوں اس معاملے میں۔"
اور اندر آتے موحد کے قدم وہیں ٹھٹک گئے۔
اسے لگا جیسے اس کا وجود ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔
"یہ تو اس نے سوچا تھا کہ کشف یہاں آ کر کافی بدل گئی ہے، مگر اس حد تک بدل چکی ہے اس کی محبت، اس کو اپنی خوش قسمتی لگنے لگی ہے اسے۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔
وہ آہستہ سے مڑ کر بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
باہر بارش رک چکی تھی مگر تیز کٹیلی ہوائیں سارے وجود کو کاٹ کر گزر رہی تھیں۔
مگر موحد کو کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔
اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ باہر سڑک پر چلا جائے اور جی بھر کر اچھلے، کودے۔ اس یقین نہ آنے والی خوشی کا خوب جشن منائے۔
"ارے، آپ یہاں اتنی ٹھنڈ میں کیوں کھڑے ہیں؟" وہ پیچھے سے بالکل اچانک آئی تھی۔
اس کے پہلو میں اس کی محبت کھڑی تھی۔
اس لمحے سے پہلے تک وہ کسی بھی بات کے لیے پُر یقین نہیں تھا مگر اب اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ

کشف کی محبت پر یقین آچکا تھا۔
''موحد! بیمار پڑ جائیں گے۔ اتنی سرد ہوا ہے، اندر چلیں۔''
''بیمار پڑ گئے تو کیا، تمہارا ساتھ ہے تو بیماری کا کیا خوف۔'' اس نے کہتے ہوئے بے ساختہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

رمشا سلیمان کے ساتھ اسلام آباد سے واپس آ گئی تھی۔
آتے ہی وہ سونیا کے گلے سے لگ گئی۔ سونیا نے بھی پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
وہ بہت خوش تھی۔ سلیمان گاڑی سے اس کا سامان نکال کر لا رہا تھا۔ سونیا نے سلیمان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے خوش اخلاقی سے اس کا حال پوچھا تھا۔
''رمشا! میری جان! تم ٹھیک ہو ناں۔'' اس نے رمشا کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پیار سے پوچھا اور اپنا سوال پوچھ کر جیسے وہ خود شرمندہ سی ہو گئی۔
رمشا کے چہرے پر سرخ گلابی مہتابیاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے تارے کوٹ کر بھر دیے تھے۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔
رمشا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
''ماما! میں بہت خوش ہوں۔ بہت زیادہ۔'' وہ اس کے گلے سے لٹک کر کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔
سونیا حیرت زدہ سی رہ گئی۔
اس نے پھر رمشا کو سیدھا کر کے دیکھا، کہیں وہ سونیا کو خوش کرنے کے لیے ایکٹنگ تو نہیں کر رہی مگر اس کا چہرہ تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ جس پر سونیا کو یقین کرتے ہی بنی۔

☆☆☆

حمزہ اس وقت مال سے اپنی شاپنگ کر کے نکلا تھا، جب وہ اسنیچرز ایما سے اس کا بیگ چھین کر بھاگے تھے۔
حمزہ نے بھاگ کر گری ہوئی ایما کو سیدھا کیا۔
اس کے سر سے بہتا خون اس کے چہرے کو تر کر چکا تھا۔
مال کی جلتی بجھتی تیز روشنیوں میں وہ اسے پہچان گیا۔
''ایما..... کیا ہوا؟'' وہ بھونچکا سا تھا۔
وہ اسے جواب دینے سے پہلے بے ہوش ہو چکی تھی۔
زریں ہانپتی کانپتی اس تک پہنچی۔
''ایما..... ایما..... مائی ڈارلنگ! تم ٹھیک ہو ناں۔ میری جان!'' وہ چیختی اس پر گری تھی۔
''آنٹی پلیز، آپ ہٹ جائیں۔ یہ بے ہوش ہو چکی ہے۔''
لوگ ان کے گرد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔
حمزہ نے اسے اپنی بانہوں نے میں اٹھا کر گاڑی کا آٹو میٹک لاک کھولتے ہوئے پچھلی سیٹ پر ڈالا۔
زریں نے مڑ کر شاپنگ کے گرے ہوئے سارے تھیلے اٹھائے۔
''آپ آنٹی! ایما کے پاس بیٹھیں، کہیں یہ گر نہ جائے۔ یہ بے ہوش ہے۔'' حمزہ نے عجلت میں کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے تیزی سے گاڑی پارکنگ سے نکالی اور اڑاتا ہوا ہاسپٹل کی طرف لے گیا۔

☆☆☆

اسے رات بھر بہت عجیب خواب آتے رہے تھے۔

کبھی وہ اور بلال آؤٹنگ پر نکلے ہیں، بہت خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی بلال کے ساتھ موحد بھی آجاتا، اپنے خراب موڈ کے ساتھ۔

کبھی وہ اکیلی کسی بس میں بیٹھی ہے اور بس پہاڑوں میں اندر ہی اندر جا رہی ہے۔ وہ اس خواب کی وحشت سے گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

علاقے کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس نے گردن موڑ کر دوسرے پلنگ پر سوئی زینب کو دیکھا۔

اس کا بستر خالی تھا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی، شاید وہ وضو کرنے گئی تھی۔

کشف آہستہ سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آئی جہاں موحد گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے رات کی بات یاد آ گئی، جب موحد نے اسے اپنی بانہوں میں لیا تھا۔

وہ سوچ کر جھینپ کر رہ گئی اور مڑ کر اپنے بستر پر آ گئی۔

''تم اتنی جلدی اٹھ گئیں۔'' زینب وضو کر کے آئی تھی، اسے یوں بیٹھے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''بہت ڈراؤنا خواب دیکھا تھا آنی! تو آنکھ کھل گئی۔'' وہ ٹہنیل کی رضائی ٹانگوں کے گرد لپیٹتے ہوئے بولی۔ کمرا یخ بستہ سرد ہو رہا تھا۔

''نیند میں ڈرنے والی عادت ابھی تک گئی نہیں تمہاری۔''

''آنی! جائے نماز الماری میں ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں نماز پڑھوں گی۔ پہلے آپ پڑھ لیں۔'' وہ کسل مندی سے کہتی نیم دراز ہو گئی۔

☆☆☆

ایما کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اور ٹانکے لگے تھے۔

ہوش میں آنے پر بھی وہ کافی خوف زدہ سی تھی۔

زریں بھی سہمی ہوئی تھی۔ وہ منصور کو کال کرنے لگی۔

''آنٹی! ڈاکٹر نے کہا ہے، آپ گھر لے جائیں انہیں۔ کل دوبارہ بینڈیج ہوگی۔ میڈیسن لکھ دی ہے انہوں نے تو میرے خیال میں ماموں کو یہاں بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حمزہ دواؤں کا نسخہ ہاتھ میں لیے اس کے پاس آ کر بولا۔

''ہاسپٹل میں نہیں رکھیں گے مزید۔'' زریں کچھ پریشان سی ہو گئی۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے ضرورت نہیں ہے مزید یہاں رکھنے کی۔ ایما کی حالت اب کافی بہتر ہے۔'' وہ بیڈ پر لیٹی ایما کی طرف دیکھ کر بولا جو آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''جی ماما! مجھے گھر جانا ہے۔ یہاں مزید نہیں رکنا۔ مجھے یہاں رکنے سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' وہ سن کر فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

''ایما! ابھی اٹھو نہیں اور یہ جوس پی لو پہلے۔ کچھ انرجی آئے تم میں، میں اتنی دیر میں ڈسچارج سلپ لے کر آتا ہوں، پھر گھر چلتے ہیں۔'' وہ اسے جوس دے کر باہر نکل گیا۔

''میں تو سوچتی ہوں اگر حمزہ اس وقت فرشتہ بن کر نہیں آتا تو ہمیں کتنی پریشانی ہوتی۔'' زریں، حمزہ کے جانے کے بعد بولی۔ ایما خاموشی سے جوس پینے لگی۔

گئی۔

''مام! ابھی مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔'' وہ اپنی کنپٹی دبا کر بولی۔

''او کے، او کے۔ تم اسٹریس نہیں لو، کچھ ہوگا بھی تو تمہاری جان کا صدقہ گیا۔ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔'' زریں سر ہلا کر اس کی طرف دیکھ کر تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

☆☆☆

''مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا بابا!'' بلال نے چائے کا مگ حیدر کی میز پر لا کر رکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

حیدر نے چونک کر اس کو دیکھا اور یوں ہی سر ہلا دیا۔

''وہ ماں ہے تمہاری، کچھ بھی کہو تم۔'' وہ کچھ دیر بعد عینک اتار کر ہاتھ میں پکڑی فائل رکھتے ہوئے بولے۔

''ماں..... کاش نہ ہوتی۔'' وہ تلخی سے بڑبڑایا۔

حیدر اس کو دیکھ کر رہ گیا۔

''اماں سو گئی ہیں کیا؟'' وہ ذرا دیر بعد شاید موضوع بدلنے کو بولا۔

''جی سو گئی ہیں۔ آپ کیوں نہیں سوئے؟'' وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''یہ ایک رپورٹ تیار کرنی تھی، ساری رات اس میں نکل گئی۔'' حیدر نے فائل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''آنی چلی گئیں کشف کے پاس۔'' وہ کچھ دیر بعد توقف کر کے بولا۔

''ہوں، یہ اچھا ہوگا اس کی صحت کے لیے بھی۔ یوں بھی کشف کے جانے کا غم اس نے جی کو لگا رکھا تھا۔'' حیدر نے رک کر کہا۔

''اور اگر کشف وہاں جا کر ان کے ساتھ ٹھیک نہیں ہوئی، آئی مین اس نے آنی کے ساتھ پھر بدتمیزی کی۔''

''نہیں، میرے خیال میں کشف بھی زینب کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ موحد نے کشف کی نیم رضامندی دیکھ کر ہی زینب کو وہاں بلایا ہے۔''

بلال نے بے ساختہ ہونٹ بھینچ لیے۔

حیدر چائے پیتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

''بلال! بہتر ہے تم بھی اب اپنی زندگی کے بارے میں سوچو۔'' وہ کچھ دیر بعد بولے۔

''مجھے کیا سوچنا ہے بابا! میں خوش ہوں۔'' وہ پھیکے پن سے بولا۔

''سنو، میرے دوست ہیں اظفر بھائی، ان کی بیٹی سدرہ نے اس سال ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے۔ اظفر بھائی نے مجھے اس کے لیے کسی رشتے کے لیے کہا ہے اور یقین جانو، میرے دل میں پہلا خیال تمہارا ہی آیا تھا۔ ملے ہو ناں تم سدرہ سے، بہت پیاری، محبت کرنے والی، خوش اخلاق بچی ہے۔ پھر ثمرہ بھابھی نے اس کی تربیت بہت اچھے انداز میں کی ہے۔ کیا کہتے ہو تم۔''

''میں کیا کہوں، ابھی میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔''

''نہیں سوچا، تو اب سوچ لو۔ شادی تو بہر حال کرنی ہے ناں۔ اماں گھر میں اکیلی ہوتی ہیں، انہیں بھی کسی کا ساتھ چاہیے۔''

وہ اسے احساس دلانے کو بولے، وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"ہنسے کیوں؟" وہ کوفت سے بولے۔
"اب کیا اماں کے لیے میں شادی کرلوں۔ عجیب بات کی آپ نے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"بلال میں نے جو کہا ہے، وہ مذاق نہیں ہے۔ آئی ایم سیریس یار۔" وہ زور دیتے ہوئے بولے۔
"بابا! مجھے کچھ وقت تو دیں سوچنے کے لیے۔" وہ کچھ جھلا کر بولا۔
"میں فوراً ہی تو ہاں نہیں کرسکتا۔"
"کیا تمہیں کوئی پسند ہے۔" اچانک ان کے منہ سے پھسلا اور دونوں بے اختیار ایک دوسرے سے نظریں چرا کر رہ گئے۔
"چلو، ٹھیک ہے۔ تم سوچ لو مگر زیادہ وقت نہیں لینا۔ اظفر، سدرہ کے سلسلے میں جلدی چاہ رہا ہے، ایسا نہ ہو اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل جائے۔" حیدر نے تاکیداً کہا۔
"افوہ بابا! آپ تو ایسے جلدی کر رہے ہیں جیسے وہ دنیا میں ایک ہی لڑکی رہ گئی ہے میرے لیے۔ میں دیکھوں گا اور آپ کو بتا دوں گا۔" وہ کہہ کر رکا نہیں، حیدر ٹھنڈی ہوتی چائے پیتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

☆☆☆

آزر بہت رات گئے گھر آیا تھا۔
اس کے چہرے پر تھکن تھی۔
جسمانی تھکن سے زیادہ ذہنی تھکن تھی۔ وہ منصور کے جانے کے بعد اس ایک بات کو سوچ سوچ کر خود کو تھکا تا رہا تھا۔
اور اس کا ہٹ دھرم ضدی دل اس بات پر قطعاً راضی نہیں تھا کہ وہ سونیا کو کسی بھی طرح سے معاف کردے۔
یا اس کی اتنی بڑی خطا درگزر کردے۔
وہ تھکے ہوئے انداز میں بیڈروم میں داخل ہوا اور چونک گیا۔ سونیا صوفے پر یوں بیٹھی تھی، جیسے اس کا انتظار کر رہی ہو۔ کئی دنوں سے اس کے کہنے پر سونیا، ردا کے کمرے میں سو رہی تھی۔
"تو آج پھر یہ..... یہاں؟" آزر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟" وہ اس کے ہاتھ سے بیگ لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔
آزر نے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے بیگ خود ایک طرف رکھ دیا۔
"نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔
"آپ کا انتظار کر رہی تھی، میں کھانے کے لیے۔" وہ کچھ بے بسی سے بولی۔
"میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میرا انتظار کرو؟" وہ درشتی سے بولا۔ وہ بے بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"آزر....." وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔
"مجھے معاف کردیں پلیز، اگر میں معافی کے قابل نہیں ہوں تو بھی اللہ کا واسطہ دیتی ہوں آپ کو۔ اپنی ردا کے صدقے، مجھے معاف کردیں۔" وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
وہ بے تاثر نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''تم جانتی ہو، تمہاری یہ جھوٹی لفاظی اور یہ ڈرامے بازی مجھ پر کچھ اثر کرسکتی ہے تو بے کار میں اپنی انرجی ضائع نہیں کرو۔'' وہ کوٹ ہینگ کرتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''میں جانتی ہوں، آپ کا دل نہ میرے یہ آنسو موم کرسکتے ہیں، نہ میرے جڑے ہاتھ لیکن پھر بھی مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔ میں نے جو کیا غلط کیا اور اس سے بھی زیادہ غلط یہ کیا کہ شادی سے پہلے آپ کو سب کچھ نہیں بتایا۔'' وہ آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میرا یقین کریں، میں آپ کو سب کچھ بتانا چاہ رہی تھی لیکن اماں نے مجھے مرے ہوئے باپ کی قسم دے کر مجبور کردیا کہ میں آپ کو کبھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''تو اب ان باتوں کا کیا فائدہ، جن سے مجھے کوئی مطلب نہیں ہے۔'' وہ اپنے مخصوص روکھے لہجے میں بولا۔

''شاید اپنے بچوں کے لیے، اپنے گھر کے لیے۔ میرے لیے نہ سہی کہ میں نے آپ کی ساری عمر دل و جان سے خدمت کی، آپ کی، اماں جان کی خوشی کی خاطر میں نے کبھی زبان نہیں کھولی۔''

''کیا احسان کیا تم نے یہ سب کرکے۔ بدلے میں تم نے زمانے بھر کی آسائشیں، راحتیں نہیں لیں اور بدلے میں تم نے مجھے کیا دیا۔ زمانہ بھر کی خیانت، جھوٹ، بے وفائی، دھوکا۔'' وہ غصے میں بولا۔

''پاپا! مما نے جو کچھ کیا، جان بوجھ کر نہیں کیا۔ ان سے غلطی ہوگئی اور غلطی کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔ مجھ سے بھی ہوسکتی ہے، اگر ایسی کوئی غلطی میں کروں تو کیا آپ چاہیں گے سلیمان مجھے کبھی معاف نہیں کریں، مجھے گھر سے، زندگی سے نکال دیں۔'' رمشا جانے کس وقت دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔

''پاپا! آپ کی اس ضد اور انا کے ہاتھوں ردا آپی کو اس دنیا سے جانا پڑا۔''

''کیا بکواس کررہی ہو، ردا میری وجہ سے نہیں.....''

''آپ کی وجہ سے وہ مریں۔ گر آپ راضی ہوجاتے اس لڑکے کے لیے تو شاید میری بہن نہیں مرتی۔'' وہ جواباً چلا کر بولی۔

اور آزر کا پہلی بار رمشا کی اتنی اونچی آواز سن کر سر جھک گیا۔

''اگر آپی بھی آپ کی نافرمانی کرکے فرحان کے ساتھ چلی جاتیں تو آپ کیا کرتے۔ انہوں نے آپ کی فرماں برداری کی اور اجر کیا ملا انہیں، پاپا! اگر مما آپ سے ایکسکیوز کررہی ہیں، اپنی غلطی کو مان رہی ہیں تو پلیز انہیں معاف کردیں۔ کیونکہ غلطی تو اللہ بھی معاف کردیتا ہے۔''

''مجھے انسان رہنے دو۔'' وہ منہ میں بڑبڑایا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں آپ اللہ سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ پلیز پاپا! اب ختم کریں اس ضد کو، کہیں آپ کی یہ ضد مما کی جان نہ لے جائے تو پھر میں اور حمزہ اللہ کی قسم! آپ کی شکل بھی نہیں دیکھیں گے۔''

وہ قطعی لہجے میں بولی تو آزر ششدر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس وقت حمزہ زخمی ایما کو سہارا دیتا اندر لا رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے زریں تھی۔ باہر نکلتی سونیا وہیں کھڑی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

باہر موسم بے حد خوش گوار تھا مگر زینب کو بہت سردی لگ رہی تھی۔

اتنا شدید موسم اس کی کمزور صحت سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

کشف نے اسے اپنا گرم کوٹ پہنا کر اور شالیں اوڑھا کر، کھڑکی کے پاس بٹھا کر ہاتھ میں گرم قہوے کا کپ دیا۔

"آنی! میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔" موسم دیکھ کر اس کا دل مچلا جا رہا تھا۔

"کشف! بہت سردی ہے۔ تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔" زینب باہر پہاڑوں کے اوپر پھیلتے بادلوں کو دیکھ کر کچھ کپکپا کر بولی۔

"آنی! نہیں لگتی ٹھنڈ۔ اب تو بہت دن ہو گئے ہیں۔ میں عادی ہو گئی ہوں اس موسم کی۔ پلیز جانے دیں، بس گھنٹے بھر میں آ جاؤں گی۔ آپ کو کچھ چاہیے ہو تو گل ہے کچن میں، اسے آواز دے دیجیے گا۔"

وہ زینب کا جواب سنے بغیر شال اپنے شانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹتی باہر نکل گئی۔

زینب فکرمندی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

ایما کی حالت دیکھ کر سب ہی پریشان ہو گئے۔

منصور اس کو دیکھتے بے چین ہوا جا رہا تھا۔

سونیا نے جلدی سے اس کے لیے یخنی بنوائی۔ زریں وقفے وقفے سے رو رہی تھی۔ حمزہ ایما کو اس کی دوائیں سمجھا رہا تھا۔

وہ نڈھال سی بیڈ سے سر ٹکا کر نیم دراز ہو گئی۔

"حمزہ! تم رہنے دو۔ میڈیسن دینی ہو گی تو میں خود دے دوں گی۔ ابھی تم ایما کو ڈسٹرب نہیں کرو۔" رمشا نے ایما کے چہرے کی پیلی پڑی رنگت کو دیکھ کر کہا، حمزہ سر ہلا کر رہ گیا۔

آزر اس سارے میں بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

پھر وہ جیسے بے زار ہو کر باہر نکل گیا۔

حمزہ اس سے پہلے باہر نکل چکا تھا۔ آزر کے اعصاب بری طرح سے تھکے ہوئے تھے۔ وہ باہر لان کی تازہ ہوا میں نکل آیا۔

حمزہ کچھ فاصلے پر اس کی طرف پشت کیے، فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

"یار! صرف ویزے کی پرابلم ہے ناں، وہ بھی جلد لگ جائیں گے۔ اس کے بعد میں تو یہاں ایک دن بھی نہیں رکوں گا۔ میں گھر کے ماحول سے اتنا فیڈ اپ ہو چکا ہوں مجھے یہاں رہنا ہی نہیں۔"

"نہیں یار! اسٹڈی ویزا پر نہ جا سکے تو فی الحال وزٹ ویزے پر نکل جائیں گے۔ میں ہر طرح سے خود کو تیار کیے ہوئے ہوں۔"

وہ باتیں کرتا باہر کی طرف نکل گیا۔

اور آزر کو لگا جیسے اس کے شان دار گھر کی ساری بلڈنگ اس پر آ گری ہے اور اس کے اردگرد دھماکے سے ہو رہے ہیں۔

اس کی کنپٹیاں دکھنے لگیں۔

"تو حمزہ بھی ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ رمشا بھی چلی جائے گی اور میں چاہتا ہوں، رمشا کے جاتے ہی سونیا کو چھوڑ دوں تو میرے اس عالی شان گھر میں کون رہے گا۔ میرا بزنس جسے اتنے سالوں کی، دن رات، خون پسینے کی محنت کے بعد میں نے کھڑا کیا، اس کو سنبھالنے والا کون ہو گا۔" وہ نڈھال سا لاؤنج کے صوفے

پر ہی گر گیا۔
اسے لگا وہ بالکل کنگال ہو چلا ہے، خالی ہاتھ۔

☆☆☆

وہ سرسبز پہاڑوں کے بیچ نکلتی چھوٹی سی شرارتی ندی تھی۔ جس کا شفاف پانی پتھروں پر اچھلتا کودتا، چھینٹے اڑاتا، گھاس کے سرسبز میدانوں میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا دل فریب نظارہ اس کی آنکھوں نے پہلے کب دیکھا تھا۔

وہ ایک اونچے پتھر پر بیٹھ کر پاؤں اس شفاف پانی میں ڈال کر آسمان پر اڑتے بادلوں کے سنگ جیسے خود کو بھی اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ موحد بہت آہستہ سے اس کے ساتھ اس پتھر پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کے گرم وجود کی حدت سے وہ دہک سی گئی۔

''افوہ، یہاں آ کر بیٹھ گئے ہیں کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھے بغیر کچھ جھلا کر بولی۔

''کون دیکھے گا۔ یہ اونچے سر بفلک پہاڑ، ان پر چاندی کی طرح چمکتی برف یا اس ندی کا شرارتی پانی یا اس کے کنارے کھلے کاسنی گلابی اور پیلے پھول یا اس ہری بھری گھاس کے نیچے سانس لیتی شبنم کے قطرے یا پھر ان پہاڑیوں سے نیچے اترتی بکریوں کا غول۔ کون دیکھے گا ہمیں۔'' وہ بھی اس کے لہجے میں بولا۔

''موحد! یہ دنیا کتنی الگ سی ہے۔'' وہ کسی کے دیکھ لینے کے خوف سے باہر نکلتے ہی بولی۔

''بہت الگ، بہت خوب صورت جہاں ہمارے خوابوں کی بھی رسائی نہیں۔'' وہ بھی گہرا سانس لے کر بولا۔

''ہم اب باقی کی زندگی یہیں گزار دیں گے۔ کبھی یہاں سے نہیں جائیں گے۔'' وہ ان لمحوں میں مقید جذباتی پن سے بولی۔

وہ ہنس پڑا۔

''ہنسے کیوں، اس طرح۔ میں کیا بے وقوف ہوں۔'' وہ برا مان کر بولی۔

''کل کس نے دیکھی ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں کب تک ہیں، بس یہ یاد رکھو جب تک بھی ہیں ہمیں ان خوب صورت مناظر کے ایک ایک لمحے کو اپنے اندر اتار کر جینا ہے۔''

وہ بھی اس خوب صورت قدرتی لینڈ اسکیپ کے سحر میں تھا۔

دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

''اب تم گھر چلو، ٹھنڈ بہت بڑھ گئی ہے۔ آنی اکیلی ہوں گی۔''

''گل ہے ان کے پاس۔'' وہ بے فکری سے لپک کر ندی کے پانی کے چھینٹے ہاتھوں سے اڑاتے ہوئے بولی۔

''میں کہہ رہا ہوں، تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' وہ زور دے کر بولا۔

''آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوتی۔'' وہ جھلا کر بولی۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

میرون شال میں اس کی سنہری رنگت اس خوب صورت منظر کا حصہ لگ رہی تھی۔

''سنو، کیا مجھے ہمیشہ اسی طرح چاہو گی۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

"تو گویا بھول جاؤ گی مجھے؟" وہ خفگی سے بولا۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ پھر ہنسی۔
"ہمیشہ یاد رکھو گی یعنی۔" وہ پھر مصر ہوا۔
"میں نے یہ بھی نہیں کہا۔" اس نے جھک کر پانی کا چھینٹا اس کی طرف اچھالا اور اٹھ کر ہریالی بھرے میدان میں دوڑنے لگی، کسی شرارتی لڑکی کی طرح۔
موحد کے لیے اس کا یہ روپ بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ وہ بے خود سا اسے دیکھے جا رہا تھا جو دور سے آتی بکریوں کے غول میں ہنستی ہوئی گم سی گئی تھی۔

☆☆☆

"ایک ہفتے کے لیے ٹکٹ آگے کروا لیتے ہیں ابھی ایما کی حالت نہیں ہے ٹریول کرنے کی۔" زریں نے سوئی ہوئی ایما کو دیکھ کر کہا۔
"ایک ہفتہ....." منصور بے چینی سے بولا۔
جب سے زینب نے اسے دوٹوک انکار کیا تھا اسے ایک ایک پل یہاں گزارنا دشوار ہو رہا تھا۔
وہ زریں کی بات کا کوئی بھی جواب دیے بغیر اٹھ کر باہر نکل گیا۔
پہلے کمرے سے نکلا پھر گھر سے باہر نکل کر سڑکوں پر بے مقصد پھرنے لگا۔
وہ جانے سے پہلے زینب سے آخری بار ملنا چاہتا تھا اس لیے صبح وہ زینب کی طرف گیا تو وہاں موٹا سا بھدا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کا کافی دیر وہاں کھڑے ہو کر زینب کو کال کی مگر رابطہ نہ ہو سکا جب بتول خالہ نے باہر نکل کر بتایا کہ زینب اپنی بیٹی داماد پاس چلی گئی ہے۔ ایبٹ آباد سے آگے کا کوئی علاقہ ہے۔" وہ جواب میں خاموشی سے پلٹ آیا۔
"اگر ہم ایما کے لیے ایک ہفتہ رکتے ہیں تو کیا پتا زینب اس دوران میں واپس آ جائے۔" اس نے یونہی سڑکیں ناپتے خود کو تسلی سی دی۔

☆☆☆

زینب نے دوسرے کمرے میں ضد کر کے اپنا بستر لگوا لیا تھا۔
وہ کمرہ کچن کے ساتھ ہونے کی وجہ سے قدرے گرم بھی تھا۔
وہ تینوں کھانا کھانے کے بعد قہوہ پیتے یونہی باتیں کر رہے تھے جب بیرونی دروازہ زور زور سے بجا۔
آج خلاف معمول آسمان صاف تھا۔
نہ بادل تھے نہ بارش کا شور شرابا۔
"ڈاکٹر صاحب! ساتھ والے گاؤں سے دو آدمی آئے ہیں۔ میرے ننھیالی رشتہ دار ہیں، ان کے بھائی کی حالت بہت خراب ہے۔ انہیں دیکھنے کے لیے آپ کو لے جانے آئے ہیں۔" فرزند علی نے آ کر بتایا۔
"اس وقت رات ہو گئی ہے اب تو....." زینب، موحد کو دیکھ کر کچھ پریشانی سے بولی۔
"وہ دونوں رو رہے ہیں جی! ان کا چھوٹا بھائی ہے۔ پتا نہیں اسے کیا تکلیف ہے وہ تڑپ رہا ہے حالت ایسی ہے وہ اسے یہاں بھی نہیں لا سکتے اگر ڈاکٹر صاحب احسان کریں تو وہ جیپ لے کر آئے ہیں۔"
موحد نے اٹھ کر اپنے فرسٹ ایڈ باکس میں کچھ اور ضروری دوائیں اور سامان رکھنا شروع کر دیا۔

''آپ جا رہے ہیں۔ اتنی رات ہوگئی ہے، منع کر دیں ناں۔'' کشف اٹھ کر اس کے پیچھے آئی۔
''یار! ابھی تو دس بجے ہیں صرف، اتنی زیادہ رات نہیں ہوئی۔ پاس کا گاؤں ہے تو زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔ میں دیکھ کر آ جاؤں گا پیشنٹ کو۔''
''میں آپ کے ساتھ چلوں۔'' وہ جھٹ سے بولی۔
''آپ کیا ڈاکٹر ہیں؟'' وہ اسے چھیڑ کر بولا۔
''میں جانتی تھی، کسی دن تو آپ کے منہ سے یہ نکلے گا۔ اچھا تھا اگر کسی ڈاکٹر سے شادی کر لیتے۔'' وہ روٹھ کر بولی۔
''زیادہ اچھا یہ ہوا کہ کسی ڈاکٹر سے شادی نہیں کی بلکہ تم سے کر لی جس نے میری زندگی کو ایسی خوشی سے بھر دیا جس کی شاید میں نے کبھی تمنا بھی نہیں کی تھی۔ تم کشف! شاید میری کسی بھولی ہوئی دعا کا اجر ہو۔'' وہ مدھم جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔
اور کشف بالکل ساکت تھی۔ اس طرح کا اظہار تو موحد نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کا دل اتھل پتھل ہو کر رہ گیا۔
''اچھا بس ناں، نہ جائیں انہیں منع کر دیں۔'' وہ اپنے دل کو سنبھالتی پھر سے بولی۔
''اونہوں، ہماری فیلڈ میں نہ نہیں کی جاتی۔ میں گھنٹہ بھر میں آ جاؤں گا۔ اتنے میں تم آنی کے ساتھ باتیں کرو، مجھے آج تم سے واپس آ کر بہت سی ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔ جو اتنے دنوں سے نہیں کر سکا۔ میرے آنے تک سو نہیں جانا۔'' وہ اس کے گال کو ذرا سا چھو کر اپنا باکس لے کر کمرے سے نکل آیا۔
زینب سے دعائیں لیتا وہ باہر چلا گیا۔ وہ بے دلی سے اس کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔
اور زینب کے بستر میں ہی گھس کر بیٹھ گئی۔
اس کا دل بہت عجیب سا ہو رہا تھا، جب تھوڑی دیر بعد ہی بادلوں کے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔
''لگتا ہے پھر بارش ہونے والی ہے۔'' زینب نے کمرے کی بند کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔
''بارش تو آنی! یہاں روز کا معمول ہے۔ مجھے اتنے دن ہو گئے ہیں یہاں آئے تو شاید ہی کوئی دن ہوتا ہوگا جب بارش نہیں ہوئی۔''
وہ اب گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے نیم دراز تھی، بادل گرجنے پر اس کے دل نے بھاگ کر باہر جانے کی خواہش نہیں کی۔
زینب اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی جب ذرا دیر میں تیز بارش ہونے لگی۔
باہر بارش کا وہی شور طوفان کی وہی رفتار تھی جیسے وہ روز برسا کرتا تھا۔
''یا اللہ خیر، موحد! جلدی سے آ جائے۔ موسم بہت خراب ہو گیا ہے۔'' زینب نے پریشان ہو کر دعا مانگی اس کے دل نے بے اختیار آمین کہا۔
پھر بارش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ بادلوں کی گھن گرج بڑھتی رہی۔ اس شور میں باہر زور زور سے دروازہ بجا۔ زینب کے روکنے کے باوجود کشف بھاگ کر دروازہ کھولنے گئی۔ سامنے فرزند علی بھیگا ہوا کھڑا تھا۔
''ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کھائی میں گر گئی ہے۔'' بادلوں کے شور میں اس نے بمشکل سنا۔
☆☆
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عندلیب زہرا

کرن

ارسل کا رویہ میرے لیے سمجھ بنا ہوا تھا۔ ناقابل فہم، کوئی تبدیلی تھی جو آچکی تھی اور میں بے خبر تھی۔ بے رخی لیے ہوئے اطوار میں نرمی جھلکتی تھی۔ تناؤ بھری خاموشی میں اب بیٹا اور عیشا کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو ماحول کو خوش گوار بنا دیتی۔

زیادہ سرپرائز تو تب ملا جب کچھ دن بعد نئے گھر میں شفٹ ہونے کی خوش خبری سنی۔ سب کی بے اعتنائی سہتے سہتے دل مردہ ہو چکا تھا۔ سو اس خبر نے خاص اثر نہ کیا۔

امید بنتی اور ٹوٹتی.....

خواب بنتے اور بکھر جاتے.....سو میں خاموش تھی اب۔

"کیا ہوا؟ خوشی نہیں ہو رہی اب؟" ارسل نے چٹکی بجائی، تو کتنے برس پرانا پل زندہ ہو گیا تھا۔ جب ارسل اسی شوخ اور جان دار لہجے میں مجھے مخاطب کرتے تھے۔

"آ..... ہاں..... کیوں نہیں....." میں نے زبردستی بشاشت طاری کی۔

اتوار کو وہ بیٹا اور عیشا کے ساتھ شاپنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ عالیان نے انکار کر دیا۔ "مما جائیں گی تو میں جاؤں گا....."

وہ میرے بنا ایک پل نہیں رہ سکتا تھا۔ آٹھ برس کا تھا لیکن اب بھی میرے ساتھ سوتا۔ اپنے ہر کام کے لیے مجھے آواز دیتا..... میری معمولی بیماری پر آنکھوں کے پیالے بھر جاتے۔ جائے نماز پر بیٹھ کر دعائیں مانگتا۔ مجھے بے اختیار اس پر پیار آجاتا اور دل فخر و غرور سے لبریز ہو جاتا۔

"بیٹے کی ماں ہونا۔ فخر ہی تو ہے۔" میں محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتی..... ارسل چڑ جاتے۔

"کوئی بات نہیں، ہم جو ہیں بابا کی بیٹیاں....." عیشا تسلی دیتی۔

"یہ ہے ہی مما کا بیٹا۔" عیشا ناک چڑھا کر کہتی۔

"یہ آپ کی طرح تابعدار ہے ارسل۔" میں جتلاتی۔ وہ خاموش ہو جاتے۔ جیسے خود سے تشبیہ دینا پسند نہ آیا ہو۔

ہوم ورک کر رہا تھا۔ اور میں رویوں میں الجھی ہوئی تھی۔

قمیص سیتے ہوئے بار بار دھاگا الجھ رہا تھا۔ کوئی گرہ تھی جو کھل نہیں رہی تھی۔

ایسی کئی گرہیں میری قسمت میں بھی لگی ہوئی تھیں۔ میں نے کوفت سے سوچ کر قمیص ایک طرف ڈال دی۔ نرم دھوپ کھڑکی سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ اور اس کے سنہرے سکے ماضی کے دریچے کھول رہے تھے۔

☆☆☆

میری اور ارسل کی پسند کی شادی تھی (اس فیصلے پر آج بھی پچھتاوا تھا مجھے)

ہم دونوں سارہ کی مہندی کی تقریب پر ملے تھے۔ وہ لڑکے والوں کی طرف سے مدعو تھا۔ ہلکے سبز کرتے اور گلے میں سرخ چنری کے دوپٹے کے ساتھ بہت نمایاں لگ رہا تھا۔

میں اورنج لہنگے اور گرین کرتی میں.....ملبوس آج میں نے اپنا سارا ہنر صرف کر دیا تھا۔ اب سب کی توصیفی نظریں ایک ادا سے سمیٹ رہی تھی۔ لیکن جو میرا مرکز نگاہ تھا وہ بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھتا۔ میرا دل بجھ گیا تھا۔ بارات کے لیے ہال بہت دور تھا۔ صرف مہندی کے فنکشن کی اجازت تھی۔ گھر آکر بھی دل اداس رہا۔

چند بعد سارہ اپنی خالہ ساس کے ساتھ آئی۔ چہکتی مہکتی۔

"ارسل تو دیوانہ ہو گیا ہے تمہارا۔ سجاد کا خالہ زاد بھائی ہے۔ بس اب تیاری پکڑو بنو۔" اس نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

امی نے ان کی آؤ بھگت کی اور سوچنے کا رسمی سا وقت مانگا۔ سارہ مجھے جاتے ہوئے ارسل کا واٹس ایپ نمبر دے گئی تھی۔ "کاش میں دل پر قابو رکھتی۔ نمبر ڈیلیٹ کر دیتی۔ یا کال نہ سنتی۔" شادی کے اتنے برس بعد بھی مجھے اس بات کا قلق تھا۔ جب ساس تند سے طعنے سنتی۔

"ہمارے لڑکے کو ورغلایا۔"

(ہاں ارسل تو ننھے بچے تھے ناں..... میں جل

(گرسوہنی)

"لڑکے کی ماں کے رویے میں سختی جھلکتی ہے۔ بہنوں کا رویہ بھی کھنچا کھنچا سا ہے۔" امی غیر مطمئن تھیں۔ ابو اور بھائی مطمئن تھے۔

"لڑکا شریف اور برسرروزگار ہے۔ بس کافی ہے یہ۔"

میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اپنے نصیب پر رشک آرہا تھا۔ جسے مانگا وہ عطا ہو گیا تھا۔ منگنی سے شادی تک کا عرصہ ہم نے خوب ہنستے گزارا تھا۔ لمبی لمبی باتیں کھنکتی ہنسی۔ بوجھل سرگوشیاں اور معنی خیز خاموشی..... (آہ وہ دن)

شادی خوب دھام دھام سے ہوئی تھی۔ سب نے اپنے ارمان پورے کیے تھے۔ لیکن چند روز میں ہی مجھے اپنے فیصلے کے غلط ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔

ارسل کو ہر کام کے لیے ماں کی اجازت درکار تھی۔ کہیں جانا ہوتا۔ کسی کی عیادت، حتیٰ کہ تعزیت کے لیے بھی۔ گھر تناؤ بھری خاموشی کی ردا میں لپٹا رہتا۔

میں جی جان سے خود کو نئے ماحول سے مانوس کر رہی تھی۔ کچھ ارسل کی محبت..... کچھ امی کی نصیحتیں اور کچھ اپنی شعوری کوشش، عجیب عدم تحفظ کا شکار خاتون تھیں وہ۔ میری ہر خدمت، ہر ہنر انہیں ڈرامہ لگتا۔ ملکیت کے احساس سے سرشار۔ لیکن اولاد ملکیت نہیں ہوتی۔ وہ تو رب کی عطا ہے۔ خاندان اسی طرح بنتے ہیں۔

میں ارسل کی پسند تھی (کیا واقعی؟؟)

انہوں نے یہاں تک ساتھ دیا کہ رشتہ بھجوایا اور منظور بھی کروایا۔ لیکن گھر لاکر وہ محبوب نہ رہے۔ بس ایک تابعدار بیٹا بن گئے۔ فرماں بردار..... جو ہر دم ماں کی ناراضی سے ڈرتا ہے۔ جس کا کل آسمان اس کی ماں ہے۔ اور کائنات کا ہر رنگ ماں کی نگاہوں سے نظر آتا ہے۔

"اے کاش! وہ اچھے شوہر بھی بن جاتے....."

"عافیہ! میری امی کو خوش رکھ کر ہی میرے دل تک رسائی ممکن ہے۔" یہ آموختہ مجھے پہلے روز رٹوا دیا تھا۔ جس کا اعادہ روز ہوتا ہے مجھے تابعداری پر اعتراض نہ تھا۔ اپنے ساتھ ناانصافی پر دکھ تھا۔ شادی کے اتنے برس بعد بھی میں خود کو "اینڈس میں اجنبی" سمجھتی تھی۔

"میرا ارسل بہت تابعدار ہے۔ تنخواہ میرے ہاتھ میں رکھتا ہے۔"

"مجھے ہاتھ کا ذائقہ پسند ہے اسے۔"

"منگنی کے دن وہ امی سے یہی باتیں کرتی رہیں۔ امی کو اس رشتے پر جو تحفظات تھے وہ من وعن سچ ثابت ہوئے۔ اور عافیہ بتول کی ساری طراری، ہوشیاری، ارسل کی محبت کا یقین۔ دعوے..... دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ اب زندگی ایک آزمائش تھی۔ عیشا کی پیدائش پر میں بہت خوش تھی اور ارسل بھی۔

"میرا تو پہلوٹھی کا بیٹا ہوا تھا۔ خیر" سرد آہ بھر کر اپنی اہمیت جتلائی گئی۔

"آپ خود بھی تو پہلوٹھی کی تھیں۔"

دل میں آیا آئینہ دکھاؤں لیکن اپنی خوشی کیوں خراب کرتی۔ سو خاموش رہی تاہم ایک ناراض نگاہ ارسل پر ضرور ڈالی (اپنا احتجاج میں یونہی رقم کرواتی۔ یہ اور بات کوئی فائدہ نہ ہوتا) عیشا کی پیدائش پر ماتھے کے بل صاف گنے جاسکتے تھے۔ ارسل بھی خاموش سے تھے۔

"یار! دل کرتا ہے کہ میرے ساتھ کوئی کرکٹ کھیلے۔ بچپن سے خواہش تھی۔" ارسل کا لہجہ اداس تھا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں اپنی پریوں کے ساتھ گڑیا کی شادی میں شرکت کرلوں گا۔"

ارسل نے بشاشت سے کہا اور بچی کی ننھی سی ناک کو چھوا۔ وہ برا مان کر منہ بسورنے لگی تھی۔

تاہم وہ لمحہ کنڈلی مار کر میرے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اپنی کمزوری اور بے وقعتی کا احساس۔

دن رات بیٹے کے لیے دعا گو رہتی۔ وظیفے، منتیں۔ مرادیں اور جب عالیان پیدا ہوا تو میں بامراد ٹھہری ہوں۔ دل اب پرسکون تھا۔ ارسل کا رویہ بھی ویسا تھا۔ ماں جی کی تنک مزاجی..... نندوں کے طنز..... مجھے چنداں پرواہ نہ تھی۔ عالیان میرے لیے ایک قلعہ تھا۔ ڈھال..... حصار..... ایک ایسی سرزمین..... جس پر میں اپنی امید کے خواب بنتی..... بیج بوتی۔

اگر ارسل کا رویہ متوازن ہوتا تو شاید میں ایسی

نہ ہوتی۔ یا پھر شاید سب شادی شدہ، ستم گزیدہ خواتین مجھ جیسی ہوتی ہیں۔ نومولود بیٹوں کو طاقت کا انجکشن سمجھ کر خود کو اترتی دیتی ہیں۔ سسرال والوں کے سامنے ڈھال۔ بس میری توجہ عالیان پر رہتی۔

میں نے اسے اپنا عادی بنالیا تھا۔ اتنا کہ ایک لمحے کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ذرا اوجھل ہوتی تو منہ بسورتے ہوئے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا۔ سسکیاں بھرتا۔ واش روم جاتی تو دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

کچھ تھا بھی نرم دل..... حساس..... زخمی پرندوں، جانوروں کے لیے تڑپ جاتا۔ میری محبت نے اس کے گرد ایسا حصار باندھ دیا تھا کہ ''مما ہی اس کی بیسٹ فرینڈ تھیں۔'' (آہ! ہم ماؤں کی خود غرض ممتا) زندگی بنا تبدیلی کے رواں تھی۔

☆☆☆

ارسل کو حکومت کی جانب سے گھر مل رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔ بلکہ ہم دونوں..... کتنے عرصے بعد ہم نے خوابوں کی ڈوری مل کر پروئی تھی۔

''تم لوگ جاؤ..... میں بس پرانے محلے میں خوش ہوں۔ محلے والے میرا خیال رکھ سکتے ہیں۔'' ماں جی نے بے رخی سے کہا اور تسبیح پڑھنے لگیں۔

''ہاں ناں بھائی..... یہاں ماں جی کی یادیں ہیں.....'' صبا اور حمنہ (نندیں) کے لہجے دکھی تھے۔

''نئے ماحول میں کیسے رہو گے یار؟ انجان لوگ.....'' بہنوئی بریانی کی بوٹیوں سے انصاف کررہے تھے۔

میں جانتی تھی انہیں میری خوشی نہیں گوارا..... ارسل خاموش ہوگئے اور پہلی بار ماں سے برگشتہ..... میں کلس رہی تھی۔

آخر، گھر بدلنے کا فیصلہ۔'' حکومتی فیصلوں کی طرح سرد خانے میں ڈالا دیا گیا تھا۔ میں بجھ کر رہ گئی تھی۔ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے اپنا گھر، بچوں کا روشن مستقبل، یہ پرانے زمانے کا خستہ حال گھر، لوئر مڈل کلاس علاقہ، ارسل اپنے دوستوں کو لاتے، ہچکچاتے..... گندے سندے گالیاں دیتے بچے..... گلی میں پھیلی ابتری اور برآمدے کے تخت پر براجمان ماں جی..... اپنے فیصلے پر آسودہ حال..... بیٹیوں کے ساتھ خوش۔ ارسل خاموش رہتے اور میں نے تبدیلی کا سوچنا چھوڑ دیا۔

''عالیان بڑا ہوگا تو میرے بھی حالات بدلیں گے۔'' میں عالیان کو بلاکس جوڑتے دیکھتی تو سوچتی۔ انہی بے کیف..... مایوس دنوں میں ماں جی پر فالج کا اٹیک ہوا یہ حادثہ سب کو متاثر کرگیا تھا۔

''ہماری ماں جی ہمارا ہر رشتہ ہیں..... کل اثاثہ..... ہمارا میکہ.....'' بیٹیاں رو رو کر سب کو کہتیں۔

ارسل جمع پونجی نکال کر علاج معالجے میں مصروف، میں کمن چکر بن گئی تھی۔ اکثر بے زار ہوجاتی۔

''جب کوئی بیماری یا پریشانی آتی ہے تو دونوں فریقین کی آزمائش ہوتی ہے۔''

ابو، ماں جی کی عیادت کو آئے تو مجھے نصیحت کی۔ اور میں خود کو برے لوگوں میں شمار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں دل میں شکوے سر اٹھاتے۔ کمینی سوچیں ابھرتی۔ جنہیں میں دبا دیتی۔ بیٹی جیسا خلوص نہیں تھا تاہم کوتاہی بھی نہ برتی۔

چند ماہ بعد ماں جی چل بسیں۔

بہت خاموشی سے..... بنا کچھ کہے۔ بس ان کی آخری نگاہ میرے ذہن میں ثبت ہوگئی تھی۔

ملال..... افسوس..... تشکر..... دعا اور بہت سا نمکین پانی، میں کوئی افسانوی کردار تو نہیں تھی۔ بس میرے دل میں خاموشی تھی۔ ہاں دعا ضرور کرتی ان کی مغفرت کی۔

ارسل جو ماں جی کے بہت چہیتے تھے۔ جن کی دنیا ماں جی سے شروع ہوکر انہی پر ختم ہوتی تھی۔ اس صدمے پر نارمل تھے۔ سوئم..... چالیسواں..... سب عمدگی سے کیا۔ لیکن رویے میں نامحسوس سا بدلاؤ تھا۔

وہ تناؤ..... رعب، نپا تلا انداز عنقا تھا۔ جیسے کوئی نادیدہ زنجیر تھی جو ٹوٹ چکی تھی۔ دل میں کئی بار آیا

پوچھوں آپ کو ماں جی یاد آئی ہیں؟''
لیکن متوقع بے عزتی کے ڈر سے خاموش رہتی۔

☆☆☆

سردیوں کی آمد نرم دھوپ دے رہی تھی۔ جب ارسل کی خالہ آئیں..... جن کے توسط سے رشتہ ہوا تھا۔

ہم سے مل کر خوش ہوئیں۔ میری تعریف کھلے دل سے کی۔ کیسے گھر سنبھالا ہوا ہے..... رشتوں کو سمیٹا ہوا ہے..... صبا اور حمنہ ہر ہفتے آتیں پہلے کی طرح.....

میں شکووں سے بھرا دل کیا دکھاتی..... لوگ تو وہی دیکھتے ہیں ناں..... جو ہم دکھانا چاہیں۔

''آپا کی زندگی شروع سے آزمائش تھی.....'' باتیں کرتے کرتے وہ کھو سی گئیں۔

''شوہر کی سخت مزاجی..... دوسری شادی اور زندگی کے سخت رویوں نے انہیں زخمی کر دیا تھا لیکن یہ زخم انہوں نے کسی کو نہ دکھائے، ان کا اثاثہ ان کے بچے تھے۔ لیکن ارسل.....'' وہ بات کرتے کرتے ایک لحظہ رکیں اور میرا چہرہ دیکھا۔

''ان کے لیے وہ خزانہ تھا۔ جس میں ان کی جان قید تھی۔ ہر وقت اس کے ساتھ مصروف۔ دعا گو۔ ''تم بچیوں کو نظر انداز کرتی ہو.....'' سب کہتے۔

مجھے لگا جیسے یہ میری اور عالیان کی داستان ہے۔ شاید ماں اور بیٹے کی..... تاہم میں خاموش رہی۔

''ارسل ہر کام ان سے پوچھ کرتا۔ ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔ اس کے مضامین، دوست، کپڑے وہ منتخب کرتیں۔ اور نقصان یہ ہوا کہ وہ اس گھر کا واحد مرد تھا جسے مضبوط ہونا چاہیے تھا۔ سب سے کمزور شخصیت بن گیا۔'' خالہ کے لہجے میں افسوس تھا۔ شاید انہیں ارسل کے ناروا رویے کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔

میں خاموش بیٹھی پھدکتی چڑیا کو دیکھ رہی تھی۔ جو اپنے بچوں کو دانہ کھلا رہی تھی۔ ممتا پورے ماحول کو سیراب کر رہی تھی۔ شاید ہم عورتیں جب ایک مرد کے ہاتھوں ٹھکرائی جاتی ہیں ناں تو بیٹوں کی محبت کو ڈھال بنا لیتی ہیں۔ ان کی تابعداری کو فخر سے تاج کی طرح سر پر پہن لیتی ہیں ایک ملکہ کی طرح۔

بیٹے..... اولاد نہیں رہتے ہماری ریاست بن جاتے ہیں جہاں کسی اور رشتے کی آمد ہمیں دشمن کا محلہ لگتی ہے۔ یہ ردعمل ہوتا ہے۔ کوئی نفسیاتی گرہ..... جو بیٹوں کو متوازن شخصیت بننے نہیں دیتی۔ گھر کا سربراہ بننے نہیں دیتی۔ اپنی محبت کے پنجرے میں قید۔ ارسل بھی اس پرندے کی مانند تھے جو اب رہا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

چھناکے کی آواز نے میری یادوں کی ڈوری کو لپیٹ دیا تھا۔ عالیان سے دیوار پر لگا آئینہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ہراساں ہو کر رو رہا تھا۔

''چوٹ تو نہیں لگی بیٹا..... خون تو نہیں نکلا۔'' میں فکرمندی سے اس کے ہاتھ ٹٹول رہی تھی۔ شکر ہے وہ محفوظ تھا۔ میری دعا کے سائبان میں..... میں نے اسے پیار سے صوفے پر بٹھانا چاہا۔

''میں آپ کے پاس کھڑا رہوں گا۔'' اس نے منہ بسورتے ہوئے میرا دوپٹا تھام لیا تھا۔

میں نے گہرا سانس لیا اور ٹکڑے سمیٹنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے سامنے ٹوٹا ہوا آئینہ تھا۔ جو کئی حصوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ ہر ٹوٹے ہوئے حصے میں ایک داستان رقم تھی۔

مجبور عورت جو بیٹے کو زندگی کا حاصل جان لیتی ہے۔ اپنی ڈھال، حوصلہ اور پتھر ملکیت کے احساس سے چور..... تنگ دل..... جو شراکت گوارہ نہیں کرتی..... شاید کم ظرف بھی..... اس آئینے میں میرا عکس بھی تھا۔

عالیان کے معصوم چہرے کے ساتھ..... اس کی نابینا..... شفاف نظریں۔

ارسل اور ماں جی کے چہرے بھی تھے۔ داستان ایک ہی تھی۔ کردار بدل گئے تھے۔ میں نے کرچیاں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔ گہری سانس لی اور چہرے پر ہاتھ پھیرا، گرہ کھل چکی تھی۔

☆☆

نعیمہ شاز

وہ تیری یاد تھی

صبح صبح کی روایتی ہڑبونگ، شور شرابا، ہنگامہ، چیخ پکار۔

"مما! میرا موزہ نہیں مل رہا۔" حماد نے دہائی دی۔

"ارے کیا جوتا کھا گیا تمہارا موزہ؟ وہیں کہیں ہوگا، دیکھ لو۔" زیبی کا سارا دھیان انڈے کی طرف تھا۔ زردی ذرا سی بھی پھیل جاتی تو شوہر صاحب کا غصہ اس سے زیادہ پھیل جاتا تھا۔

"کہاں دیکھوں؟" حماد جھنجلا رہا تھا۔

"اچھا، ایک منٹ ٹھہرو یا ایسا کرو، دادی جان سے کہو، وہ دیکھ کر دے دیں گی۔" زیبی نے احتیاط سے انڈا پلیٹ میں نکالا۔ شکر ہے کہ ایک مرحلہ تو بخیر و بخوبی سر ہوا۔

"زیبی! میری ٹائی کہاں ہے؟"

"کون سی؟ درجنوں تو ٹائیاں ہیں ان کی۔" زیبی بچوں کا لنچ تیار کرتے کرتے کوفت کا شکار ہوئی۔

"دھاریوں والی، براؤن۔" مجازی خدا نے نشانیاں وہ بتائیں جو ہر دوسری تیسری ٹائی میں ہوتی ہیں۔

"آپ خود بھی زحمت کر لیا کریں یا رات میں ہی نکال لیا کریں یہ سب چیزیں۔"

زنیرہ کی وین آ گئی تھی۔ اس کا ہارن مسلسل بج رہا تھا اور اس وقت تک بجتا تھا جب تک زنیرہ جا کر وین میں بیٹھ نہیں جاتی۔

"ارے، کوئی اللہ کا بندہ میری آنکھ میں دوائی ڈال دے۔" دادا نے آواز لگائی۔ ان کی نصف بہتر تو پوتے کا موزہ ڈھونڈنے میں مصروف تھیں۔

"میں ڈال دوں دادا!" اریبہ کلاس تھری میں تھی۔ آنکھوں کے ڈراپ فریج سے نکال کر لے آئی۔

"ذرا دکھاؤ تو آنکھوں کی دوائی ہی ہے، کوئی

مکمل ناول

وقت کا معائنہ کیا۔ نام پڑھا۔ مطمئن ہو کر دوائی آنکھوں میں ڈلوائی، چند قطرے گالوں اور ناک پر بہہ گئے پھر دو قطرے آنکھوں میں گئے۔

زیبی نے جلدی جلدی چھوٹے بچوں کے بیگ میں لنچ باکس ٹھونسے، پانی کی بوتلیں رکھیں۔ دونوں کو حماد اسکول چھوڑتا ہوا یونی ورسٹی نکل جاتا تھا۔ زنیرہ پہلے ہی سلائس میں انڈا دبا کر کالج کے لیے نکل چکی تھی۔ ناشتے کو چار لقموں میں نگلنے کی خوب پریکٹس ہوگئی تھی اسے۔

مجازی خدا ناشتہ کر کے بس نکلنے ہی والے تھے۔ اللہ اللہ کر کے وہ نکلے اور زیبی نے ساس، سسر اور اپنے لیے ناشتہ بنایا۔ ناشتہ کرتے ہوئے وہ ان تمام کاموں کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اسے دن بھر میں نمٹانے تھے۔

☆☆☆

پانچویں منزل پر واقع فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھی وہ نیچے سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھتے ہوئے اپنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

بلندی سے نیچے دیکھتے ہوئے کیسا فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہم جہاں ہیں، وہاں تک ہر ایک کی پہنچ نہیں۔ شاید اسی لیے لوگ دولت، شہرت اور طاقت کے آسمانوں پر پہنچنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ جہاں سے زمین اور اہل زمین بہت حقیر اور معمولی سے نظر آتے ہیں۔

مگر اس چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ کی بلندی وہ نہیں جس پر براجمان ہو کر وہ خود کو بہت معتبر سمجھے، اندر سے کسی نے اسے آئینہ دکھایا۔

''ہاں، میں جانتی ہوں۔ اس آسمان تک پہنچنے کے لیے بہت محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔''

اندر سے اٹھنے والی آواز کو اس نے جواب دیا تھا۔

''زنیرہ! ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' امی نے اسے دوسری یا تیسری بار آواز دی تھی۔

''جی امی!'' وہ اٹھ کر اندر چھوٹے سے لاؤنج

سلائس اور انڈے کا لقمہ کھاتے ہوئے اسے اکثر ہی وہ ہنگامہ خیز مصروف صبحیں یاد آتی تھیں جب سب بھاگم بھاگ گھر سے نکلتے تھے، اپنی اپنی منزلوں کے لیے اور بالآخر کچھ اپنی اپنی منزلوں کو پہنچ گئے۔ حماد جو ملک سے باہر جا کر خود کو سیٹل کر چکا تھا۔ دادا، دادی اور ابو راہی عدم ہو چکے تھے اور کچھ جو ہنوز راستے میں تھے منزل تک پہنچنے کی جستجو کر رہے تھے، جیسے زنیرہ!

روز کی طرح آج بھی چینل کی وین اسے پک کرنے آئی تھی۔ کیمرہ مین، رپورٹر اور ٹیم کے دیگر افراد کے ہمراہ وہ مصروف شاہراہوں اور مارکیٹوں میں پروگرام کر رہی تھی۔

''ہم ملاوٹ کیوں کرتے ہیں؟'' سوال دکان داروں سے بھی تھا اور خریداروں سے بھی۔ سب نے ملی جلی رائے دی۔

''خدا کا خوف نہیں ہے۔ کوئی نہیں ڈرتا اللہ سے۔''

''قانون کی سختی نہیں ہے جی، کوئی پوچھنے والا نہیں۔''

''دولت کی ہوس ہے میڈم! ایک ہی ہلے میں کمالیں سب کچھ۔''

''سنا ہے ملاوٹ کرنے والوں پر نظر رکھنے اور اس کے سدباب کے لیے کوئی محکمہ بھی ہے یہاں۔ اللہ جانے کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟''

''ملاوٹ کو نہ کوئی جرم سمجھتا ہے، نہ برا کام۔ ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی ہے یہ۔''

''بڑے لوگوں کا کیا ہے۔ اچھی اور اصلی غذائیں کھا لیتے ہیں۔ انہیں کیا پروا، غریب کون کون سے زہر کھا رہا ہے۔''

کچ ٹائم تک پھر پھر کر وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں سینڈوچز کھاتے ہوئے زنیرہ تھکی ہوئی اور پژمردہ تھی۔

"میں یہ سب نہیں کرنا چاہتی۔ اس میں کوئی اسکوپ نہیں ہے۔" سینڈوچ کا کونا کترتے ہوئے وہ جھنجلا کے بولی۔

"کیا کرنا چاہتی ہو تم؟" شہریار نے پانی کی بوتل اٹھائی۔

"کچھ اہم، کچھ خاص۔ جس کا افق بہت روشن، بہت وسیع ہو۔" زنیرہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں خواب بھی بڑے بڑے ہی تھے۔

"ایسا کرو، ترجمان بن جاؤ۔ وزارت تک پہنچنے کا چانس بھی ہے۔" گل نے شوشا چھوڑا۔

"شٹ اپ۔ یہ کوئی عہدہ ہے؟ ایسا لگتا ہے جیسے حکومت اور اپوزیشن نے اپنے اپنے مرغوں کو لڑانے کے لیے میدان میں اتارا ہوا ہے۔" زنیرہ نے برا سا منہ بنایا۔

"مرغیوں کو بھی۔" شہریار نے لقمہ دیا۔

"یہ اسٹیریوٹائپ پولیٹکس کب تک چلتی رہے گی یہاں؟ حکومت ہو یا اپوزیشن، دونوں اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں ایک دوسرے پر الزام تراشی میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔" زنیرہ نے اپنا ذائی دکھ ایک طرف کر کے قومی غم کھانا شروع کر دیا۔

"ہر جگہ ہوتی ہے اس طرح کی سیاست۔ ڈونلڈ ٹرمپ کو ہی دیکھ لو، کس کو بخشا اس نے۔"

"مجھے کیا..... میری بلا سے کہیں بھی، کچھ بھی ہو۔ میری لائف میں کچھ بھی تو نہیں ہو رہا۔ نو چینج۔" زنیرہ نے یوٹرن لیتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا۔

"ماسٹرز کر کے بھی جھک مار رہے ہیں۔" گل بھی آزردہ ہو گئی۔ ایک تو فرنچ فرائز بھی اتنے کم تھے فوراً ہی ختم ہو گئے۔

"تم تو ایم فل میں ایڈمیشن لے رہی ہو نا؟" زنیرہ نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یار! آگے ایڈمیشن لوں یا شادی کر لوں۔ کیا کروں؟" گل کے چہرے پر دنیا جہان کی بے زاری اور الجھن تھی۔

"اگر پروپوزل اچھا ہے تو فائٹ ہاں کر دو، فوراً سے پیشتر۔" شہریار نے فوراً ایک سمجھ دار، مدبر فرد بن کر مشورہ دیا۔

"نہیں نہیں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ جلدی کیا ہے آخر؟ پہلے اپنا فیوچر تو بناؤ کچھ۔" زنیرہ نے شہریار کی مخالفت کی۔

"تم لڑکیاں کچھ بھی بن جاؤ، آخر میں بہر حال ایک عدد بیوی ہی بننا پڑتا ہے۔" شہریار بولنے سے باز نہ آیا۔

"تم کتنی کنزرویٹو باتیں کرتے ہو۔ اپنی ڈگری اور صلاحیتوں کو گھونگھٹ اور سہرے میں کیوں لپیٹ رہے ہو۔" زنیرہ کی بات جتنی بے ساختہ تھی، گل اور شہریار کی ہنسی بھی اتنی ہی بھرپور تھی۔

☆☆☆

موبائل کان سے لگائے بالکنی میں بیٹھی اس کی نگاہیں ٹریفک کی روانی پر تھیں اور دھیان سماعتوں میں آتی ہوئی آواز پر۔

"بی پریکٹیکل زونی! تم کبھی کبھی بالکل بچوں کی طرح بی ہیو کرتی ہو۔ تم کیا سمجھتی ہو، میرا آنا اتنا آسان ہے کیا؟ نیویارک سے کراچی کا سفر ہے یہ، ملیر سے ناظم آباد کا آنا جانا نہیں ہے۔" زنیرہ کے مسلسل اور مستقل تقاضوں سے حماد چڑ گیا۔

"امی کچھ کہتی نہیں ہیں حماد! مگر وہ تمہیں بہت مس کرتی ہیں۔ بہت یاد کرتی ہیں۔ پانچ سال ہو گئے ہیں تمہیں، کمپیوٹر اسکرین پر تمہیں دیکھ سکتی ہیں، بات کر سکتی ہیں مگر تمہیں گلے نہیں لگا سکتیں۔ تمہارا ماتھا نہیں چوم سکتیں۔ تمہیں....." بولتے بولتے زنیرہ کی آواز بھرا گئی۔

"تم بہت ہی ایموشنل ہو جاتی ہو۔ میں نے بتایا تو ہے، میں ابھی کچھ عرصے تک یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں آؤں گا..... ضرور آؤں گا مگر ٹائم لگے گا۔ کم از کم ڈیڑھ دو سال لگیں گے۔"

"پچھلے تین سال سے تم یہی تسلی دے رہے ہو اور پتا نہیں اگلے کتنے سال تک دو گے؟" زنیرہ نے

نوٹ ٹرے ایک طرف رکھا اور اٹھ کر اندر لاؤنج میں آ گئی۔ موڈ خراب تھا جو چہرے سے ہی ظاہر ہو رہا تھا۔ ٹیسٹ یاد کرتی اریبہ نے ایک نظر زنیرہ کو دیکھا پھر دوبارہ کاپی پر جھک گئی۔

زنیرہ نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں انڈیلنے لگی۔ پانی کی بوتلوں کا کارٹن بھی آئے گا۔ ایک بوتل باقی رہ گئی تھی اس میں۔ زنیرہ نے کارٹن کا جائزہ لیا۔ گروسری بھی قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ اریبہ اور ہانیہ کو بھی اپنی چھوٹی موٹی شاپنگ کرنی تھی۔ امی نے کل ذکر کیا تھا اپنی دوائیوں کا۔ وہ بھی لانی تھیں۔

''اف..... گھر میں ایک عدد مرد کی موجودگی کتنی ضروری ہوتی ہے۔'' زنیرہ نے پانی پی کر گلاس جگہ پر رکھا۔

''کاش حماد! تم یہاں ہوتے اور ان تمام ذمہ داریوں میں ہمارا ہاتھ بٹا دیتے، جو ہمیں اکیلے ہی اٹھانی پڑ رہی ہیں۔'' وہ آزردہ ہو گئی۔

سپر اسٹور میں شیلف کے سامنے کھڑی وہ گومگو کی کیفیت میں تھی۔ شیمپو کے مختلف برانڈز دیکھ رہی تھی اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا لے۔

''واہ زنیرہ خان! تم شیمپو کا سلیکشن بھی نہیں کر سکتیں۔ کیا کرو گی آگے زندگی میں؟''

اس نے وہیں کھڑے کھڑے خود کو لتاڑا اور آنکھیں بند کر کے ایک بوتل اٹھالی۔ بجٹ محدود تھا لہٰذا وہی اشیاء لیں جو اشد ضروری تھیں۔ اریبہ اور ہانیہ کے ہمراہ باہر آئی تو چلچلاتی دھوپ نے استقبال کیا۔ اندر کے یخ بستہ ماحول سے نکل کر یہ گرمی اور دھوپ کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں تھیں کہ نیزوں کی طرح بدن میں چبھ رہی تھیں۔

''اف!'' زنیرہ نے ٹشو پیپر سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا۔ آن لائن ٹیکسی آنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ وہ پہلے ہی اسٹور سے باہر آ گئی تھیں۔

''چھوٹی موٹی گاڑی رکھنے کی اوقات بھی نہیں رہی اب تو۔'' سڑک پر دوڑتی چمکتی دمکتی گاڑیوں کو دیکھ کر وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ چند سال پہلے تک ایک چھوٹی سی گاڑی تھی ان کے پاس مگر ابو کے انتقال کے بعد گھر کے اخراجات مینج کرنے کے لیے انہیں گاڑی بیچنا پڑی پھر زنیرہ نے جاب شروع کر دی۔ جیسے تیسے گھر کی گاڑی چل ہی رہی تھی۔ اپنا پرانا اور بڑا گھر کرائے پر دے کر یہ لوگ ایک چھوٹے فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ اس گھر کے کرایہ کی رقم سے فلیٹ کا کرایہ بھی ادا ہو جاتا تھا۔ اریبہ اور ہانیہ کے تعلیمی اخراجات بھی ادا ہو جاتے تھے۔

حماد بھی کچھ نہ کچھ رقم بھیج دیا کرتا تھا مگر زنیرہ کی فکر اور پریشانیوں میں کمی نہیں آتی تھی۔ کوئی نہ کوئی الجھن یا فکر سر پر سوار ہی رہتی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی یا تمنا یہ تھی کہ کوئی ایسی عمدہ نوکری مل جائے کہ معاشی معاملات اور خواہشات سب پوری ہو جائیں۔ گھر کی سمت گامزن گاڑی میں بیٹھی ہوئی وہ مستقل اسی ادھیڑ بن میں تھی۔

☆☆☆

مینگو اسموتھی کا گلاس سامنے رکھا تھا مگر اس نے ایک گھونٹ بھی ابھی تک نہیں پیا تھا۔ خوب صورت چہرے پر حزن و ملال کے سائے تھے۔

''اچھا، تم اپنا گلاس تو ختم کرو۔ گرم ہو رہا ہے۔'' اس کی داستان غم مکمل ہوئی تو شہریار نے مشورہ دیا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا، نہ کچھ کھانے کو، نہ پینے کو۔ میں نے تو کیا کیا خواب دیکھ لیے تھے۔ پہلے نیوز ریڈر، پھر اینکر، اپنا پروگرام، اپنے مہمان۔ تھوڑی دولت اور شہرت بھی مل جاتی مگر.....''

''مگر تم آڈیشن میں فیل ہو گئیں۔'' شہریار نے اسٹرا گلاس میں گھماتے ہوئے لقمہ دیا۔

''اتنا اچھا آڈیشن دیا تھا میں نے۔ کئی کئی گھنٹے اتنی پریکٹس، اتنی محنت کی تھی۔ سب بے کار گیا۔'' زنیرہ کا منہ بدستور لٹکا ہوا تھا۔

''محنت کبھی بے کار نہیں جاتی۔ کبھی نہ کبھی، کہیں

نہ نہیں کام آ ہی جاتی ہے۔"

"میں کیا کروں شہریار! مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"تمہارے پاس ایک ہی آپشن تھا کیا؟"

"آپشن تو بہت ہیں مگر....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر کیا؟"

"اکانومی کے معاملات سب سے اہم ہیں میرے لیے۔ میں محنت سے نہیں گھبراتی مگر انکم اچھی ہونی چاہیے۔"

"اگر تمہیں ہینڈسم اماؤنٹ چاہیے وہ بھی فوری، تو ایک ہی حل ہے۔" شہریار نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا؟"

"یا تو ہیروئن پیڈلر یا ہیروئن بن جاؤ۔" شہریار کی سنجیدگی مسکراہٹ میں ڈھل گئی۔

"بکومت۔" زنیرہ نے اسموتھی کا گلاس اٹھایا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ شوبز جوائن کرلو۔ آڈیشن میں کامیاب ہوجاتیں تب بھی ٹی وی پر آتیں نا۔ چلو کوئی ایڈیا ڈرامہ ہی سہی۔ تھوک کے بھاؤ آج کل ڈرامے بن رہے ہیں۔ کہیں نہ کہیں چانس مل ہی جائے گا۔ شکل صورت اچھی خاصی ہے تمہاری ایکٹنگ بھی کرہی لوگی یا پھر کوئی مارننگ شو پکڑ لینا۔"

"تم ہمیشہ مذاق کے موڈ میں کیوں رہتے ہو؟ میں بہت سیریس ہوں شہریار!" زنیرہ خفا ہونے لگی۔

"میں بھی سیریس ہی ہوں۔ تم خود ہی سنجیدگی سے نہیں لیتیں، نہ مجھے، نہ میری باتوں کو۔"

"پھر پٹڑی سے اترنے لگے تم؟"

"اچھا چلو، تو سیریس بات یہ ہے کہ تم اپنے معاملات اور مسائل کو کچھ زیادہ ہی اپنے سر پر سوار کررہی ہو۔"

"میں نے سوار کیا ہے ان مسائل کو اپنے سر پر؟ میری امی بیمار ہیں، دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ اکلوتا بھائی ملک سے باہر ہے۔ امی اور بہنوں کو، گھر کے معاملات کو دیکھنے والا، میرے علاوہ کون ہے؟" زنیرہ نے سوال کیا۔

"جب ذمہ داریاں زیادہ ہوں اور دوسرے افراد بھی تمہارے ساتھ، تمہارے پاس ہوں تو ذمہ داریاں بانٹ لی جاتی ہیں۔ اتنا وزن اٹھا کر اکیلی مت چلو، تھک جاؤ گی۔" شہریار کی نصیحتیں شروع ہوگئیں۔

"اسی لیے تو چاہتی ہوں، خود کو معاشی طور پر اتنا مضبوط کرلوں کہ یہ سب مسائل پیچھے رہ جائیں۔"

"دولت کبھی بھی سارے مسائل کا حل نہیں ہوتی۔ تم غلط سمت میں سوچ رہی ہو۔"

"پیسہ ایک بہت بڑی حقیقت اور بہت بڑی طاقت ہے۔ یہ جو ہم یہاں بیٹھ کر کچھ کھا پی رہے ہیں، اس لیے کہ ہماری جیب خالی نہیں ہے۔" زنیرہ نے دلیل دی۔

"اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمیں جو خوشی ملتی ہے وہ روپوں سے نہیں خریدی جاسکتی۔" شہریار نے دھیرے سے بولتے ہوئے اسے دیکھا۔

"میری لائف میں دور دور تک اس قسم کی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں کتنی بار بتا چکی ہوں۔" زنیرہ نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ وقت ہے، گنجائش نکال لینا۔" شہریار مسکرادیا مگر زنیرہ بہت سنجیدہ تھی۔

☆☆☆

صبح کا اجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ خلاف معمول وہ علی الصبح ہی بیدار ہوگئی تھی۔ آج امی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔

راستے بھر چمچماتی مہنگی گاڑیوں کو حسرت سے دیکھتی رہی حالانکہ سڑک پر دوڑنے والی سواریوں میں فقط مہنگی قسم کی چمکتی دمکتی گاڑیاں ہی نہیں تھیں بلکہ وہ ٹوٹی پھوٹی بسیں بھی تھیں جن کے اندر اور چھتوں پر عوام الناس بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ ویگنیں تھیں، چنگ چی اور دوسرے رکشے تھے۔ موٹر بائیکس تھیں مگر وہ آن لائن ایرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھی حسرت سے فقط مہنگی گاڑیوں کو ہی دیکھتی رہی اور

آہیں بھرتی رہی۔

تین گھنٹے بعد اسپتال سے واپس آئی۔ تھوڑی دیر آرام کر کے پارلر گئی۔ اسکن بھی تھوڑی رف ہو رہی تھی۔ بالوں کی بھی سیٹنگ کروانی تھی۔ وہاں سے واپس آئی تو بھوک لگنے لگی۔ کھانا کھا کر وہ موبائل میں مصروف ہوگئی۔ گل کی کال آئی تھی، اسے جوابی کال کی۔

''تمہارے لیے ایک کام ہے۔ پارٹ ٹائم بھی کر سکتی ہو۔ اماؤنٹ اچھا ہے۔''

''کیا کام ہے؟''

''ایک سیاسی پارٹی کے میڈیا سیل کے لیے کام کرنا ہے۔ دراصل میرا کزن ہے نادانش، ورکر ہے ان کا اور تم بھی تو ان ہی کی ووٹر اور سپورٹر ہو۔ میں نے اسی سے ذکر کیا تھا تمہارا۔ اب اگر تم انٹرسٹڈ ہو تو مل لو اس سے۔'' گل نے تفصیل بتائی۔

''ٹھیک ہے، میں ایک دو دن میں سوچ کر بتاتی ہوں تمہیں۔'' زنیرہ کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

☆☆☆

مختصر سے لاؤنج میں موجود چھوٹی سی میز پر لوازمات رکھے تھے۔ رول، سموسے، نگٹس، رس ملائی اور چپس۔ مہمان دو ہی تھے۔ ابراہیم بھائی اور آفرین بھابھی۔ بے تکلف رشتے دار جنہوں نے کھانے پینے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔

''ابراہیم بھائی! چائے چلے گی یا کولڈ ڈرنک؟'' زنیرہ نے چپس ٹونگتے ہوئے پوچھا۔

''جب تک چائے بنے گی، تب تک کولڈ ڈرنک پلا دو۔'' ابراہیم بھائی نے پھلجھڑی چھوڑی۔

مہمان کھا پی کر، باتیں کر کے اور شادی میں آنے کی تاکید کر کے رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد زنیرہ نے سنہری لفافے میں سے جھلملاتا کارڈ لمحے بھر کی کسک، گھڑی بھر کا دکھ۔ پھر وہ نارمل ہوگئی۔

''چلیں گے شادی میں، مزا آئے گا۔ مایوں، مہندی کا جوڑا بنانا پڑے گا مجھے۔'' زنیرہ نے اریبہ اور امی کی طرف دیکھا۔

''امی! آپ کا بھی نیا سوٹ لے کر آؤں گی۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے نئے جوڑے کی۔ میرے پاس بہت جوڑے ہیں۔ کوئی سا بھی پہن لوں گی۔'' امی کے لہجے میں ایک نامعلوم سی اداسی پوشیدہ تھی۔ ان کے شوہر کی زندگی میں بہت کچھ تھا جو اب نہیں رہا یا پھر بدل گیا تھا۔

''مجھے شوز لانے ہیں اور ولیمے کا سوٹ۔'' ہانیہ نے فرمائش کی۔

''مجھے جیولری لینی ہے اور سوٹ بھی۔'' اریبہ کو بھی یاد آ گیا۔

''کل چلتے ہیں شاپنگ کے لیے۔'' زنیرہ نے جھٹ سے ہامی بھری۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اتنے لوازمات منگوانے کی۔ ایک آدھ چیز سرو کر دیتیں کولڈ ڈرنک کے ساتھ۔ آپا (نند) نے تو آنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ بیٹے اور بہو کو بھیج دیا۔ بس بوجھ اتارنا تھا سر سے۔'' امی نے زنیرہ کو مخاطب کر کے اعتراض کیا۔

''چھوڑیں امی ان پرانی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ مود آن (آگے بڑھیے) اور ہم کوئی اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ مہمان کی ڈھنگ سے خاطر مدارت بھی نہ کر سکیں۔''

''انسان کی زبان اور عہد کا پاس بھی کوئی شے ہے یا پھر سارے رشتے ناتے، دولت کے ترازو میں ہی تولے جاتے ہیں۔''

امی کا چہرہ بجھی بجھی سی رائیکا کا ڈھیر ہو رہا تھا۔

آہیں بھرتی رہی۔

تین گھنٹے بعد اسپتال سے واپس آئی۔ تھوڑی دیر آرام کرکے پارلر گئی۔ اسکن بھی تھوڑی رف ہورہی تھی۔ بالوں کی بھی سیٹنگ کروانی تھی۔ وہاں سے واپس آئی تو بھوک لگنے لگی۔ کھانا کھا کر وہ موبائل میں مصروف ہوگئی۔ گل کی کال آئی تھی، اسے جوابی کال کی۔

''تمہارے لیے ایک کام ہے۔ پارٹ ٹائم بھی کرسکتی ہو۔ اماؤنٹ اچھا ہے۔''

''کیا کام ہے؟''

''ایک سیاسی پارٹی کے میڈیا سیل کے لیے کام کرنا ہے۔ دراصل میرا کزن ہے نادائش، ورکر ہے ان کا اور تم بھی تو ان ہی کی ووٹر اور سپورٹر ہو۔ میں نے اسی سے ذکر کیا تھا تمہارا۔ اب اگر تم انٹرسٹڈ ہو تو مل لو اس سے۔'' گل نے تفصیل بتائی۔

''ٹھیک ہے، میں ایک دو دن میں سوچ کر بتاتی ہوں تمہیں۔'' زنیرہ کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

☆☆☆

مختصر سے لاؤنج میں موجود چھوٹی سی میز پر لوازمات رکھے تھے۔ رول، سموسے، نگٹس، رس ملائی اور چپس۔ مہمان دو ہی تھے۔ ابراہیم بھائی اور آفرین بھابھی۔ بے تکلف رشتے دار جنہوں نے کھانے پینے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔

''ابراہیم بھائی! چائے چلے گی یا کولڈ ڈرنک؟'' زنیرہ نے چپس ٹونگتے ہوئے پوچھا۔

''جب تک چائے بنے گی، تب تک کولڈ ڈرنک پلادو۔'' ابراہیم بھائی نے پھلجھڑی چھوڑی۔

مہمان کھابی کر، باتیں کرکے اور شادی میں آنے کی تاکید کرکے رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد زنیرہ نے سنہری لفافے میں سے جھلملاتا کارڈ نکالا۔

عفان احمد ہمراہ تانیہ صدیقی۔

ایک کلفی سی حلق میں ابھری اور معدوم ہوگئی۔ لمحے بھر کی کسک، گھڑی بھر کا دکھ۔ پھر وہ نارمل ہوگئی۔

''چلیں گے شادی میں، مزا آئے گا۔ مایوں، مہندی کا جوڑا بنانا پڑے گا مجھے۔'' زنیرہ نے اریبہ اور امی کی طرف دیکھا۔

''امی! آپ کا بھی نیا سوٹ لے کر آؤں گی۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے نئے جوڑے کی۔ میرے پاس بہت جوڑے ہیں۔ کوئی سا بھی پہن لوں گی۔'' امی کے لہجے میں ایک نامعلوم سی اداسی پوشیدہ تھی۔ ان کے شوہر کی زندگی میں بہت کچھ تھا جو اب نہیں رہا یا پھر بدل گیا تھا۔

''مجھے شوز لانے ہیں اور ولیمے کا سوٹ۔'' ہانیہ نے فرمائش کی۔

''مجھے جیولری لینی ہے اور سوٹ بھی۔'' اریبہ کو بھی یاد آگیا۔

''کل چلتے ہیں شاپنگ کے لیے۔'' زنیرہ نے جھٹ سے ہامی بھری۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اتنے لوازمات منگوانے کی۔ ایک آدھ چیز سرو کردیتیں کولڈ ڈرنک کے ساتھ۔ آپا (نند) نے تو آنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ بیٹے اور بہو کو بھیج دیا۔ بس بوجھ اتارنا تھا سر سے۔'' امی نے زنیرہ کو مخاطب کرکے اعتراض کیا۔

''چھوڑیں امی ان پرانی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ مووآن (آگے بڑھیے) اور ہم کوئی اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ مہمان کی ڈھنگ سے خاطر مدارت بھی نہ کرسکیں۔''

''انسان کی زبان اور عہد کا پاس بھی کوئی شے ہے یا پھر سارے رشتے ناتے، دولت کے ترازو میں ہی تولے جاتے ہیں۔''

امی کا چہرہ بجھی بجھی سی راکھ کا ڈھیر ہورہا تھا۔ انہیں شاید کل تک کوئی خوش فہمی تھی جو آج شادی کا کارڈ آنے سے دور ہوگئی تھی۔

تقدیر سے آگے کون بھاگ سکتا ہے؟ جو نصیب

تھی یا بے حس۔ زندگی کی کتاب سے ماضی کے وہ چند صفحات نکال پھینکنے پر تو قادر نہ تھی مگر فراموش تو کر سکتی تھی۔ سو اس نے یہی کیا۔ ویسے بھی زندگی اتنی مصروف تھی، کرنے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ ماضی کی کہانیوں کو دہرانا، گزرے وقت اور واقعات کے ملبے پر بیٹھ کے رونا، بے وقوفی اور حماقت کے سوا کچھ نہیں لگتا تھا۔

یہ ان دنوں کا ذکر تھا کہ جب ایک ہنگامے، شور شرابے کے ساتھ صبح ہوتی تھی۔ آفس، کالج، یونی ورسٹی اور اسکول جانے کی تیاریاں، ناشتے اور لنچ کے معاملات پھر ہر روز ہی عین جانے کے وقت کسی نہ کسی کی کوئی نہ چیز کوئی اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔ کبھی اِدھر اُدھر بھی نہیں ہوتی تھی بلکہ سامنے ہی پڑی ہوتی تھی اور نظر نہیں آتی تھی۔ سب کے جانے کے بعد گھر میں بکھرے ہوئے کپڑے اور بے ترتیب اشیاء ہوتی تھیں اور خاموشی۔ دادا، دادی یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دے چکے تھے وگرنہ سب کے جانے کے بعد گھر میں اتنا سناٹا نہیں ہوتا تھا۔ ملازمہ کی مدد سے زینی گھر سمیٹتیں، دوپہر تک لنچ تیار کرتیں اور جب پہلے اریبہ، ہانیہ اسکول سے، زنیرہ کالج سے اور حماد یونی ورسٹی سے واپس آتے۔ کھانا تیار ہوتا تھا۔

ہر ہفتے پھپھو آتی تھیں۔ فہمیدہ پھپھو کے ہمراہ ان کے چاروں بیٹے بھی ہوتے تھے۔ گھر میں چہل پہل ہو جاتی، رونق میں اضافہ ہو جاتا۔ زنیرہ بھی فرسٹ ایر میں تھی اور پھپھو کے دل میں ارمان جاگ رہے تھے، اسے بہو بنانے کے۔ اپنے بھائی اور بھابھی سے بھی ذکر کر دیا۔

''زنیرہ تو بس میرے عفان کی دلہن بنے گی۔''

چٹاچٹ اس کی بلائیں لیتی رہتیں۔

''بڑا تو ہونے دو بچوں کو۔'' بھائی اپنی بہن کی بے تابی پر ہنس پڑے۔

''اتنے بڑے تو ہو گئے ہیں خیر سے۔ اللہ نے چاہا تو اور بھی بڑے ہو جائیں گے۔ عفان کا ڈپلوما مکمل ہو جائے تو ابراہیم اپنے پاس بلا لے گا۔'' مستقبل کے سہانے خواب وہ خود بھی دیکھ رہی تھیں اور انہیں بھی دکھا رہی تھیں۔

ابراہیم بڑا تھا اس کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھیں مگر ابھی تک کہیں دل نہیں ٹھکا تھا ان کا۔

عفان آئے دن آتا تھا۔ اریبہ اور ہانیہ سے باتیں کرتے کرتے چپکے سے زنیرہ کو دیکھتا اور اس کا دل دھڑک دھڑک جاتا۔ نوعمری کی دھڑکن اور دل پر اولین دستک زنیرہ کا چہرہ گلابی گلابی ہو جاتا۔

کبھی کوئی ذو معنی بات، جو سمجھو تو اقرار بھی ہوتی اور انکار بھی۔ زنیرہ سوچ سوچ کر خود ہی شرما جاتی پھر یکا یک ایسا ہو گیا جیسے کوئی موتیوں کی مالا ٹوٹ جائے اور یکے بعد دیگرے موتی اس میں سے نکلتے رہیں۔ زنیرہ کے گھر سے اور ہاتھوں سے خوشیوں کے موتی ایک ایک کر کے پھسلتے چلے گئے۔

دادا، دادی کے انتقال کے بعد ایک روز اچانک ابو بھی چل بسے۔ دل چلتے چلتے رک گیا۔ ان کے جانے کے بعد زندگی کا رخ بھی بدل گیا۔ چھ کمروں کے گھر سے وہ لوگ دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔

پھپھو لانڈھی کے چھوٹے سے گھر سے گلشن کے بڑے سے بنگلے میں شفٹ ہو گئیں۔ ایک ایک کر کے چاروں بیٹے ملک سے باہر چلے گئے۔ نئی گاڑی، گھر کی آرائش و زیبائش۔ پھپھو کی اپنی سج دھج، سب کچھ دیکھنے لائق تھا۔ اس کایا پلٹ نے تقدیر کے اوراق بھی الٹ پلٹ کر دیے تھے۔ یہ لوگ اپنے ہی مسائل میں گھرے ہوئے ایک کے بعد ایک مشکلات کا سامنا کر رہے تھے۔ حماد بھی یہاں نہیں تھا۔ ابو کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ہی وہ ملک سے باہر گیا تھا۔

اپنی پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ پھپھو کا آنا کتنا کم ہو گیا ہے۔ پھر اڑتی اڑتی خبریں آئیں کہ عفان کا رشتہ طے ہو رہا ہے۔ گھر میں کسی کو یقین نہیں آیا مگر جب منگنی کی

منحنی آئی تو افواہوں کے سچ ہونے پر یقین آیا۔

زنیرہ کو دکھ ہوا مگر اس نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔ زندگی میں کرنے کے لیے بہت کچھ تھا اور کسی بھی بات پر دکھی ہونے کا وقت تھا نہ فرصت۔ مگر امی کو صدمہ تھا۔ ان کے دل کو بہت ٹھیس پہنچی تھی۔ اپنی نند سے انہیں یہ امید نہ تھی۔

آج شادی کا کارڈ آیا تو ان کا دکھ نئے سرے سے پھر تازہ ہوگیا۔ زنیرہ کے لیے یہ کارڈ غیر متوقع نہیں تھا۔ اسی لیے اب بیٹھی ماں کو سمجھا رہی تھی۔

''جب اپنوں نے ہی منہ پھیر لیا تو غیروں سے کیا توقع رکھیں۔'' امی ملکہ جذبات بن گئیں۔

''نہ رکھیں توقع۔ کیا ضرورت ہے کسی سے کوئی امید رکھنے کی۔ ہم اپنے بل بوتے پر زندگی گزار سکتے ہیں اور گزار کر دکھائیں گے۔'' زنیرہ نے ایک عزم سے کہا۔

''میرے بھتیجے بھی چھوٹے ہیں ورنہ بھائی جان تو ہاتھوں ہاتھ لیتے میری بیٹی کو۔'' امی جان نے حسرت کا اظہار کیا۔

''اچھا ہی ہوا کہ وہ لوگ ہم سے چھوٹے ہیں۔ ممانی ایک نمبر کی کنجوس۔ چینی کے دانے بھی چائے میں گن گن کر ڈالتی ہیں۔''

زنیرہ کی پھلجھڑی پر اریبہ اور ہانیہ تو بے اختیار ہنسنے لگیں اور امی بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کرسکیں۔

''گڈ گرل۔ ایسے ہی ہنستے ہنستے شادی میں چلیے گا۔'' زنیرہ نے رس ملائی کی ڈش اپنی طرف کی اور پیالی میں نکالنے لگی۔

☆☆☆

کھلے کھلے رنگوں کا، کڑھائی والا لان کا سوٹ پہنے۔ سلکی بالوں کی اونچی پونی بنائے، ہلکا سا میک اپ۔ گاڑی سے اتر کر اس نے کرایہ ادا کیا اور گلاسز اتار کر پرس میں رکھے۔ چوڑی سی گلی میں جس مکان میں داخل ہوئیں، وہ ایک کھلا اور کشادہ صحن والا تھا۔ جس میں لیموں، امرود اور پپیتے کے علاوہ آم کا بڑا گھنا اور چھتنار درخت تھا۔ اسی درخت کی چھاؤں میں تخت بچھا تھا۔ اس پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ملکہ دادی بیٹھی تھیں۔ زنیرہ اور امی کو دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔

''بڑے دنوں میں چکر لگایا زیبی! اتنا یاد کرتی رہتی ہوں میں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' ان کی بیماری کا سن کر ہی دونوں عیادت کے لیے آئی تھیں۔ ملکہ دادی جو پرانے گھر کی پڑوسن تھیں ان سے محبت، یگانگت اور خلوص کا رشتہ تھا۔

''ارے ٹھیک ہے، روز ہی کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اب تو جس دن کوئی تکلیف نہ ہو تو تشویش ہوتی ہے۔'' ملکہ دادی کھل کر مسکرائیں۔

''یہ شہریار ہے؟'' امی کی نگاہ سامنے پڑی۔ شہریار آڑا ترچھا پلنگ پر لیٹا دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔

''تھکا ہوا تھا بے چارہ، مجھ سے باتیں کرتے کرتے سوگیا۔'' ملکہ دادی کے لہجے میں پوتے کی محبت نمایاں تھی۔

''زیبی بھابھی آئی ہیں؟'' اندر سے شگفتہ بھابھی نکل کر آئیں۔ دونوں پڑوسنیں ایک دوسرے کو بھابھی کہتی تھیں۔

''تم کیسی ہو زونی! ٹی وی پر دیکھا تھا ہم سب نے تمہیں۔ بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔''

''ماشاء اللہ، ہے ہی پیاری۔'' ملکہ دادی نے لقمہ دیا۔

یہ لوگ ہمیشہ ایسی چاہت کا مظاہرہ کرتے تھے، زنیرہ محجوب ہوگئی۔ کاش وہ بھی ان سب کی محبتوں کا جواب ویسی ہی محبت سے دے سکتی جو یہ سب لوگ بشمول شہریار کے۔ ڈیزرو کرتے تھے مگر..... زنیرہ کے پاس بہت سے مگر تھے اس ''مگر'' نے اس کو اور اس کی زندگی کو دھیرے دھیرے بدلنا شروع کردیا تھا۔

شگفتہ بھابھی، زیبی سے حال احوال دریافت کرنے میں مگن تھیں اور پھر اچانک ہی انہیں یاد آیا۔

''عفان کی شادی کا کارڈ دے گئی تھیں آپا۔

بڑی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے۔ ہماری بیٹی کہ عفان کو جہیز اور سلامی میں گاڑی ملے گی اور بھی پتا نہیں کیا کیا تفصیلات بتا رہی تھیں۔ جب سے گلشن شفٹ ہوئی ہیں۔ بڑی اترانے لگی ہیں۔'' شگفتہ بھابھی نے بولتے بولتے منہ بنایا۔

''اونچے کے گھر نیتر، باہر باندھیوں کہ بھیتر۔ بھئی میں نے تو کہہ دیا کہ اچھی بھلی بھتیجی کو چھوڑ کر کہاں رشتہ کرلیا بنگلے اور گاڑی کے لالچ میں؟ چڑ گئی میری بات سن کر۔ آگے سے کہتی ہے کہ وہ تو ٹی وی پر کام کررہی ہے۔ عفان کو اعتراض تھا۔ اس نے خود ہی منع کردیا۔'' ملکہ دادی شروع ہوئیں تو لگاتار بولتی ہی چلی گئیں۔

''چھوڑیں نا دادی! ان بے کار باتوں سے کیا حاصل۔'' زنیرہ بور ہونے لگی۔ امی دکھی نظر آنے لگیں۔

''ارے تم لوگوں کو بھی بلایا ہے یا بالکل ہی قطع تعلق کرلیا؟''

''ابراہیم بھائی اور بھابھی آئے تھے کارڈ دینے۔'' زنیرہ نے بتایا۔

''اے لو، خود نہیں آئی۔ اے ہاں، کس منہ سے آتی۔'' ملکہ دادی نے سوال جواب خود ہی کرلیے۔

''امی! میرے کپڑے کہاں ہیں؟'' اندر سے نمودار ہوتے اسفند کی آواز اور باقی کے الفاظ منہ میں ہی کہیں غائب ہوگئے۔ ساتھ ہی وہ خود بھی اندر غائب ہوگیا۔

''افوہ، بتا تو دیتیں کہ باہر مہمان بیٹھے ہیں۔'' ہاف پینٹ میں ملبوس تولیہ کندھے پر ڈالے، اندر اسفند بڑبڑا رہا تھا۔

''ایک منٹ، ذرا میں اس لڑکے کے کپڑے نکال دوں۔ اتنے بڑے ہوگئے، ابھی تک بچے بنے رہتے ہیں۔''

شگفتہ بھابھی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ مگر جانے سے پہلے شہریار کو جھنجھوڑ گئیں۔

''ارے تم تو اٹھ جاؤ، مہمان آئے ہیں۔''

رہنے دیں بھابھی! تھکا ہوا ہوگا۔ آرام کرنے دیں۔'' زیبی بھابھی نے انہیں منع کیا مگر تب تک وہ اندر چلی گئیں اور شہریار آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ چند لمحے زیبی اور زنیرہ کو دیکھتا رہا پھر سلام کیا۔

''کیا ہوا بچے! ابھی تک نیند میں ہو؟'' ملکہ دادی نے اسے غور سے دیکھا۔

''نہیں، اب تو نہیں ہوں نیند میں۔ دراصل چند لمحوں کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے شہریار سیدھا ہو بیٹھا۔

''آپ کیسی ہیں آنٹی! اور تم؟ کیا چل رہا ہے آج کل؟'' زیبی سے رسمی حال احوال پوچھ کر وہ زنیرہ سے مخاطب ہوا۔

''بس وہی جو چل رہا تھا، نہ کچھ نیا ہے، نہ کچھ خاص۔''

''اور کتنا وقت لگے گا کچھ نیا اور کچھ خاص ہونے میں؟'' شہریار کے دوبارہ سوال پر زنیرہ مسکرادی۔

''بہت جلد، جو کچھ بھی ہوگا سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گی۔''

''میں ابھی آتا ہوں۔'' شہریار فریش ہونے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر میں شگفتہ بھابھی ٹرے بھر کر لوازمات لے آئیں اور سب کے درمیان رکھ دی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی بھابھی! ہم کوئی مہمان ہیں؟'' زیبی بھابھی شرمندہ ہونے لگیں۔

''تو اور کیا۔ پہلے تمہیں پڑوسن، اب تو مہمان ہی ہو۔ ہفتوں مہینوں میں کہیں چکر لگاتی ہو۔''

ملکہ دادی نے لقمہ دیا اور پلیٹیں ان کی جانب بڑھائیں۔

''چلو، اب تکلف نہ کرو مہمانوں کی طرح۔''

☆☆☆

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ خود کو مصروف کرتی جارہی تھی۔ غیر ملکی ڈراموں کی ڈبنگ کے لیے وائس اوور بھی کرنے لگی تھی۔ مگر ان مصروف دنوں میں

عفان کی شادی کی کوئی تقریب اس نے مس نہیں کی تھی۔ مایوں، مہندی، بارات، ولیمہ ہر دن پوری سج دھج کے ساتھ شریک ہوئی۔ امی جز بز ہوتی رہیں مگر زنیرہ نے کوئی خاص پروا نہ کرتے ہوئے الٹا انہیں سمجھایا۔

"مجھے یا آپ کو دکھی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے امی! عفان دنیا کا آخری اچھا لڑکا نہیں تھا جو اس کے بعد ہم پر خوشیوں کے در بند ہو جائیں گے۔ میری طرح خوشی خوشی شریک ہوں شادی میں۔ ان کو لگنا چاہیے کہ ہم نے اس معاملے کو بہت لائٹ لیا ہے۔ یہ کوئی اتنی خاص بات نہیں کہ ہم اس کا غم منائیں اور اپنے غمگین چہرے سب کو دکھائیں۔ میں پھپھو کو جتانا چاہتی ہوں کہ ہم ہر قسم کے حالات میں مسکرانا بھی جانتے ہیں اور خوش رہنا بھی۔"

زنیرہ کا لیکچر، امی کی سمجھ میں کچھ آ رہا تھا اور کچھ نہیں۔ بہر حال ولیمے میں وہ شریک ہوگئیں اور کسی حد تک چہرے پر بشاشت اور مسکراہٹ بھی طاری کر لی مگر زنیرہ کی تو سج دھج ہی نرالی تھی۔ بہت ہی مہنگا برانڈڈ جوڑا، جیولری، جوتے، میک اپ۔ سینکڑوں افراد میں وہ بہت ہی نمایاں اور منفرد نظر آ رہی تھی۔ پارلر اور اریبہ کی تیاریوں میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

فائیو اسٹار ہوٹل کا بینکوئٹ ہال رنگوں، پھولوں، خوشبوؤں اور روشنیوں سے سجا مہک رہا تھا۔ اسٹیج کی شان الگ ہی نظر آ رہی تھی جسے تازہ اور خوب صورت خوشبو دار پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اس کی خوب صورتی قابل دید تھی اور مسکراہٹ بہت ہی حسین۔ زید حارث نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ مایوں میں، بارات میں اور اب ولیمے میں۔ ہر دن اس کی دلکشی پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ ہر بار زید اسے دیکھ کر اس کی جانب کھنچتا رہا۔ آج ولیمے پر بھی اس کی بے اختیار نگاہیں زنیرہ کا طواف کر رہی تھیں۔

زنیرہ کو ان آنکھوں کا ادراک ہو رہا تھا۔ خود پر جمی بے ساختہ اور وارفتہ نظریں وہ محسوس کر رہی تھی۔

ایک اچٹتی سی نگاہ اس نے زید پر ڈالی۔ سونڈ بونڈ، چمکتا ہوا چہرہ، قیمتی رسٹ واچ، بہترین پرسنالٹی۔ اس کی شخصیت میں وہ خود اعتمادی اور وہ نکھار تھا جو عموماً دولت کی دین ہوتا ہے۔

"ہیلو۔" ایک لمحے کو زنیرہ نے جو نگاہ اس پر ڈالی۔ اس لمحے کو کسی قیمتی متاع کی مانند اپنی مٹھی میں قید کر کے زنیرہ کو مخاطب کیا۔

"ہیلو!" ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے زنیرہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"میں زید حارث ہوں، یہ میری سسٹر ہیں۔" اس نے دلہن کی جانب اشارہ کیا۔

"میں....." زنیرہ کچھ کہنے والی تھی کہ اس نے ہاتھ اٹھایا۔

"ایک منٹ۔ آپ زنیرہ احمد ہیں۔ عفان کی کزن۔ پہلے "وطن" چینل پر کام کرتی تھیں۔ آج کل ایک پولیٹیکل پارٹی کے میڈیا سیل میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں اور ڈراموں وغیرہ کے لیے وائس اوور بھی کرتی ہیں۔ سوشل میڈیا پر آپ کی فین فالوونگ بھی ٹھک ٹھاک ہے۔" زید حارث مسکراتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

"کیا میں واقعی تھوڑی سی فیمس ہوگئی ہوں؟"

"آپ کی فیملی میں امی اور دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ والد فوت ہو چکے ہیں۔ اپنا گھر کرائے پر دے کر دوسری جگہ فلیٹ میں رہتے ہیں آپ لوگ۔"

"آپ نے میری جاسوسی کی ہے؟" زنیرہ کی مسکراہٹ کی جگہ تشویش نے لے لی۔

اسے جاسوسی نہیں کہتے، معلومات میں اضافہ کہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھیے میں بزنس مین ہوں۔ جس معاملے میں، جس چیز میں یا جس شخص میں انٹرسٹ ہوتا ہے، اس کے متعلق ساری انفارمیشن اکٹھی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے زید حارث صاحب! آپ سے مل

کر خوشی ہوئی۔"

زنیرہ نے مزید کوئی بات کیے بغیر الوداعی کلمات کہے اور آگے بڑھ گئی مگر اس کا یوں آگے بڑھنا، پیچھے ہٹنے کے لیے نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ بات آگے بڑھے اور آگے چلتے ہوئے پیچھے مڑے بغیر، پیچھے دیکھے بغیر۔ اسے زید حارث کی خود پر جمی نگاہیں، خود کو دیکھتی ہوئی نظریں محسوس ہو رہی تھیں مگر مڑ کر دیکھے بغیر وہ آگے چلی جا رہی تھی جب شہریار سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ زنیرہ کو دیکھ کر وہ ٹھہر گیا۔

"کتنی رقم خرچ کر ڈالی خود کو اور اپنی فیملی کو سب میں نمایاں کرنے کے لیے؟" شہریار بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تھوڑی بہت سیونگ تھی، خرچ کر دی اور پھر بچت آخر ہوتی کس لیے ہے؟ خرچ کرنے کے لیے نا۔"

"سیونگ ضرورت کے وقت خرچ کرنے کے لیے ہوتی ہے، بلا ضرورت فضول خرچی کے لیے نہیں۔"

"اچھا بس، ہر وقت ہر بات کے لیے ڈانٹا مت کرو۔" زنیرہ نے منہ بنایا۔

"کسے امپریس کرنا چاہتی ہو تم۔"

"کسی کو بھی نہیں، تم اپنی طرف سے فضول اندازے مت لگایا کرو۔" زنیرہ کے چہرے کے عضلات سخت ہوئے۔

"بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے میں نے۔ تم عفان سمیت پوری فیملی کو آخر کیا جتانا چاہتی ہو؟"

"چپ ہو جاؤ تم، کچھ زیادہ ہی بول رہے ہو۔"

"تم یہ جتانا چاہتی ہو انہیں کہ تم بہت خوش، بہت مگن ہو اپنی دنیا میں۔ جو کچھ انہوں نے کیا، اس سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے مبارک ہو، جو کچھ تم دکھانا اور جتانا چاہتی تھیں، بڑی حد تک کامیاب ہو اس میں۔"

"شہریار!" زنیرہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ایک جھٹکے سے وہ مڑی اور ایک ایسے کونے میں جا کر بیٹھ گئی جہاں بہت کم لوگ تھے اور جاننے والا تو کوئی تھا ہی نہیں۔ رنج اور غصے کے مارے اس کا برا حال تھا۔

"یہ آخر خود کو سمجھتا کیا ہے؟ جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے بول دیتا ہے، پڑوسی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہر وقت خود کو میرا گارجین سمجھتا رہے اور مجھے نصیحتیں کرتا رہے۔" غصے میں کھولتی ہوئی وہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

"لگتا ہے کچھ زیادہ ہی بول گیا؟" شہریار نے متفکر ہو کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس طرف دیکھا جدھر زنیرہ گئی تھی۔

"ایک تو یہ لڑکی خفا ہو جاتی ہے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بتاؤ ذرا، کتنی اچھی اچھی صورتیں چاروں طرف موجود ہیں۔ مجال ہے جو کوئی بھی اچھی لگے۔ زنیرہ احمد! تم ناراض ہو کر ساری بہاریں ساتھ لے جاتی ہو۔"

بے بسی کے عالم میں سوچتے ہوئے شہریار اسی طرف چل پڑا جہاں وہ خوشبو سی لڑکی گئی تھی۔

☆☆☆

"افوہ.....!" کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کیں۔ کسی کی حمایت میں، کسی کی مخالفت میں لفظوں کی جنگ لڑتے لڑتے تھک سی جاتی تھی۔ انگلیوں سے بند آنکھوں کے پپوٹے سہلاتے ہوئے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ تب ہی موبائل بج اٹھا۔ اس نے کال اٹینڈ کی اور ہینڈز فری کانوں میں لگائے۔ شہریار معمول کے مطابق خیر خیریت دریافت کر رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہے۔ امی کی طبیعت بھی ٹھیک ہے۔ اریبہ اور ہانیہ کے ایگزام ہو رہے ہیں۔ میرے کام بھی ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں۔ حماد کا فون آتا رہتا ہے، پیسے بھی بھیج دیتا ہے اکثر۔"

زنیرہ نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیلات بتا دیں مگر ایک بات تھی جو رہ گئی تھی اور جسے کہتے ہوئے وہ جانے کیوں جھجک رہی تھی۔

''اور میرے لائق کوئی خدمت؟''

''ایک بات بتانی تھی تمہیں۔'' زنیرہ نے آہستہ سے کہا۔

''بتاؤ، خدا کرے کوئی اچھی خبر ہو۔'' شہریار کے لہجے میں خوشی اور شوخی کی کھنک تھی۔

''زید نے مجھے پروپوز کیا ہے۔''

''کیا..... کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' شہریار کو اپنی سماعتوں پر اعتبار نہ آیا کہ انہوں نے کیا سنا ہے۔

''مسز عفان کے بھائی ہیں زید حارث! انہوں نے مجھے پروپوز کیا ہے۔'' زنیرہ نے آہستہ سے اپنی بات کو دہرایا۔

''ان صاحب کا دماغی معائنہ ہونا چاہیے اور آنکھوں کا بھی۔''

''شہریار! کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔'' زنیرہ جھنجلائی۔

''مجھ سے زیادہ سیریس کون ہوگا۔ چھریاں چل گئی ہیں میرے دل پر۔ تم یہ کیا الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہو؟''

''کیا مطلب؟ کیا الٹی سیدھی حرکتیں۔ جانتے بھی ہو، وہ کون ہے۔ اتنی بڑی بزنس مین فیملی ہے۔ پھپھو اپنی بیٹی دینے کو تیار بیٹھی ہیں۔''

''اوہ، تو اس سے پہلے تم نے یہ ہیرا اچک لیا۔'' شہریار کا لب ولہجہ طنز سے بھرپور تھا۔

''مائنڈ یور لینگویج۔ تم کبھی کبھی حد سے آگے بڑھ جاتے ہو۔'' زنیرہ کو عادت کے مطابق فوراً غصہ آنے لگا۔ یہ اور بات کہ شہریار کے لیے اس کا غصہ بس تھوڑی دیر کا ہی ہوتا تھا۔

''بائی دا وے۔ تم نے کیا دیکھا اس شخص میں جو نوبت یہاں تک آ پہنچی؟''

''میرے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ بہت رچ ہے، ویل سیٹلڈ ہے۔ دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور مجھے پسند کرتا ہے اور کیا دیکھنا چاہیے؟''

''اس کا دل..... دل کیسا ہے؟ تمہاری عزت کرتا ہے، قدر کرتا ہے؟''

پروپوز نہیں کیا نا تفریح یا شغل میلہ کرنے کے لیے۔''

زنیرہ کا ضبط پھر جواب دینے لگا۔

''اور تم؟ کیا تم سچ مچ انٹرسٹڈ ہو اس میں؟ یا اس کے بنگلوز، گاڑیوں، بزنس اور بینک بیلنس سے امپریس ہو گئیں۔'' شہریار نے پھر چبھتا ہوا سوال کیا۔

''یہ سب زندہ حقیقتیں ہیں۔ اس دنیا کی، دولت، آسائشیں، گھر، گاڑی، پیسے کی فراوانی ان کے بغیر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔'' زنیرہ نے دو ٹوک جواب دیا۔

''تو تم نے فیصلہ کر لیا؟'' شہریار بجھ سا گیا۔

''ہاں، میں نے فیصلہ کر لیا، جو مجھے کرنا ہی تھا۔''

''ٹھیک ہے جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا تو مجھے کیا بتا رہی ہو۔ نہ میری کوئی اہمیت ہے، نہ میری کسی بات کی۔ تمہیں اپنی مرضی چلانی ہے، شوق سے چلاؤ۔'' شہریار نے غصے سے بولتے ہوئے فون آف کر دیا۔

''پتا نہیں شہریار! تم کب بڑے ہو گے؟''

زنیرہ نے اپنا موبائل سامنے ہی رکھ دیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پانچ منٹ بعد اس کا فون آئے گا۔ وہ ایسا ہی تھا، بچوں کی طرح بہت جلدی روٹھ جاتا پھر خود ہی مان بھی جاتا۔

وہ اسکرین پر چمکتے ہندسوں کو بدلتا دیکھتی رہی اور چار منٹ بعد شہریار کی کال آ گئی۔

''میں نے بس ایک بات کہنے کے لیے کال کی ہے۔''

''کہو۔'' زنیرہ مسکرائی۔

''وش یو بیسٹ آف لک، اینڈ گڈ بائے۔'' موبائل پھر آف ہو گیا۔

''گڈ بائے۔''

زنیرہ نے چمکتی ہوئی اسکرین کو تاریک ہوتے دیکھا۔ کبھی چمکتے چہرے اور جگمگاتی مسکراہٹیں بھی

تاریک ہو جاتی ہیں، بجھ جاتی ہیں۔ کسی کی غیر متوقع باتوں پر، کسی کے ناقابل یقین رویوں پر۔

دو سال پہلے کی ایک گرم اور اداس شام، اس کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ تایا ابو کی فیملی گھر آئی ہوئی تھی۔ تایا زاد کنزیٰ اس کی ہم عمر تھی۔ پلیٹ بھر کے نمکو، چپس اور کولڈ ڈرنک لے کر دونوں الگ تھلگ کونے میں بیٹھی دنیا جہان کی باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔

''سنا ہے پھپھو، کوئی بنگلہ تلاش کر رہی ہیں۔''

''ہیں..... پھپھو نیا گھر خرید رہی ہیں؟'' زنیرہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ سب لڑکیوں کی طرح اسے بھی ایک بہت خوب صورت، نئے نویلے پیارے سے گھر کا ارمان تھا۔

''نئے گھر کے ساتھ ساتھ نئی بہو بھی تلاش کر رہی ہیں۔'' کنزیٰ نے پھلجھڑی چھوڑی۔

''ابراہیم بھائی کے لیے؟'' زنیرہ نے سادگی سے کہتے ہوئے نمکو اٹھا کر منہ میں ڈالی۔

''عفان بھائی کے لیے بے وقوف۔''

''عفان کے لیے؟'' زنیرہ نے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ نمکو کھانا بھول گئی تھی اور چمکتا ہوا چہرہ بجھ گیا تھا۔

''نیا بنگلہ، نئی چیزوں سے ڈیکوریٹ کریں گی نا۔''

''انسان میں اور چیز میں فرق ہوتا ہے۔'' کنزیٰ کی باتوں سے زنیرہ کا دل ڈوب رہا تھا۔

''جب لوگ بدلتے ہیں نا تو چیزیں اہم ہو جاتی ہیں اور انسان اور رشتے غیر اہم۔''

کنزیٰ کی باتوں پر اس وقت زنیرہ کو یقین نہیں آ رہا تھا اور اصل بات یہ تھی کہ وہ یقین کرنا ہی نہیں چاہتی تھی مگر بعد میں ثابت ہو گیا کہ اس کا کہا گیا ایک ایک لفظ درست تھا، سچ تھا۔ ایسا کڑوا سچ جو زنیرہ کے اندر تک اتر کر اسے بھی تلخ کر گیا۔

اور کئی ہفتوں بعد جب شہریار کے سامنے اس نے پھپھو اور عفان کے بدلتے رویے کی شکایت کی تو اس نے کہا۔

''زنیرہ بی بی! یہ جو ہم کہتے ہیں نا کہ فلاں بدل گیا یا ڈھمکا بدل گیا تو بدلتا کوئی نہیں ہے بلکہ دراصل ایکسپوز ہو جاتا ہے۔ غیر معمولی حالات و واقعات کے بعد انسان کے اوپر چڑھا ہوا سارا ملمع اتر جاتا ہے اور اندر کی اصلیت اور اندر کا انسان باہر آ جاتا ہے، چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔ بزدل ہو یا بہادر۔'' شہریار نے ایک نظر اس کے اترے ہوئے چہرے پر ڈالی۔

''تمہاری پھپھو اور عفان کے دل میں اندر کہیں لالچ، خود غرضی اور موقع پرستی تھی۔ حالات بدلے تو ان کا باطن کھل کر سامنے آ گیا۔''

''پتا نہیں کیا کیا بول رہے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' زنیرہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''سمجھنے کی کوشش کرو تو سمجھ میں آئیں گی۔ میں فقط یہ کہہ رہا ہوں کہ بعض اوقات، غیر معمولی حالات و واقعات انسان کی اصلیت سامنے لے آتے ہیں۔ جن سے دوسرے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔''

''تم گرافک ڈیزائنر کے بجائے کوئی سائیکاٹرسٹ لگ رہے ہو۔'' زنیرہ الجھی ہوئی تھی۔

مگر وہ ماضی تھا، شہریار کی باتیں اب سمجھ میں آئی تھیں لیکن معاملات اگر سمجھ میں آ جائیں، زندگی کے حقائق اگر واضح ہو جائیں تو دل کی تکلیف ہلکی تو نہیں ہوتی..... بے سکونی اور بے چینی کم نہیں ہوتی۔''

زندگی کا نیا باب زید حارث کے نام کا کھلا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہی تھا پھر بھی اندر ہی اندر کہیں مدھم سی کوئی آنچ تھی جو دھیرے دھیرے جلا رہی تھی۔

''اف ف.....'' زنیرہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''مجھے پریشان رہنے کی عادت پڑ گئی ہے شاید۔''

''امی..... کیا پکایا ہے آج؟'' اس نے گھبرا کر ماں کو آواز دی۔

''یہ دونوں گھسی ہوئی ہیں آج کچن میں۔ دیکھو، کیا شاہکار تیار کرتی ہیں۔''

''کیا بنا رہی ہو تم لوگ؟'' زنیرہ کچن میں آ گئی۔

''چائنیز۔'' اریبہ نے جواب دیا۔

''چائنیز نہیں ہے یہ پاگل۔ اٹالین ہے۔'' ہانیہ نے تصحیح کی۔

''تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا بنا رہی ہو۔'' زنیرہ مسکرا اٹھی۔

''ڈش کا نام تو معلوم ہے آپی! مگر ذات پات نہیں معلوم۔ کس نسل اور کس قوم سے تعلق ہے۔'' اریبہ نے اتنے مزے سے جواب دیا کہ زنیرہ ایک بار پھر اپنی ہنسی روک نہیں پائی اور پھر اپنی ہنسی پر خود ہی ٹھٹک بھی گئی۔ کتنے عرصے بعد شاید وہ دل سے ہنسی تھی۔ خالص، سادہ اور بے ریا ہنسی۔ جس کے بعد اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

''شہریار ٹھیک ہی کہتا تھا، لڑکی خود کو اتنا مصروف، اتنا سنجیدہ مت بناؤ کہ مسکرانا ہی بھول جاؤ۔ یاد رکھو، جو لوگ اپنی مسکراہٹ کھو بیٹھتے ہیں، وہ خود بھی کہیں گم ہو جاتے ہیں۔''

''ایک تو تم اور تمہارا خیال۔ بن بلائے مہمان کی طرح کسی بھی وقت آن ٹپکتے ہیں۔'' زنیرہ جھنجلانے کے بجائے مسکرا دی۔ وہ خود کو اور اپنی مسکراہٹ کو کہیں گم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

دن نکلتا تھا۔ شام ڈھلتی تھی۔ رات ہوتی۔ چاند نکلتا، کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا اور ستاروں کی تابندگی نمایاں ہو جاتی۔ نرم گرم دن، بوجھل راتیں، کسی کے لیے اور کسی کے لیے یہی دن یہی راتیں، کھلکھلاتے روشن اور چمک دار تھے۔ خوب صورتی یا شدت اور سختی موسموں میں نہیں ہوتی۔ وقت کے کسی پیمانے میں نہیں ہوتی۔ دنوں میں، نہ راتوں میں۔ صبحوں میں نہ شاموں میں۔ ساری روشنی، تازگی اور دلکشی انسان کے اندر سے مشروط ہے۔ تمام خوشیوں کے سوتے، دل کے اندر سے کہیں پھوٹتے ہیں۔ مسکراہٹوں کے جتنے بھی دھارے ہیں، فرد کے اندر پیوستہ ہیں۔ وہیں سے بہتے ہیں، باہر کے موسموں سے، شدتوں اور سختیوں سے بے نیاز۔

زنیرہ نے کسی کی فیس بک پوسٹ پڑھی تو سوچ میں پڑ گئی۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے خنک ماحول میں بیٹھی وہ بہت خوش ہونا چاہتی تھی۔ بے حد مسرت محسوس کرنا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی، کچھ تھا جو اسے کھٹک رہا تھا اور وہ کیا ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''بس کرو زنیرہ بی بی! ناشکرا پن مت کرو۔ تمہاری خواہش پوری ہونے جا رہی ہے۔ جو کچھ تم نے سوچا، جو چاہا وہ پورا ہونے جا رہا ہے۔ اب کیا مصیبت ہے؟'' زنیرہ جھنجلا کر خود کو ڈانٹ رہی تھی۔

''یہ شہریار ہے جس کی وجہ سے مجھے کلٹی فیل ہو رہا ہے۔ مجھے اتنا حساس ہو کر نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میری خوشی میں خوش ہے۔ مجھے بھی اپنی خوشی کو انجوائے کرنا چاہیے۔''

زنیرہ نے اپنی بے چینی پر قابو پایا۔ اپنا موبائل آن کیا اور اپنی سیلفی دیکھنے لگی جو ابھی کچھ دیر پہلے لی تھی۔ گھنے، چمک دار بالوں کے کرلز چہرے کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ مناسب میک اپ میں نقوش کی دلکشی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔

اچھی خاصی، اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر موبائل آف کیا۔ وہ مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی پہنچ گئی تھی حالانکہ زید نے پیش کش کی تھی کہ وہ اسے لینے آ جائے گا مگر زنیرہ نے منع کر دیا تھا۔ اب یہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دس منٹ پہلے آ گئی تھی اور زید پندرہ منٹ دیر سے آیا تھا۔ ان پچیس منٹوں میں وہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ ماضی، حال اور مستقبل، سوچ کا پرندہ کہاں کہاں اڑان بھرتا رہا۔ زید کی آواز آئی تو وہ چونکی۔

''ہیلو..... آئی ایم سوری۔ میں لیٹ ہو گیا۔'' وہ کرسی پر اس کے سامنے بیٹھ رہا تھا اور پھر اگلے پانچ منٹ میں وہ کئی بار معذرت کر کے اپنے دیر سے آنے کی وجہ بیان کر رہا تھا۔

''اٹس اوکے۔'' زنیرہ اس کی بار بار معذرتوں

اور وضاحتوں پر مسکرا دی۔

"تو تم بتاؤ، کیسی ہو؟" زید بہت ریلیکس ہو کر بیٹھا تھا۔ وہ فارمل ڈریسنگ کر کے آیا تھا اور بہت سوبر اور چارمنگ لگ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری ہاں سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مند پسند انسان کا ساتھ صرف خوشی ہی نہیں بلکہ سکون بھی دیتا ہے۔ میری لائف اتنی مطمئن اور پرسکون پہلے کبھی نہیں تھی۔" زید نے بولتے بولتے ایک مخملی تھیلی اس کے سامنے رکھی۔

"ایک چھوٹا سا گفٹ تمہارے لیے۔"

"تھینکس۔"

"اتنی خاموش کیوں ہو؟"

"کسی کو سننا ہو تو خاموش ہونا ضروری ہے۔" ہولے ہولے مسکراتی ہوئی زنیرہ نے جواب دیا۔

"دوسرا بھی تو تمہیں سننے کا منتظر ہے۔" زید کی مسکراہٹ اور آنکھوں نے زنیرہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"یہ تو گڑبڑ والی بات ہے۔ دو انسان بیک وقت خاموش تو ہو سکتے ہیں مگر بیک وقت ایک دوسرے سے باتیں تو نہیں کر سکتے۔"

"ضروری نہیں، باتیں زبان سے ہی کی جائیں۔ کچھ باتیں انسان اپنی آنکھوں سے بھی کہہ دیتا ہے۔" زید آج بہت رومانٹک ہو رہا تھا اور بہت خوش بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"زبان اور انداز کی طرح، آنکھیں بھی دھوکا دے سکتی ہیں۔" زنیرہ کو کچھ یاد آیا۔ اس کے چہرے کی جوت کچھ مدھم پڑ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" زنیرہ نے سر جھٹکا۔

"دراصل میں یہ سوچ رہی تھی کہ آنکھیں ہوں یا زبان، کم ہی ہوتی ہیں جو بھروسے کے قابل ہوں۔"

"مجھ پر تو بھروسا ہے نا؟"

"بھروسا نہ ہوتا تو اس وقت، یہاں آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔" ویٹر آرڈر کے مطابق ڈشز لا کر رکھ رہا تھا۔ دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

"میں نے ممی پاپا سے بات کر لی ہے۔ تمہارے گھر آئیں گے ہم۔ نیکسٹ سنڈے کیسا رہے گا۔"

"اتنی جلدی؟" زنیرہ ایک دم گڑبڑا سی گئی۔

"کیوں کیا ہوا؟" زید نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہمارا گھر بہت چھوٹا سا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچیں۔" زنیرہ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے اندر کیسے کیسے احساس کمتری کنڈلی مار کر بیٹھے ہیں۔ بولنے کو تو بول دیا پھر یکا یک چپ ہو رہی۔

"وہ کچھ نہیں سوچیں گے، وہ بس تم سے اور تمہاری فیملی سے ملنا چاہتے ہیں اور بس۔" زید نے مسکراتے ہوئے اس کی پلیٹ میں فرائی فش کا پیس رکھا۔

"میں کوئی اور مکان رینٹ پر لینا چاہ رہی ہوں۔ پراپرٹی ڈیلر سے کہا ہوا ہے مگر دو سے تین ماہ لگیں گے۔" زنیرہ نے فش کا چھوٹا سا ٹکڑا کانٹے میں پھنسایا۔

"وہ صرف ملنا چاہتے ہیں اور بس۔ اس کے بعد یا اس سے آگے جو بھی ہوگا، اس میں کچھ ٹائم لگے گا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، تو میں ان مسئلے مسائل سے ذرا نمٹ لوں پھر....."

زید کی ادھوری بات میں جو مطلب پنہاں تھا وہ زنیرہ سمجھ گئی تھی۔

☆☆☆

"مما! میرا چارجر نہیں مل رہا۔" اریبہ کب سے دہائیاں دے رہی تھی۔ اس کا موبائل اگر چارج نہ ہو تو اس کی دنیا اندھیر ہو جاتی تھی۔

"دیکھ لو، وہیں کہیں ہوگا۔ بغیر دیکھے ہی شور مچانا شروع کر دیتی ہو۔" امی نے پراٹھا سینکتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

"ہا..... امی!" ہانیہ کی ہولناک چیخ سن کر امی

کے ہاتھ سے چمٹا گر گیا۔ ''خدا خیر کرے، کیا ہو گیا؟'' پراٹھا ہاٹ پاٹ میں رکھ کر وہ کچن سے باہر آئیں۔

''پمپلز (دانے) نکل رہے ہیں منہ پر۔ پورے تین ہیں۔''

ہانیہ کی بات سن کر امی کا جی چاہا۔ ایک کس کے لگائیں، اسی منہ پر جس کا آئینے میں جائزہ لیا جا رہا تھا۔

''توبہ ہے، ہولا کے رکھ دیا مجھے۔ ڈر گئی تھی میں۔ خدا جانے کیا ہو گیا؟'' امی بڑبڑاتی ہوئی کچن میں واپس گئیں۔

''بہت لکی ہو تم دونوں۔ زنیرہ ابھی ابھی ہاتھ منہ دھو کر لاؤنج میں آئی، چھٹی کا دن تھا سب کی صبح ہوتے ہوتے دوپہر ہی ہو چلی تھی۔

''اچھا، آپ کا چارجر کھو جائے۔ منہ پر پمپلز نکل آئیں تو پتا چلے۔'' دونوں نے مل کر زنیرہ کا گھیراؤ کیا۔

''تم دونوں کی لائف میں بڑے بڑے پرابلمز نہیں ہیں۔'' زنیرہ حسب عادت یا حسب فطرت قنوطی ہو چلی۔

''ہمارے لیے تو یہی اتنے بڑے بڑے مسئلے ہیں۔ یا اللہ، اب میں کیا کروں۔ تین تین دانے ایک ساتھ۔ کسی طرح ٹھیک بھی ہو گئے تو نشانات چھوڑ جائیں گے۔'' ہانیہ کو پمپلز کے غم نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

''میرے موبائل کی چارجنگ بالکل زیرو ہو گئی ہے۔ بند پڑا ہے اور چارجر، سب جگہ دیکھ لیا۔ مل ہی نہیں رہا۔ پتا نہیں کہاں دفعان ہو گیا۔'' اریبہ کو غصہ آ رہا تھا، بند موبائل کی تاریکی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

''بچوں والی باتیں ہیں ابھی تم دونوں کے اندر۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ بڑے ہو کر شعور اور آگہی کے ساتھ ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔'' زنیرہ دنیا جہان کی اداسی اور فکرات چہرے پر سجائے بیٹھی تھی۔

''تم کیوں ہر وقت فکر مند رہتی ہو؟ اب کیا پریشانی ہے؟'' امی نے اس کا اترا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔

''چاروں طرف پریشانیاں ہی ہیں امی! کسی کو دکھائی دیں یا نہ دیں مجھے تو نظر آتی ہیں نا۔'' بالوں کو سمیٹ کر اونچا سا جوڑا بناتے ہوئے زنیرہ خشک لہجے میں بول رہی تھی۔

''پریشانیاں آتی ہیں تو ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ مسئلے مسائل بھی جیسے تیسے حل ہو ہی جاتے ہیں۔ اب انہیں کلیجے سے لگا کر کیا رکھنا۔ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا نا۔ برے سے برا وقت بھی بالآخر گزر ہی جاتا ہے۔''

بیٹی کی نسبت امی اتنی قنوطی نہ تھیں، نہ ہی ہر وقت، ہر بات کا تاریک پہلو دیکھتی تھیں۔ وہ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتی تھیں۔

''ناشتہ بنا دوں تمہارا؟ کیا کھاؤ گی؟''

''کچھ بھی بنا دیں بلکہ صرف چائے دے دیں۔ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں کر رہا۔ کتنے دنوں سے حماد کا فون بھی نہیں آیا؟''

''فون تو کل ہی آیا تھا میرے پاس۔ اریبہ اور ہانیہ سے بھی بات ہوئی تھی۔'' امی نے مزے سے بتایا۔

''مجھے کیوں نہیں کی کال؟'' زنیرہ اچھل پڑی۔

''تم ڈانٹتی رہتی ہو اسے۔ جانے کون کون سے دکھڑے روتی ہو اس کے سامنے۔'' امی نے حماد کی شکایت اس تک پہنچائی۔

''نہ میں نے اسے ڈانٹا ہے نہ اس کے سامنے کوئی دکھڑے روئے ہیں۔ فقط اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے اسے؟'' زنیرہ کو غصہ آنے لگا۔

''اسے سب احساس ہے زونی! وہ پابندی سے پیسے بھیج رہا ہے۔ باقاعدگی سے کال کرتا ہے، جب سہولت ہوئی وہ یہاں آ بھی جائے گا۔ تم بار بار اسے کیوں فورس کرتی رہتی ہو آنے کے لیے؟'' امی نے چائے کا مگ اس کے سامنے رکھا۔

"اگر اس نے وہاں شادی کرلی نا تو پتا چل جائے گا۔ شکل دیکھنے کو ترس جائیں گے آپ سب۔" زنیرہ نے مستقبل کی خیالی مگر بھیانک منظر کشی کی۔

"جب کی جب دیکھی جائے گی، ابھی جو کام نہیں ہو رہا اس کے اندیشے میں دبلے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" امی کا اطمینان قابل دید تھا۔

"میں ہی پاگل ہوں جو سب کی فکر میں گھلتی رہتی ہوں، اگر آج میری شادی ہو جائے تو نہ جانے کیا بنے اس گھر کا؟"

زنیرہ کو فت کے عالم میں بڑبڑائی۔ امی کے سکون اور اطمینان پر اسے حیرت ہوتی تھی۔

"چاروں طرف سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں ہم لوگ۔ باپ کا سایہ نہیں رہا، اکلوتا بھائی ہمیں تنہا چھوڑ گیا۔ قریبی رشتوں نے خود غرضی دکھائی، امی بیمار ہیں۔ بہنیں چھوٹی اور ناسمجھ ہیں۔ میں اکیلی کیا کیا کروں؟ کہیں بھی جاب کروں۔ ہر جگہ جاب میں لیڈ سیکرٹری ہی ہوتی ہے۔ سارے مسائل کا حل دولت میں ہے۔ زید سے شادی ہو جائے تو میری فیملی کو بھی سنبھالا مل جائے گا اور....."

آگے سوچتے سوچتے وہ رک گئی۔

"کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو۔ چائے تو پی لو۔ پہلے یہ کھالینا، خالی پیٹ چائے نقصان کرے گی۔" امی نے پلیٹ اس کے سامنے کی جس میں کیک رسک اور بسکٹ وغیرہ تھے۔

"جی اچھا۔" زنیرہ نے فرماں برداری سے ایک بسکٹ اٹھالیا اور دھیرے دھیرے کترنے لگی مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی ادھیڑ بن میں ہے۔

"نہ جانے یہ لڑکی ہمیشہ اتنی پریشان کیوں رہتی ہے؟" امی نے تاسف سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور خود بھی وہیں کرسی گھسیٹ کر ناشتہ کرنے لگیں۔

☆☆☆

بلڈنگ سے باہر دھوپ اپنی پوری آب و تاب سے پھیلی ہوئی تھی۔ سورج میاں بڑی بے دردی سے آگ کا گولہ بنے دہک رہے تھے اور آتشیں کرنیں برسا رہے تھے۔ اے سی کی ٹھنڈک سے باہر نکل کر زنیرہ کو یکا یک یوں لگا جیسے کسی بھٹی میں داخل ہو گئی۔

"اف یہ گرمی" زنیرہ نے قہر آلود نگاہوں سے پہلے آسمان کی جانب دیکھا پھر ان ہی نظروں سے اپنے ہمراہ چلتے ہوئے شہریار کو دیکھا۔

"ایسی کون سی ضروری بات ہے جو اس جھلسا دینے والی دھوپ میں مجھے بلالیا؟"

"لنچ ٹائم ہے تمہارا۔ لنچ کے لیے باہر نہیں نکلتیں کیا؟"

"بالکل نہیں۔ اتنی پاگل نہیں ہوں، اے سی کی ٹھنڈک چھوڑ کر اس کڑکتی دھوپ میں باہر آؤں۔ اندر ہی کر لیتی ہوں لنچ۔" زنیرہ نے کڑے تیوروں سے جواب دیا۔

"ضروری بات نہ ہوتی تو تمہیں یوں پریشان کرتا۔ آئی ایم سوری۔" شہریار نے دھوپ کی تمازت سے سرخ ہوتا اس کا چہرہ دیکھا تو دھیرے سے گویا ہوا۔

"فون پر کر لیتے، کیا بات ہے؟"

"فون پر نہیں ہو سکتی تھی نا۔ فیس ٹو فیس ہی کرنی تھی۔" چلتے چلتے دونوں اس قریبی ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے جو بلڈنگ کے تقریباً پڑوس میں ہی تھا۔

"اب کہو۔" ریسٹورنٹ کے یخ بستہ ماحول میں بیٹھ کر زنیرہ کو سکون ملا تو لہجہ بھی خود بخود نرم ہو گیا۔

"تم پہلے لنچ کرلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بات سن کر تمہاری بھوک پیاس ہی ختم ہو جائے۔" شہریار نے سنجیدگی سے کہا اور ویٹر کو آرڈر دینے لگا۔

"اوفوہ، ایک تو تم اور تمہارے سسپنس۔" زنیرہ پھر جھنجلا گئی۔ ویٹر نے مطلوبہ مشروبات و ماکولات لاکر میز پر رکھ دیے تھے۔

زنیرہ کو زبردست بھوک لگی تھی۔ وہ ہر شے سے پورا پورا انصاف کر رہی تھی مگر شہریار خلاف توقع دھیرے دھیرے کھاتا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا۔ تمہاری بھوک پیاس کیوں اڑ گئی ہے؟'' زنیرہ نے بغور شہریار کو دیکھا۔

وہ پتہ نہیں قریب قریب ختم کر چکی تھی اور شہریار کے سامنے ابھی آدھے سے بھی زیادہ کھانا ہوا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' شہریار چونک اٹھا۔

''دیکھو، میرا لنچ آور ختم ہونے والا ہے۔ مجھے اپنی سیٹ پر حاضر ہونا ہے۔'' زنیرہ کا صبر اور ضبط جواب دے گیا۔

''یہ بتاؤ، تم زید حارث کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ جو تم نے اپنی زندگی کے متعلق اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟'' شہریار نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کی۔

''وہ سب جانتی ہوں جو اس نے بتایا ہے۔''

''کیا اس نے تمہیں یہ بتایا کہ اس کی ایکس وائف نے اس کے خلاف عدالت میں کیس کیا ہوا ہے۔ خلع کا اور جائیداد کا اور بیٹی کی کسٹڈی کا؟'' شہریار نے اپنی دانست میں بہت پرابم بلاسٹ کیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر زنیرہ کا چہرہ کسی بھی طرح کی حیرت یا صدمے سے پاک تھا۔

''مجھے معلوم ہے، زید نے اپنی فرسٹ میرج کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ شادی نہیں تھی اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔''

''اور تم؟ تم جو کرنے جا رہی ہو۔ وہ شادی ہوگی یا تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی؟'' زنیرہ کے حمایتی لہجے پر شہریار کا پارہ چڑھ گیا۔

''دعا نہیں دے سکتے تو بد دعا بھی مت دو۔'' زنیرہ کے چہرے سے ناگواری چھلک اٹھی۔

''میں تمہیں کبھی بد دعا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو، مجھے تمہاری فکر ہے۔ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے..... میں نہیں چاہتا کہ کوئی غلط فیصلہ کر کے تم پریشان یا کسی دکھ میں مبتلا ہو۔''

شہریار نے دھیمے لہجے میں سمجھایا۔ زنیرہ خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''وہ بہت دولت مند ہے، ہمارے سارے مسائل کا حل اسی کنجی میں ہے پھر وہ بہت عزت اور محبت کے ساتھ مجھے اپنانے کو تیار ہے۔''

''اگرچہ تمہارے ان دلائل سے مجھے بالکل بھی اتفاق نہیں مگر چونکہ تم فیصلہ کر چکی ہو۔ اس لیے کسی کی بھی کوئی بات، کوئی دلیل تم پر اثر نہیں کرے گی اور..... اس فیصلے کی ایک وجہ اور ہے جو تم نے نہیں بتائی۔''

''کیا وجہ؟'' زنیرہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھا۔

''تم عفان اور اس کی فیملی کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں نا، انہیں جتانا چاہتی ہو کہ.....'' شہریار کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' زنیرہ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آخر یہ شخص میرے اتنے اندر تک کیسے جھانک لیتا ہے؟'' رات گئے تک وہ سوچ سوچ کر جھنجلاتی رہی۔ شہریار نے جو کچھ تجزیہ کیا، وہ ٹھیک ہی تھا۔ زنیرہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

''ہاں، یہ سچ ہے مجھے عفان سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ کچی عمر جس میں کسی کا نام اپنے نام کے ساتھ جڑ جائے تو وہ نام، وہ فرد خود بخود پیارا لگنے لگتا ہے پھر اس سے رشتہ بھی قریبی تھا۔'' زنیرہ نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ حالات بدل سکتے ہیں۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو سکتا ہے۔ خواب، ارادے، خواہش سب ملیامیٹ ہو سکتے ہیں اور جو ہوا، سو ہوا مگر زنیرہ کی انا پر کاری ضرب لگی تھی یا دل کی چوٹ تھی جو برداشت نہ ہوئی۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جو کچھ بھی ہوا وہ ان کی کمسپری اور غربت کا نتیجہ ہے۔

قسمت پر معاملات ڈال دینے سے اور تقدیر کو ذمہ دار ٹھہرانے سے انسان بہت سی الجھنوں اور بے سروپا خیالات اور ان گنت سوالوں سے بچ جاتا ہے پھر نہ تو انتقامی جذبات ابھرتے ہیں دل میں، نہ ہی خدا سے یا بندوں سے شکوے شکایت اور گلے ہوتے

رات گئے تک وہ جاگتی رہی۔ سوچتی رہی۔ بہت سوچنے پر بھی ایک ہی خیال سب پر حاوی رہا۔ وہ جو شہریار نے کہا تھا، عفان کو اور اس کی فیملی کو نیچا دکھانا تھا، انہیں جتانا تھا کہ وہ بھی کچھ ہے۔ وہ زنیرہ احمد خان کوئی حیثیت، کوئی وقعت رکھتی ہے۔ وہ اتنی گری پڑی نہیں ہے کہ اگر اسے مسترد کر دیا جائے، ٹھکرا دیا جائے تو وہ مٹی ہو جائے اور خاک میں مل جائے۔ آنکھیں موندتے ہوئے اس نے سوچا۔

مجھے جینا آتا ہے اور زندگی میں میرے لیے بہت کچھ ہے جو بہت اعلا اور بہت شان دار ہے۔

☆☆☆

رات دیر سے سونے کے باوجود بھی صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی۔ کچھ دیر وہ کسلمندی کے ساتھ بستر پر پڑی رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ بلائنڈز ہٹائے تو کمرہ روشنی اور ہوا سے بھر گیا۔ سامنے سے نظر آتا منظر بہت خوب صورت تھا۔ ہرا بھرا لان سبز گھاس، رنگ برنگے پھولوں اور پودوں سے سجا ہوا تھا۔ اونچے اونچے درخت اپنی گھنی شاخوں کے ساتھ ہوا میں جھوم رہے تھے۔

زنیرہ نے آنکھیں بند کر کے سانس اندر کھینچی۔ سکون اطمینان اور تازگی کی لہریں اس کے اندر تک اتر کر اسے شانت کر گئیں۔

''شکر ہے کہ یہ نیا گھر اچھا مل گیا۔ رینٹ بھی مناسب ہے۔ اب زید کے پیرنٹس کو یہاں بلایا جا سکتا ہے۔'' رنگ برنگے پھولوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ باقی والوں کو بلانا ہو تو گھر کے دروازے اونچے کروانے پڑتے ہیں۔ اسے ایک پرانی کہاوت یاد آئی۔

آج شام میں زید کے والدین آ رہے تھے۔ زنیرہ نے آج کے دن کے لیے بہت خوب صورت جوڑا منتخب کیا تھا۔ اپنی اور گھر کی آرائش میں ہی خصوصی دلچسپی نہیں لی تھی بلکہ امی اریبہ اور ہانیہ کو بھی خصوصی ہدایات جاری کی تھیں۔

حیرت انگیز طور پر مہمان وقت کے پابند تھے۔ شام پانچ بجے مسٹر اینڈ مسز حارث ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے زنیرہ کی امی سے گفتگو کر رہے تھے۔ محتاط لب و لہجہ، نپی تلی گفتگو، کچھ دیر امی سے کچھ دیر زنیرہ سے باتیں ہوتی رہیں۔

''زید شروع سے ہی جلد باز ہیں۔ پہلے اہل (پہلی بیوی) سے شادی کرنے کی جلدی تھی پھر چھوڑنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ اب زنیرہ کے معاملے میں بھی یہی حال ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ پہلے اہل کا معاملہ پورے طریقے سے نمٹ جائے پھر یہ نیا سلسلہ شروع کیا جائے۔ عدالت سے ابھی تک تو صرف ڈیٹس ملتی رہتی ہیں، فیصلہ ہونے میں چند ماہ لگیں گے۔ آپ لوگ ویٹ کر لیں گے تب تک؟''

بیگم حارث کے سوال پر امی گڑبڑا سی گئیں۔ ایک تو انہیں پہلے ہی زنیرہ کی یہ خواہش یا مرضی بہت نامناسب لگ رہی تھی۔ جانے کس مزاج کا شخص ہو۔ پہلی شادی ناکام ہو گئی ہے۔ ان کی تشویش اور فکر فطری تھی، اپنی جگہ بجا تھی مگر زنیرہ کے لیے یہ سب باتیں اتنی پریشان کن نہیں تھیں۔

''دنیا میں بہت سے افراد کی دوسری شادیاں ہوتی ہیں امی! اور بہت کامیاب ہوتی ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ریلیکس رہیں۔''

زنیرہ کے سمجھانے اور دلائل دینے پر بھی وہ زیادہ خوش اور مطمئن نہیں تھیں۔ پھر مہمانوں کی گفتگو سے وہ اور پزل ہو گئیں۔

''اللہ مالک ہے۔'' ایک گہری سانس لے کر انہوں نے بیگم حارث کو جواب دیا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد بھی وہ متفکر نظر آ رہی تھیں۔

☆☆☆

گل کی شادی کا کارڈ آیا تھا۔ مایوں سے ولیمے تک ہر تقریب میں مدعو کیا تھا۔ شہریار کو بھی بلایا تھا۔ گل خود آئی تھی کارڈ دینے اور زنیرہ سے ڈھیروں باتیں کر کے گئی تھی۔

بارات والے دن شہریار بھی امی اور دادی جان

لوٹے کر آیا تھا۔ گل نے اصرار کیا تھا انہیں ساتھ لانے کے لیے اور زنیرہ کو بھی امی بہنوں کو ساتھ لانے کی تاکید کی تھی۔

''یار! یہ جو بزرگ ہوتے ہیں نا۔ ایسے موقعوں پہ ان کی موجودگی اور دعائیں بہت ضروری ہوتی ہیں۔ اس لیے انہیں ضروری لانا۔''

گل نے شہریار اور زنیرہ دونوں سے فرمائش کی تھی اور دونوں نے ہی اپنی اچھی دوست کی یہ فرمائش پوری کردی تھی۔ امی تو اپنی پڑوسنوں کی کمپنی میں خوشی خوشی بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔

''ارے سنا ہے کہ زنیرہ کا رشتہ ہورہا ہے عفان کے سالے سے۔'' دادی نے ناک پر اپنی عینک ٹھیک کرتے ہوئے امی سے سوال کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر آگے شروع ہوگئیں۔

''اے وہ تمہاری نند، بڑے فخر سے بیاہ کیا تھا بیٹے کا۔ وہ دونوں میاں بیوی تو الگ بنگلے میں شفٹ ہوگئے، جو جہیز میں ملا تھا کہاں تو اپنی بیٹی سمدھیانے میں دینے کو تیار تھیں۔ اب دال نہیں گلی تو ہزاروں کیڑے نکال دیے ان میں۔ بیٹی کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہے۔ کوئی سمدھیانے کی ٹکر کا۔ خدا جانے کیا دماغ ہوگیا ہے اس عورت کا، ہر ایک سے مقابلے بازی پر اتر آئی ہے۔ اب سمدھیانے کو نیچا دکھانے کے چکر میں ہے۔''

دادی بولنے پر آئیں تو بولتی ہی چلی گئیں اور اپنا سوال تو بھول ہی گئیں جس کا جواب دینے کے لیے امی بار بار اپنا منہ کھولتیں اور دادی کی نان اسٹاپ باتوں سے گھبرا کر پھر سے بند کرلیتیں۔

زنیرہ کو شہریار نظر آیا تو اس سے حال احوال دریافت کرنے لگی مگر شہریار کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

''تمہیں کیا کسی کی خیر خیریت سے۔ تم تو اپنے حال میں مست ہو، رہو مست۔''

''اتنی بار تمہیں کال کی، فون آف ہوتا ہے تمہارا۔'' زنیرہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

شہریار اور اس کی فیملی بچپن سے ہی اس کے کے خلوص اور محبت پر اسے کبھی شک وشبہ نہ تھا۔ اور شہریار کا مزاج تو بچوں والا تھا، جتنی جلدی ناراض ہوتا۔ اتنی ہی جلدی مان بھی جاتا تھا۔ مگر اس بار اس کی ناراضی ذرا سخت اور طویل تھی کہ اب معاملہ دل کا تھا۔ دل لگی کا نہیں۔

''فضول لوگوں کے لیے میں نے اپنا فون آف کردیا۔'' وہ بدستور روٹھے روٹھے لہجے میں بولا۔

''میں فضول ہوں؟'' زنیرہ نے آنکھیں پھاڑ کر کسی قدر صدمے اور دکھ سے دیکھا۔

''فضول حرکتیں کروگی تو فضول ہی کہلاؤ گی۔ اور بات سنو کان کھول کے۔ میں بھی کوئی مرا نہیں جارہا کسی کے عشق میں۔ میری امی میرے لیے لڑکی دیکھ رہی ہیں۔ جیسے ہی کوئی پسند آئی، تمہیں مٹھائی کھلادیں گے ہم۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ دیکھو، میں تو تمہاری خوشی میں بہت خوش ہوں گی مگر تم میری خوشی میں خوش نہیں ہو۔'' زنیرہ نے شکوہ کیا۔

''تمہاری حماقت پر کیسے خوشی کا اظہار کروں؟''

''اچھا بھئی، اگر حماقت بھی ہوئی تو بے فکر رہو۔ لوٹ کر تم سے کچھ نہیں مانگوں گی نہ مدد نہ ہی.....'' زنیرہ نے بولتے بولتے ہونٹ بھینچ لیے۔

''تم کتنی لڑاکا ہوگئی ہو؟ پہلے تو ایسی نہ تھیں۔''

''تم بھی پہلے ایسے نہیں تھے۔ بات بات پر ناراض ہونے والے، ڈانٹنے والے۔''

''اچھا، تو ہم دونوں ہی بدل گئے ہیں؟ ویری گڈ!'' شہریار کو ہنسی آگئی۔

''کہیں آئے نہ آئے۔ ہم دونوں میں تبدیلی آگئی ہے۔'' زنیرہ بھی مسکرادی۔

☆☆☆

ہموار سڑک پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے زنیرہ نے عقبی آئینے میں پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کا جائزہ لیا۔ پھر آگے کی جانب دیکھنے لگی۔ ٹریفک کا سیلاب سڑک پر رواں دواں تھا۔ وہ بھی اس سیلاب کا

سگنل پہ گاڑی رکی تو عادت کے مطابق ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سڑک کے پار درخت کی چھاؤں میں دو افراد لیٹے تھے۔ ایک مرد، ایک بچہ، مشکل سے سات آٹھ سال کا۔ بوسیدہ میلے لباس، چہروں پہ غربت، کسمپرسی اور تھکن کی تحریریں تھیں۔ اینٹوں کو تکیہ بنائے وہ اردگرد کے شور سے بے خبر اور بے نیاز آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔

زنیرہ ان دونوں کو دیکھنے میں اتنی محو ہوئی کہ اسے سگنل کی بتی کے سبز ہونے کا علم بھی نہیں ہوا۔ پیچھے سے گاڑیوں نے ہارن دیے تو وہ ایک دم چونکی اور جلدی سے گاڑی آگے بڑھائی۔ گھر پہنچ کر وہ نہا دھو کر فریش ہوئی، لباس تبدیل کر کے کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹی مگر وہ منظر اس کے ذہن سے جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ خصوصاً اینٹ پر سر رکھے وہ چھوٹا سا بچہ۔

''کیا ہوگیا ہے مجھے؟'' کھانا کھاتے کھاتے اس نے اپنا سر جھٹکا۔

''کیا ہوا، پریشان کیوں ہو؟'' امی نے اس کا چہرہ دیکھا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

''کچھ نہیں امی!'' زنیرہ نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر طاری کی اور پلیٹ میں سلاد ڈالنے لگی۔

''آپ کی آنکھوں کے نیچے بہت ڈارک سرکل ہو رہے ہیں۔'' ہانیہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا اور تبصرہ کیا۔

''نیند پوری نہیں ہوتی۔ پھر تھکن، کیا کروں میں ان کا؟''

''اپنا خیال رکھو، کیوں جاگتی رہتی ہو رات گئے تک۔ اوپر سے تمہاری نوکریاں، کتنے کام پکڑ رکھے ہیں۔ کبھی کہیں مصروف ہوتی ہو، کبھی کہیں بزی۔ صحت کا بھی تو دھیان رکھو۔ اور یہ کام کا بوجھ کم کر دو خود پر سے، کیا ضرورت ہے اتنی زیادہ محنت کرنے کی۔ چہرہ دیکھو اپنا، کیا سے کیا ہوگئی ہو۔'' امی نے بیٹی کو جو ''گاڑی کی انسٹالمنٹس بھرنی ہیں امی، کام کرنا ضروری ہے۔''

زنیرہ کی آواز میں بھی تھکن اتر آئی تھی۔ اب وہ کیا بتاتی۔ بات صرف گاڑی کی قسطیں بھرنے کی نہیں تھی۔ بس اسے خود کو مصروف رکھنا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوگیا تھا اسے، دن بھر کی محنت اور تھکن کے باوجود رات جب سونے کے لیے لیٹتی تو نیند روٹھی ہوئی ہوتی۔

کئی ہفتوں سے یہی صورت حال تھی۔ آدھی سے زیادہ رات گزر جاتی اور وہ بستر پر کروٹیں ہی بدلتی رہ جاتی۔ ڈاکٹر کے پاس بھی چلی گئی۔ اپنا مسئلہ بیان کیا۔ ڈاکٹر نے ڈپریشن، ٹینشن، جیسی اصطلاحات استعمال کر کے میڈیسن لکھ دی تھیں۔

اسے ہر قسم کی پریشانیوں، الجھنوں اور فکروں سے دور رہ کر پرسکون اور خوش رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور یہ مشورہ تو بھاری فیس لیے بغیر زنیرہ کے دماغ نے بھی دیا تھا مگر بات تو عمل کی تھی۔ وہ خود بھی خوش رہنا چاہتی تھی۔ مطمئن اور پرسکون رہنا چاہتی تھی اور اسے ان سب کے مواقع بھی میسر تھے۔ کوئی کمی تو نہیں تھی زندگی میں۔ نہ ہی کوئی خاص پریشانی جو وہ چاہتی تھی۔ سوچتی تھی۔

وہ سب بالآخر مل ہی گیا تھا یا ملنے والا تھا۔ اس کی زندگی میں زید حارث تھا جو آئندہ زندگی میں سنہرے تابناک مستقبل کی علامت تھا اپنی فیملی کے لیے جو اسے پریشانیاں لاحق تھیں۔ وہ بھی بہت حد تک کم ہو چکی تھیں۔

امی کی صحت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ حماد کی طرف سے فکریں اس کی خود ساختہ تھیں۔ ورنہ وہ باقاعدگی سے پیسے بھی بھیج رہا تھا اور زنیرہ کی شادی پر آنے کا پکا وعدہ بھی کیا تھا۔ ہانیہ اور اریبہ اپنی تعلیم میں مشغول اور مگن تھیں۔ پھر اسے کیا پریشانی تھی؟

وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی مگر کوئی سرا تھا کہ مل کے نہیں دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیاں بھی

کچھ دنوں کے بعد بے اثر ہوگئی تھی۔ ان سب کو گھر پر دیکھ کر اس کی خوشی میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ اندر سے موبائل اٹھالائی اور تصویریں دکھانے لگی۔

دورانیہ بڑھتا جارہا تھا۔ سکون اور اطمینان جیسے زندگی سے دھیرے دھیرے رخصت ہورہا تھا۔ اب تو کچھ روز سے اس نے سلیپنگ پلز لینا شروع کردی تھیں۔ کسی طور پر نیند تو آئے۔

رات میں لیٹنے سے قبل حسب معمول کلینزنگ کرتے ہوئے اس نے آئینے میں بغور اپنا جائزہ لیا۔ ہانیہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کتنا زرد بے رونق اور مرجھایا ہوا ہورہا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اس وقت نمایاں لگ رہے تھے۔

''پتا نہیں کیا ہوتا جارہا ہے مجھے؟'' زنیرہ نے پریشان ہوکر سوچا۔ ''کیا میں کسی بیماری کا شکار ہورہی ہوں؟'' خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ خوف زدہ ہوگئی۔

☆☆☆

جانے پہچانے راستوں پر سفر کرکے جب وہ لوگ منزل مقصود پر پہنچے تو گیٹ کھلنے پر وہی مانوس چہرے اور دیکھا ہوا منظر ایک بار پھر سامنے تھا۔ ملکہ دادی تخت پر گاؤ تکیہ سنبھالے بیٹھی تھیں۔ افشین ان کے سر میں مہندی لگا رہی تھی بلکہ تقریباً لگا ہی چکی تھی۔ آنٹی تخت کے کنارے بیٹھی دال چن رہی تھیں۔ شہریار قریبی پلنگ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔

''کتنا خوش نصیب ہے یہ شخص۔ اس کی اور اس کی نیند کی راہ میں کچھ بھی حائل نہیں۔ نہ کوئی رکاوٹ نہ کوئی فکر۔''

زنیرہ نے بے حد رشک کے ساتھ پلنگ پر سوئے شہریار کو دیکھا۔

افشین کا رشتہ طے ہوگیا تھا۔ اس کی امی اور دادی، زنیرہ کے گھر آئی تھیں مٹھائی دینے اور اب وہ سب افشین کو مبارک باد دینے آئے تھے۔ امی تو خیر گاہے بگاہے آتی ہی رہتی تھیں۔ پڑوس میں واقع اپنے گھر کا کرایہ وصول کرنے بھی اور گھر کی حالت بھی دیکھنے کہ کرایہ داروں نے اس کا کیا حال کیا ہے۔ دادی اور ان کی بہو مہمانوں کو دیکھ کر بہت نہال ہوئی تھی۔ ان سب کو گھر پر دیکھ کر اس کی خوشی میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ اندر سے موبائل اٹھالائی اور تصویریں دکھانے لگی۔

امی نے نصیب اچھے ہونے اور خوش وخرم رہنے کی دعا کی۔ بڑے اپنی باتوں میں مگن تھے اور لڑکیاں دلچسپی سے تصاویر دیکھتے ہوئے تبصرے کررہی تھیں۔

ہنستے مسکراتے اور بولتے بولتے زنیرہ کی نظر ایک بار پھر شہریار پر پڑی۔ جانے کیوں اسے اینٹ پر سر رکھے سوتا ہوا وہ بچہ یاد آگیا۔ یہ بھی زندگی ہے یا زندگی کا ایک رخ؟ اس کا مسکراتا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔

''آج تو آپ سب کھانا کھا کر جائیں گے۔'' شگفتہ بھابھی نے دال چنتے چنتے اعلان کیا۔ ''ہر بار بہانا بنادیتی ہیں کہ بچیاں گھر پر اکیلی ہیں۔ آج تو سب یہیں ہیں۔ اب کوئی بہانا نہیں چلے گا۔''

''آج گھر اکیلا ہے؟'' اریبہ مسکرائی۔

''ہونے دو، کبھی کبھار گھر کو بھی اکیلا چھوڑ دینا چاہیے۔''

''گھر ہے، کوئی دل نہیں۔'' شہریار کی آنکھ کھل گئی تھی۔ لیٹا ہوا سب کی باتیں سن رہا تھا۔ لقمہ دیتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''آئے ہائے ناحق بچے کو سوتے سے اٹھادیا۔'' امی کو تاسف ہونے لگا۔

''اچھا اٹھ گیا۔ میں ویسے بھی اٹھادیتی۔ چلو شہریار اذرا اندر آؤ۔'' شگفتہ بھابھی اندر جاتے جاتے بولیں۔

''ارے اس لڑکی کو کیا ہوگیا۔ کیسا کھلا کھلا رنگ روپ تھا۔ آدھا بھی نہیں رہا۔'' ملکہ دادی نے اب زنیرہ کو غور سے دیکھا تھا۔

''اللہ جانے کیا ہے۔ دنیا جہاں کی پریشانیاں بس ایک اسے ہی لگ گئی ہیں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی فکر اپنے سر پر سوار رکھتی ہے۔'' زنیرہ کے کچھ کہنے سے پہلے امی بول اٹھیں۔

''کیوں بیٹا، کیا بوجھ لادلیا ہے اپنے سر پر؟''

معاملات میں ٹینشن ہو جاتی ہے کبھی۔" زنیرہ نے بہانا بنایا۔

"زیادہ نہ سوچا کرو۔ جو بھی معاملات ہیں اللہ کے حوالے کردو۔ زندگی میں سکون ہی سکون ہوگا پھر۔" دادی نے نصیحت کی۔

"جی!" زنیرہ نے ان کی نصیحت پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس قسم کی باتیں امی بھی کرتی تھیں اور شہریار بھی۔

دادی اور امی آپس میں گفتگو کرنے لگیں۔ زنیرہ، اریبہ اور ہانیہ، افشین سے رشتہ طے ہونے کی تفصیلات سننے لگیں۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سے پورا صحن بھر گیا۔ مانوس آوازیں، مانوس مناظر، سب کچھ وہی تھا۔ جنہیں لاشعوری طور پر زنیرہ مس کرتی تھی مگر شاید اسے ابھی تک اس بات کا ادراک نہیں ہوسکا تھا۔ عفان کو نیچا دکھانے کی دھن میں اس نے فراموش کردیا تھا آخر اس کا اپنا دل چاہتا کیا ہے۔

"چلو بچو، مغرب ہونے والی ہے، اب اندر آجاؤ۔" ملکہ دادی نے تخت سے نیچے اترتے ہوئے اعلان کیا۔ اندر یخنی پکنے کی زبردست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"ہمیں علم ہی نہیں ہوتا۔ ہم اندر ہی اندر کن چیزوں کے، کن باتوں کے، کن خوشبوؤں، کن ذائقوں اور کن لوگوں کے عادی ہوتے ہیں؟"

زنیرہ نے ملکہ دادی کو دیکھا جو وضو کرکے آئی تھیں اور نماز کے لیے دوپٹا اوڑھ رہی تھیں۔

یخنی پلاؤ دم پر تھا۔ شامی کباب تلنے کی مہک فضا میں پھیل رہی تھی۔ کوفتوں کا سالن، سلاد اور رائتہ تیار تھے۔ کھانا لگانے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ افشین ایک بار پھر موبائل لے کر بیٹھ گئی۔

"ایک چیز دکھاؤں؟" اس نے تینوں سہیلیوں کو مخاطب کیا۔

"سب سے خاص "چیز" کی پکس تو دکھا چکی ہو۔ اب کیا دکھاؤ گی۔" اریبہ نے شوخی سے کہا۔

"ایک خاص چیز اور بھی ہے۔ یہ دیکھو۔" افشین نے اسکرین سب کے سامنے کی۔ ایک پیاری سی لڑکی کی تصویر جگمگا رہی تھی۔

"شہریار بھائی کے لیے کسی نے بتائی ہے۔ ویسے تو تین لڑکیاں اور بھی ہیں۔ عذرا آنٹی (رشتہ کرانے والی) نے دکھائی ہیں۔ یہ دیکھو۔" افشین نے یکے بعد دیگرے تین تصاویر اور دکھائیں۔

"یہ بھی اچھی ہیں مگر ہمیں یمنیٰ سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔ دیکھو، پیاری ہے نا؟"

"ہاں نا، بہت پیاری ہیں۔ آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں اور بال کتنے لمبے، یہ اصلی ہیں؟" اریبہ اور ہانیہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

"پتا نہیں، ابھی تو صرف تصویر ہی دیکھی ہے۔ رئیل میں دیکھیں گے تو پتا چلے گا۔ اصلی ہیں یا نقلی؟" افشین نے کندھے اچکائے۔

"کب جاؤ گے تم لوگ وہاں؟" سوال زنیرہ کی طرف سے آیا تھا۔

"یہ تو ابو امی ڈیسائڈ کریں گے۔" افشین لاپروائی سے کہتے ہوئے دوبارہ موبائل کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"اور کبھی سب کچھ کتنا بے معنی سا لگتا ہے۔ بے مقصد اور بے وقعت۔" زنیرہ نے دل گرفتی سے سوچا۔ یہ شام اور سب کا ساتھ جو اسے بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ یکا یک ہی جیسے اداسی کے رنگ اس میں گھل مل گئے تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے لذت بخش یخنی پلاؤ، کرارے اور چٹ پٹے شامی کباب، بادامی گریوی کی ملائی کوفتوں کی ڈش۔ اس نے سب کچھ چکھا مگر سارے ذائقے جیسے کھو چکے تھے۔

جب زندگی سے پسندیدہ چیزوں کا لطف اور مزا ہوتے ہوئے بھی غائب ہوجائے۔ کچھ محسوس نہ ہو تو زندگی کا سارا حسن، ساری خوب صورتی ختم ہوجاتی ہے۔ رات سونے کے لیے بیڈ پر لیٹی تو خیالات کی

بھر مارکی جو لب سے اس نے ساتھ کی۔

زنیرہ نے اپنے کمرے کی فرنچ ونڈو سے پردے ہٹائے۔ سرسبز لان، درخت، پودے پھول، روشنی میں نہائے کھڑے تھے۔ کچھ دیر وہ انہیں دیکھتی رہی، پھر پلٹ کر واپس وارڈروب کی طرف آئی۔

اس کی اندرونی دراز کھول کر ایک مخملیں ڈبیہ نکالی۔ اور اس میں موجود ڈائمنڈ رنگ کو نکالا، یہ انگوٹھی زید نے دی تھی۔

''ابھی اس کی کیا ضرورت ہے؟'' زنیرہ اس رنگ کو لینے میں ہچکچائی تھی۔

''یہ انگیج منٹ رنگ میں نے تمہارے لیے خریدی ہے۔ میرے کیس کا فیصلہ ہو جائے گا اگلے تین سے چار ماہ میں۔ پھر یہ رنگ میں خود پہناؤں گا۔ جب تک میری امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔''

زنیرہ نے وہ رنگ لے لی تھی۔ کبھی اس کا خواب تھا ایسی قیمتی انگوٹھی اور ایسا فرد۔ محبت سے دینے والا، سو یہ خواب پورا ہو گیا۔ پھر اب؟ اب کیا مشکل تھی؟

ہم پتھروں سے پیار کرتے ہیں۔ دھاتوں سے محبت کرتے ہیں یا پھر انسانوں سے؟ چمکتے ہوئے ہیروں کو دیکھ کر زنیرہ نے سوچا اسی وقت موبائل بجنے لگا۔

''ہیلو۔'' زنیرہ نے بغیر دیکھے ہی کال اٹینڈ کی۔ اس وقت زید ہی تھا جو اسے فون کرتا تھا۔ وہ بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر دو ہفتوں کے لیے گیا تھا۔ اور اب تین روز بعد اس کی واپسی تھی۔

ابتدائی چند منٹ ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کرنے میں لگے۔

''میری بات ہوئی تھی۔ حمید صاحب (وکیل) سے ان کا کہنا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو ماہ لگیں گے۔''

''کس چیز میں؟'' زنیرہ نے غائب دماغی سے سوال کیا۔

''کیس کا فیصلہ آنے میں۔''

''اوہ اچھا!'' زنیرہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟''

''مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے میری اجازت کی ضرورت نہیں، بلا جھجک سوال کرو۔'' زید کا لہجہ بہت مہربان تھا۔

''آپ کے اور آپ کی مسز کے درمیان سپریشن کیوں ہوئی؟''

''اس کی ڈیمانڈز بہت تھیں مجھ سے اور میں نے وہ سب ڈیمانڈز پوری کیں جو ایک بیوی ڈیزرو کرتی ہے۔ مگر میں ملینز کی پراپرٹی اس کے نام نہیں کر سکتا۔ وہ لالچی اور بدنیت عورت ہے۔''

''ہو سکتا ہے مجھے بھی کوئی لالچ ہو آپ سے؟''

''ہاہاہا.....'' زید بے اختیار ہنسا تھا۔ ''میں نے تھوڑی بہت دنیا دیکھ رکھی ہے۔ اچھی خاصی تعداد میں صنف نازک سے واسطہ پڑا ہے۔ اتنا تو پہچان لیتا ہوں کون لالچی و چالاک ہے۔ کون سادہ و معصوم!''

''اسے کیوں نہ پہچان سکے؟''

''تھوڑا بہت جانتا تو تھا اس کی فطرت کو، ممی اور پاپا نے بھی منع کیا تھا مگر یو نو، لو از بلائنڈ۔'' زید نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''اور اس بار بھی آپ کی آنکھیں بند ہیں شاید۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں بھی تو ایک لالچ اور مقصد کے تحت آپ کی طرف بڑھی تھی۔ اپنے ایکس فیانسی کو نیچا دکھانے کے لیے اسے جتانے کے لیے اور.....''

''عفان کو؟''

''آپ کو کیسے معلوم؟'' زنیرہ دنگ رہ گئی۔

''ہم وہاں اپنی بہن دے رہے تھے تو انویسٹی گیشن نہیں کرتے؟ مجھے سب معلوم ہے کہ انہوں نے تم سے رشتہ ختم کر کے ہم سے رشتہ جوڑا تھا۔ مگر زنیرہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی معاملے میں لالچی یا غرض مند ضرور ہوتا ہے۔ انہیں جہیز کے بنگلے اور گاڑی کا لالچ تھا تو

جن کی بڑھتی ہوئی عمر، عام سی شکل وصورت اور غیر معمولی تیز مزاجی نے ان کی شادی میں رکاوٹیں ڈال رکھی تھیں۔ عفان اور اس کی فیملی آپی سے دب کر رہتے ہیں۔ آپی کا مزاج بس ایسا ہی ہے۔ ہمیں عفان جیسا رشتہ چاہیے تھا سو ہماری بھی خواہش پوری ہوگئی اور ان کی بھی۔''

''خواہشیں پوری ہوجائیں اور پھر بھی انسان خوش نہ ہو پرسکون اور مطمئن نہ ہو، اس کا کیا مطلب ہے؟'' زنیرہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے کہ انسان کو کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔''

زید نے مذاق کیا تھا یا سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔ زنیرہ بہرحال سائیکاٹرسٹ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ نبیلہ صفدر مہربان لہجے والی پرکشش شخصیت کی مالک تھیں۔ اس نے زنیرہ کی تمام باتیں بلکہ مسائل غور سے سنے۔

''اب تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ، بچپن کی پہلی یاد سے لے کر آج کے اس لمحے تک جو کچھ بھی یاد آجاتا ہے۔ تفصیل سے بتاؤ، گھر پر بھی جو باتیں اور جو لوگ یاد آئیں ان تمام باتوں کو ریکارڈ کرکے مجھے سناؤ۔''

ہفتے میں دو بار نبیلہ صفدر کے ساتھ اس کا سیشن ہوتا تھا۔ تقریباً تین ماہ زنیرہ اس کے پاس گئی۔ اور وہ سب کچھ بیان کرتی رہی جو اسے یاد آتا گیا اور وہ بھی جو وہ سوچتی تھی۔

☆☆☆

پرانے کرایہ داروں نے گھر خالی کردیا تھا۔ دو تین فیملیز نے رابطہ کیا تھا ابھی کسی کو جواب نہیں دیا تھا۔

''پھر بتاؤ، کسے دیں گھر؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ اپنا گھر کرایہ پر دینا بھی ایسا ہوگیا جیسے بیٹی کا رشتہ دینا۔ سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر دینا پڑتا ہے۔'' امی بڑبڑائیں تو اریبہ اور ہانیہ کی ہنسی زوردار

پھولوں کے گچ پر کی۔ وہ مسکرا کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ جو اپنی زندگی کے فیصلہ کن مرحلے میں تھی۔

ہینڈز فری کانوں میں لگائے وہ اپنی آڈیو ریکارڈنگ سن رہی تھی۔ سماعتوں تک پہنچتی اس کی اپنی آواز ابتدا میں اجنبی سی محسوس ہوئی پھر دھیرے دھیرے سب کچھ مانوس ہوتا چلا گیا۔ آواز بھی الفاظ بھی میرا بچپن ایسا ہی تھا جیسا کہ عموماً مڈل کلاس گھرانوں میں بچوں کا ہوتا ہے۔ کھیل کود اور شرارتوں سے عبارت، دادا، دادی کا لاڈ امی، ابو کا پیار، بہن بھائیوں کا ساتھ۔ ہم جولیوں کی سنگت پھر میں بڑی ہوتی گئی۔ اسکول، پھر کالج، معروف، پرسکون دوپہریں۔ سوئی سوئی سہ پہر، ہنگامہ خیز شامیں۔ اجالا سی راتیں۔

وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار اور ردھم کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ پھر یکا یک ہی جیسے سارا منظر نامہ بدل گیا۔ یکے بعد دیگرے دادا، دادی اور پھر ابو پہلے یہ لوگ دنیا سے رخصت ہوئے۔ حماد ملک سے باہر چلا گیا۔ پھوپھو اور عفان نے آنکھیں بدل لیں۔ ان سب حالات واقعات میں میرے دل کو بھی تکلیف پہنچی اور میری انا کو بھی ٹھیس لگی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب زید حارث نے مجھ میں دلچسپی دکھائی اور میری جانب پیش قدمی کی تو میں نے اسے ویلکم کیا۔

اس وقت میرے دل و دماغ میں بس یہی تھا کہ کسی طرح پھپھو اور عفان کو نیچا دکھایا جائے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میرا یہ انداز فکر کوئی صحت مند اور اچھی اخلاقیات نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سوچ اور میرے اندر ڈیولپ ہو رہی تھی کہ دولت کی فراوانی مستحکم اور عالی شان زندگی خوشیوں اور سنہرے مستقبل کے لیے ناگزیر ہے۔

سب کچھ وہی ہوا، ویسے ہی ہوتا چلا گیا جیسا میں نے چاہا اور خواہش کی پھر بھی زندگی بے سکون کیوں ہے؟ اپنا آپ خالی خالی کیوں لگتا ہے؟

مجھ سے، کچھ ہے جو میں بہت مس کرتی ہوں۔ گزرا وقت! گزرے لوگ؟ وہ گھر، درخت، پرندے؟ مہربان چہرے، مانوس لہجے؟ کیا ہے جو گم ہو گیا ہے مجھ سے، کھو گیا ہے میرے اندر سے؟

اور میری زندگی میں ایک شجر سایہ دار بھی ہے ہمارا رشتہ کچھ الگ ہے کچھ عجیب، وہ مہربان ہے پرخلوص ہے اچھے دوست کی مانند، روٹھتا ہے، مانتا ہے بچوں کی طرح، کچھ سمجھاتا ہے تو بڑوں کی طرح، وہ ایک پیارا انسان ہے، اپنا اور میرا راستہ اور دکھ سکھ ایک کرنے کا خواہش مند، مگر میں نے ایک دوسری راہ چن لی اور اس پر چل پڑی۔ مجھے نہیں معلوم، وہ اب بھی وہیں کھڑا میرا منتظر ہے یا پلٹ چکا ہے؟ میں.....''

زنیرہ نے مزید کچھ سننے کا ارادہ ملتوی کیا اور ہینڈز فری اتار دیے۔

''ہم انسان کتنا غیر ضروری بوجھ خود پر لاد لیتے ہیں۔ پھر پریشان ہوتے ہیں۔ آخر ہم ان پرندوں کی طرح ہلکے پھلکے کیوں نہیں ہو جاتے؟''

زنیرہ نے موبائل میں وقت دیکھا۔ زید نے یہی وقت دیا تھا آنے کا اور آج ملاقات کے لیے جگہ کا انتخاب زنیرہ نے کیا تھا۔

نبیلہ صفدر نے اس سے کہا تھا۔

''تم وہ نہیں ہو جو تم نے بننے کی کوشش کی جو راستہ تم نے اختیار کیا، وہ بھی تمہارا نہیں تھا لہٰذا تمہارے اندر سے ریزسٹنس (مزاحمت) ہونے لگی۔ تمہارا اسٹریس، ٹینشن تمہاری بے سکونی اور بے خوابی سب اسی کا نتیجہ ہے۔

تمہیں کیا کرنا ہے۔ کیا چننا ہے۔ اس کا فیصلہ تم خود کرو، اپنے اندر کی آواز سنو، تمہاری اصل طلب تمہاری حقیقی خواہش کیا ہے؟ جو لوگ انتقام کی خواہش کو اپنے اندر زندہ رکھتے ہیں وہ خود اندر سے مر جاتے ہیں۔''

''میں پھر لیٹ ہو گیا۔ آئی ایم سوری۔'' دور

بیٹھتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح پہلے تو معذرت کی پھر بات شروع کی۔

"کانگریجولیشن، آپ کیس جیت گئے۔" زنیرہ نے اس کی جانب نگاہ کی۔

"میں کسی اچھی جگہ تمہارے ساتھ سیلی بریٹ کرنا چاہتا تھا۔ مگر تم نے یہاں بلالیا۔ خیر، ہم کل ساتھ ڈنر کرتے ہیں پھر آگے کی کچھ پلاننگ اور....."

"زید! مجھے کچھ کہنا ہے آپ سے۔"

"کہو۔" زید اپنی خوشی میں مگن تھا۔ اس نے زنیرہ کے غیر معمولی سنجیدہ رویے پر غور نہیں کیا۔

"آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس، میں اسے واپس دینا چاہتی ہوں۔" زنیرا نے وہ ڈائمنڈ رنگ اس کی جانب بڑھائی۔

"یہ کیا؟" حیرانی زید کی آنکھوں میں منجمد ہونے لگی۔

"مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں خود کو بھی دھوکا دے رہی ہوں اور آپ کو بھی۔" زنیرہ کی مختصر بات میں ہی پوری کہانی چھپی ہوئی تھی۔

"میں شرمندہ ہوں، آپ سے معافی چاہتی ہوں، میری وجہ سے معاملات اتنے آگے تک پہنچ گئے۔"

"عجیب لڑکی ہو تم، جانتی ہو، مجھے چھوڑ کر تم کون سی لائف سے محروم ہو رہی ہو؟" زید بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"اور آپ کا ساتھ منتخب کر کے میں کن لوگوں سے محروم ہو رہی ہوں یہ ادراک مجھے اب ہوا ہے۔"

زنیرہ نے سر جھکالیا۔ اس میں جرأت نہیں تھی کہ وہ زید کا سامنا کرتے ہوئے بات کرتی۔

"مجھے یہ لگ رہا ہے کہ شاید تم ایموشنل ہو رہی ہو۔ ریلسٹک بن کر سوچو اور فیصلہ کرو، زندگی فقط خوابوں کے سہارے نہیں گزرتی۔" زید نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کبھی ہمارے خواب ہی ہماری زندگی ہوتے ہیں اور ہمارا سہارا بھی۔ زنیرہ ٹھہری ہوئی۔ کچھ تو ندامت تھی اور یہ بھی تھا کہ وہ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کچھ ہمارے دلائل ہماری ذات کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ دوسرے کو وہ اس طرح متاثر نہیں کرتے جیسے ہمیں کرتے ہیں۔"

"زنیرہ! تم اتنی جلدی مت کرو، کچھ وقت لو اور اچھی طرح سوچ سمجھ لو، یہ رنگ ابھی تم اپنے پاس رکھو، میں نیکسٹ ویک تمہیں کال کروں گا۔ اس سے پہلے تنگ نہیں کروں گا۔ آئی پرامس۔" زید بھی بولتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر واپسی کی راہ پر چل پڑا۔

"مگر....." زنیرہ بوکھلا کر اس کے پیچھے لپکی مگر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس سے دور جا رہا تھا۔

☆☆☆

بہت دیر تک بے مقصد سڑک پر گاڑی دوڑاتی وہ ادھر ادھر جاتی رہی۔ گھر پہنچی تو لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئی صوفے پر پھپھو بڑے ٹھسے سے براجمان تھیں۔ ابراہیم بھائی سنگل صوفے پر بیٹھے موبائل میں مگن تھے۔

سلام دعا اور حال احوال دریافت کر کے بعد زنیرہ فریش ہونے چلی گئی۔

"بڑی دیر لگادی۔ کب سے تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

"فون پر ٹرائی کیا مگر بند جا رہا تھا۔" پھپھو نے شکوہ کیا۔

"فون سائلنٹ موڈ پر تھا۔ نارمل لہجے میں کہتی ہوئی وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب اسے محسوس ہوتا تھا کہ دل ہر قسم کے منفی جذبات اور شکایات سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اسے اب کسی سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔

"مٹھائی دینے آئے تھے ہم، ماہین (بیٹی) کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ کینیڈا میں ہوتی ہے پوری فیملی، شکر پہلی شادی ہے لڑکے کی۔ دوہاجو نہیں ہے۔" پھپھو نے جتانے والے انداز میں بیٹی کو دیکھا۔

تو یہ تھا وہ پتھر جسے مارنے کے لیے انہوں نے

یہاں آنے کی زحمت کی تھی۔ زنیرہ کو غصہ آنا چاہیے تھا مگر جانے کیوں ہنسی آنے لگی۔ دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لیے ہم کتنی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس سے آدھی محنت میں کسی کو خوشی بھی دے سکتے ہیں۔

''بہت مبارک ہو پھوپھو! آپ سب کو۔ اللہ تعالیٰ ماہین کو خوشیاں عطا فرمائے اس کا نصیب اچھا کرے۔'' زنیرہ کا انداز بالکل ہلکہ دادی جیسا تھا۔ وہ بھی اسی طرح دعائیں دیا کرتی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد زنیرہ کو کچھ ادراک ہوا تھا۔ دوسروں کو جتانے اور نیچا دکھانے کی خصلت یا عادت دونوں پھپھو بھتیجی میں مشترک تھی۔ بے رحمی سے اپنا احتساب کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

''شہریار، آیا تھا شام میں۔ وہ بھی یہی شکایت کر رہا تھا کہ تمہارا فون نہیں مل رہا۔'' زنیرہ کھانا کھا رہی تھی جب امی نے اطلاع دی۔

''شادی ہے نا، کارڈ دینے آیا تھا۔'' امی اپنی دھن میں بولتی چلی جا رہی تھیں اور زنیرہ کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں جھلملاتا ہوا نقرئی وسنہری کارڈ کھولا، سامنے ہی شہریار کا نام جگمگا رہا تھا۔ زنیرہ نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔

یہ مت سمجھنا کہ میں کسی کہانی فلم یا ڈرامے کے ہیرو کی طرح ''دی اینڈ'' تک تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔ اتنا مجنوں نہیں ہوں امی کو جیسے ہی کوئی لڑکی پسند آگئی۔ فائنل ہو جائے گی۔''

زنیرہ کو شہریار کے الفاظ یاد آئے۔ اس کی بھوک مر چکی تھی۔ وہ اٹھ گئی۔ اریبہ اور ہانیہ اس کی کیفیت سے بے خبر شادی کی تمام تقاریب میں جانے کی پلاننگ زور شور سے کر رہی تھیں۔ غائب دماغی کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

زندگی واقعی تین گھنٹے کی فلم اور ایک گھنٹے کا ڈراما نہیں ہوتی کہ آخر میں سب کچھ اچھا اچھا اور ٹھیک ٹھیک ہو جائے۔ یہ زندگی پریوں کی۔ شہزادے کی کہانی بھی نہیں کہ اختتام پر سب ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ یہ زندگی بہت غیر متوقع ہوتی ہے۔ اس کے پردے پر کسی بھی

''غلطی میری ہی ہے۔ میں خود کو پہچان نہیں پائی۔ اپنی طلب اور خواہش کی شناخت نہیں کر سکی۔'' زنیرہ نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔

کچھ دیر وہ اسی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھی اور شہریار کو کال کرنے لگی۔ پہلی بیل پر ہی اس نے کال ریسیو کر لی۔

''آئی ایم سوری شہریار، تم آئے تھے میں مل نہیں سکی۔ اور بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔'' زنیرہ نے اپنے تئیں تو بہت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے مبارکباد دینے کی کوشش کی تھی مگر اب الفاظ اس کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔

''تم سے یہ امید نہ تھی فون پر مبارکباد دے رہی ہو؟ گھر کب آؤ گی؟''

''نیکسٹ ویک آؤں گی ناشادی پر۔''

''صرف شادی پر؟ ہر تقریب میں آنا ہے تمہیں۔''

''ہاں، ہاں ہر تقریب میں آؤں گی۔ زنیرہ نے ہنسنے کی کوشش کی مگر نہ جانے کیوں آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''اچھا میں بعد میں بات کروں گی۔ بیٹری لو ہو رہی ہے موبائل کی۔'' زنیرہ نے فون آف کر دیا۔

اب محبت کا احساس ہو یا پشیمانی کا، کیا فرق پڑتا ہے؟ شہریار نے درست کہا تھا۔ اب رومیو جولیٹ اور شیریں فرہاد نہیں ہوتے۔ انسان بہت پریکٹیکل ہو گیا ہے اور ہونا بھی چاہیے ایویں انتظار انتظار میں عمر گزارنے سے کیا حاصل!

اگلے چار پانچ روز بہت مصروف اور ہنگامہ خیز تھے۔ وہ صبح کی نکلی شام تک واپس آتی اور تھکن کا بہانا کر کے کمرے میں گھس جاتی۔ اریبہ اور ہانیہ شاپنگ بالز کے چکر لگا رہی تھیں۔ شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ روزانہ اس سے بھی سوال کرتیں۔ آپ اپنی شاپنگ کب کریں گی۔''

''بہت جلد۔'' زنیرہ مسکرا دیتی۔

آفس کے ایڈریس پہ کوریئر آیا تھا۔ زید نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فرام زنیرا احمد۔

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور پیکٹ کھولا۔ مخملیں تھیلی میں وہ خوب صورت کور اور قیمتی انگوٹھی زید کچھ دیر سامنے میز کے ٹاپ گلاس پر رکھی ان چیزوں کو دیکھتا رہا۔

"پتا نہیں یہ لڑکیاں اتنی احمق اور جلد باز کیوں ہوتی ہیں۔"

زید نے اپنا سیل فون اٹھایا۔ اسے آن کر کے زنیرہ کو کال کی مگر پھر درمیان میں کاٹ دی پچھلے پانچ دن سے روزانہ اسے راضی کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔ دلوں کے سودے باہمی رضا مندی سے ہوتے ہیں۔ زبردستی نہیں۔ اب اس کی مرضی اگر یہی ہے تو اس کا احترام کرنا چاہیے۔ زید نے مایوسی کے عالم میں سوچا۔

☆☆☆

کاہی اور گولڈ امتزاج کے جوڑے میں ملبوس، نک سک سے تیار اس نے نکلنے سے پہلے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ آئینہ بتا رہا تھا کہ وہ اچھی لگ رہی ہے۔

امی اور بہنوں کے ہمراہ میرج ہال پہنچی جہاں مایوں کی تقریب کا اہتمام تھا۔ وہاں مہمان ابھی بہت کم آئے تھے۔

"ہم ہی جلدی آگئے۔" ہانیہ نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی اور ہال کی سجاوٹ کا جائزہ لیا۔

شگفتہ بھابھی آگر بڑے تپاک سے ملیں اور انہیں اس میز پر لے گئیں جہاں ملکہ دادی بیٹھی تھیں۔ سبز ساڑھی پہنے جس پر سنہری اور سبز ریشم کی بوٹیاں تھیں۔ کانوں میں موتیے کے پھول اٹکے ہوئے تھے۔ مہمانوں کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئیں۔

"ارے واہ آج دادی کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ مایوں مہندی کی تقریب ہے۔" اریبہ نے کرسی سنبھالتے ہوئے دادی کو سراہا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہیں دادی، ہیں نا۔"

"ہاں بالکل!" سب نے اس کی تائید کی۔

آفس کے ایڈریس پہ کوریئر آیا تھا۔ زید نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فرام زنیرا احمد۔

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور پیکٹ کھولا۔ مخملیں تھیلی میں وہ خوب صورت کور اور قیمتی انگوٹھی زید کچھ دیر سامنے میز کے ٹاپ گلاس پر رکھی ان چیزوں کو دیکھتا رہا۔

"پتا نہیں یہ لڑکیاں اتنی احمق اور جلد باز کیوں ہوتی ہیں۔"

زید نے اپنا سیل فون اٹھایا۔ اسے آن کر کے زنیرہ کو کال کی مگر پھر درمیان میں کاٹ دی پچھلے پانچ دن سے روزانہ اسے راضی کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔ دلوں کے سودے باہمی رضا مندی سے ہوتے ہیں۔ زبردستی نہیں۔ اب اس کی مرضی اگر یہی ہے تو اس کا احترام کرنا چاہیے۔ زید نے مایوسی کے عالم میں سوچا۔

☆☆☆

کاہی اور گولڈ امتزاج کے جوڑے میں ملبوس، نک سک سے تیار اس نے نکلنے سے پہلے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ آئینہ بتا رہا تھا کہ وہ اچھی لگ رہی ہے۔

امی اور بہنوں کے ہمراہ میرج ہال پہنچی جہاں مایوں کی تقریب کا اہتمام تھا۔ وہاں مہمان ابھی بہت کم آئے تھے۔

"ہم ہی جلدی آگئے۔" ہانیہ نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی اور ہال کی سجاوٹ کا جائزہ لیا۔

شگفتہ بھابھی آگر بڑے تپاک سے ملیں اور انہیں اس میز پر لے گئیں جہاں ملکہ دادی بیٹھی تھیں۔ سبز ساڑھی پہنے جس پر سنہری اور سبز ریشم کی بوٹیاں تھیں۔ کانوں میں موتیے کے پھول اٹکے ہوئے تھے۔ مہمانوں کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئیں۔

"ارے واہ آج دادی کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ مایوں مہندی کی تقریب ہے۔" اریبہ نے کرسی سنبھالتے ہوئے دادی کو سراہا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہیں دادی، ہیں نا۔"

"ہاں بالکل!" سب نے اس کی تائید کی۔

دیکھتا ہوں۔ شاید کم.....

"میں آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتی میں کسی اور کی اسیر ہوں مجھے اب ادراک ہوا ہے۔" زنیرہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم نے تو پھر بات ہی ختم کردی اب۔" زید نے لائن ڈسکنیکٹ کردی۔ زنیرہ اپنا موبائل آف کرکے پیچھے مڑی، اور بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری جاسوسی کررہا ہوں یا چھپ کر تمہاری باتیں سن رہا ہوں۔ میں تو یہ پھول لے کر اسٹیج کی طرف جارہا تھا مگر تم درمیان میں آگئیں۔" پھولوں کی ٹوکریاں تھامے شہریار نے وضاحت پیش کی۔

"راستہ کھلا ہے۔ اب چلے جاؤ۔"

"وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا۔ بائی دا وے تم باقی سب کی طرح خوش خوش کیوں نہیں لگ رہیں؟ اتنی چپ؟ اتنی اداس؟ اب تو زید صاحب بھی مقدمہ جیت گئے ہیں۔" شہریار بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، وہ مقدمہ جیت گئے ہیں مگر میں بہت کچھ ہار گئی ہوں زندگی میں۔ میں نے اپنا راستہ زید سے الگ کرلیا ہے۔"

"مجھے معلوم تھا تمہیں ایک نہ ایک دن ضرور احساس ہوگا کہ نہ وہ راستہ تمہارے لیے ہے نہ وہ شخص!" شہریار کے چہرے پر بے اختیار خوشی چھلکی۔

"مگر اب اس احساس سے کیا فائدہ، بہت دیر ہوچکی ہے۔" زنیرہ نے بہت ضبط سے اسے دیکھا۔

"اور یہ الہام تمہیں کیسے ہوا کہ دیر ہوچکی ہے۔"

"میرا مذاق مت اڑاؤ۔" زنیرہ کا ضبط جواب دینے لگا۔

"شہریار! تم یہ پھول لے کر یہاں کھڑے ہو۔ ادھر دولہا والے آگئے ہیں۔" عافیہ خالہ تیز تیز بولتی ہوئی آئیں۔ شہریار کے ہاتھوں سے ٹوکریاں لیں اور اتنی ہی تیزی سے واپس چل دیں۔

"چلو آؤ، مہمانوں کو ویلکم کرنا ہے۔"

"کون آیا ہے شہریار؟" زنیرہ کو لگا اس نے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"سنا نہیں تھا۔ دولہا والے اور کون؟" چلتے چلتے شہریار نے جواب دیا۔

"کس کے دولہا والے۔" زنیرہ نے احمقوں کی طرح سوال کرتے ہوئے بے وقوفوں کی طرح اسے دیکھا۔

"ہائیں!" شہریار وہیں ٹھہر گیا۔

کس کی شادی ہورہی ہے؟ افشین کی مایوں ہے۔ اس کے سسرال والے آئے ہیں۔"

افشین کی مایوں؟ مگر کارڈ پر تو تمہارا نام لکھا تھا۔ زنیرہ بھی ٹھٹھک گئی۔

"اس بھری دنیا میں میرے علاوہ اور کوئی شہریار نہیں ہے کیا؟ افشین کے دولہا کا نام بھی شہریار ہے بے وقوف لڑکی۔"

"تم مذاق تو نہیں کررہے؟" زنیرہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے لہروں نے اچھال کر ساحل پر ڈال دیا ہو اسے۔

"مجھے کیا ضرورت ہے تم سے مذاق کرنے کی۔ میری ایک عدد ذاتی منگیتر موجود ہے۔ جو مذاق کرنا ہوتا ہے اسی سے کرلیتا ہوں۔" شہریار نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا اور ویلکم ڈوز کی طرف جانے لگا۔

"شہریار، تم سیریس کیوں نہیں ہوتے کبھی؟"

"تمہارے ساتھ تو ہمیشہ سیریس ہی رہا مگر تم نے مجھے ہمیشہ نان سیریس لیا۔" شہریار نے شکوہ کیا۔

"میں غلط تھی۔ مجھے اب احساس ہوا ہے۔"

زنیرہ کے اعتراف پر شہریار کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عافیہ خالہ کی پھر انٹری ہوگئی۔

"ارے تم کہاں لڑکیوں میں گھسے چلے جارہے ہو۔ جاؤ ادھر کھڑے ہو۔"

انہوں نے شہریار کو لڑکوں کی طرف دھکیلا، زنیرہ دل سے ہنسی تھی۔ اس دل سے جو ہمیشہ سے شہریار کا اسیر تھا اسے احساس مگر ذرا دیر سے ہوا۔

☆☆

ہاجرہ عمران

عید بکرا عید

خوش قسمتی سے ان کا گھر جس گلی میں تھا وہ کافی چوڑی تھی۔ گلی کے دونوں جانب گھروں کے آگے دروازوں کے بالکل ساتھ زمین پر اور کہیں دیواروں میں کیل ٹھونک کر قربانی کے جانور باندھے گئے تھے۔ کہیں بکرے تو کہیں گائے اور کہیں بیل بندھے تھے۔ ان میں سے کچھ چہرہ جھکائے نیند

پوری کر رہے تھے تو کچھ ادھر ادھر راہگیروں کو دیکھتے ہوئے جگالی میں مصروف تھے۔

انمول نے چھت سے پوری گلی کا جائزہ لیا۔ رات کا ایک بج رہا تھا مگر لوگوں کی آمد و رفت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ یہ لوگ خاص طور پر نوجوان لڑکے رات گئے تک بازاروں اور چوراہوں پر کھڑے جانے کن خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے۔ نہ ان کی باتیں ختم ہوتی تھیں اور نہ ہی روزمرہ معمول میں کوئی فرق دیکھنے میں آتا۔

انمول کو اس گھڑی کا انتظار تھا جب گلی کی تمام آمد و رفت تھم جاتی۔ تمام نوجوان اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاتے۔ گلی میں بچھی واحد چارپائی پر پہرہ دیتے خان بابا کی آنکھ لگ جاتی۔ میدان صاف ہوتا اور انمول کو کارروائی کرنے میں آسانی ہوتی۔ آج انتقام کی رات ہو سکتی تھی اگر انمول گلی والوں کے سونے کا انتظار کرتے کرتے خود نہ سو جاتی۔

بقرعید میں وقت ہی کتنا بچا تھا۔ محض تین روز، پچھلے ایک ہفتے سے وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ مگر اس نے سوچ لیا تھی کہ آج کی رات انتقام کی آگ بجھا کر ہی دم لے گی۔ تقریباً تین بجے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔ اس نے چارپائی سے اٹھ کر ایک بار پھر گلی اور گھر کے کھلے دالان میں جھانکا۔ زمان وہاں موجود نہیں تھا۔ شاید سونے کے لیے گھر کے اندر جا چکا تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے زینہ طے کرتی ہوئی نیچے اتری اور چھپر تلے بندھا بکرا کھول کر گیٹ سے باہر نکال دیا۔ ہاتھ جھاڑتے ہوئے دروازہ بند کیا اور اطمینان سے اوپر جا کر اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ زمان سے اس سے بہتر انتقام وہ لے بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے دوسری چارپائی پر لیٹی قندیل اور تیسری پر اپنے چھوٹے بھائی قدیر کو سوتے دیکھا اور خود سر تک چادر تان کر لیٹ گئی۔

زمان اس کا تایا زاد تھا جس کی ایک ہی بہن تھی۔ جبکہ وہ لوگ ایک بھائی اور دو بہنوں پر مشتمل خاندان تھا۔ دونوں گھروں کو درمیان سے دیوار اٹھا کر الگ کیا گیا تھا البتہ چھتیں اور دالان ایک ہی تھے۔ جنہیں مشترکہ رکھا گیا تھا۔ زمان کو ہمیشہ سے قربانی کا شوق تھا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث تایا ابا اسے بکرا خرید کر نہیں دے سکتے تھے۔ البتہ وہ ہر سال اپنے گاؤں سے ایک نیا تولد ہوا بکرا منگوا لیتے جسے زمان سارا سال پالتا رہتا اور بقرعید پر اسے اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جاتا۔

☆☆☆

صبح سویرے وہ اپنی چارپائی پر کسی شور کی منتظر تھی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ گھر بھر میں ہنگامہ برپا تھا مگر وہ کانوں پر تکیہ رکھے نیند کی وادیوں میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ ایک تو رات کی کارروائی کے لیے اسے دیر تک جاگنا پڑا دوسرے گرمی نے نیند پوری نہ ہونے دی۔ اس کا ارادہ نو بجے کے قریب جاگنے کا تھا۔ تیار ہو کر آفس کے لیے نکل جاتی۔ اسے معلوم تھا بکرا گم ہو جانا ایک بڑا واقعہ ہے۔ گھر بھر کا اتنا شور کرنا تو بنتا ہے۔ اسی لیے مزے سے کان لپیٹے پڑی رہی۔ مگر اس بار اس شور میں رونے اور چیخنے جیسی آوازیں شامل ہو گئی تھیں۔ قندیل اسے جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی۔

"انمول! اٹھ جاؤ، ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

اس کے ہوش گم ہوئے۔ اس کے ابا پیارے ابا تکلیف میں تھے اور وہ کیسے ڈھٹائی سے لیٹی رہی۔ وہ اچھل کر بستر سے اٹھی تھی۔ بھاگتی ہوئی دروازے تک پہنچی جہاں ایمبولینس ہوٹر بجاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ وہ واپس اندر کی جانب بھاگی۔ جہاں قدیر، قندیل، کنول اماں کو سنبھال رہے تھے۔ جبکہ زمان ایمبولینس کے ساتھ جا چکا تھا۔ اس نے اماں کو گلے لگایا۔

"کچھ نہیں ہوگا ابا کو..... آپ خود کو

سنبھالیں۔"

وہ کمرے کی جانب بھاگی۔ کپڑے بدل کر چادر لے کر باہر آئی تو پورے گھر میں بکرے کی گمشدگی کی خبر پھیل چکی تھی۔ زمان کا ہسپتال سے فون آیا تھا کہ فوری طور پر دو لاکھ روپے جمع کرانے ہوں گے۔ ابا کا آپریشن ہوگا۔ سارا گھر سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔ پیسوں کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ وہ میڈم روزینہ سے قرض مانگ لے لگی۔ اس نے آسان حل سوچا۔ اور اللہ کا نام لے کر گھر سے نکل پڑی۔

میڈم روزینہ کے دفتر کے باہر پہنچ کر دستک دینے کیلئے ہاتھ بلند کیا تو اندر سے رافع اور میم روزینہ کے مشترکہ قہقہے کی آواز سنائی دی۔

"تم نے مارچ بہت اچھا آرگنائز کیا۔ خوش ہو کر ہمارے آقاؤں نے ایک بڑی رقم بھیجی ہے۔ ساری محنت وصول ہوگئی۔" میڈم روزینہ کی آواز میں انوکھی چہکار تھی۔

"میرے ساتھ ساتھ یہ انمول کی بھی محنت ہے۔ اس نے ایک ایک انسان کو وہاں لانے میں محنت کی تب ہی تو اتنا بڑا ہجوم جمع ہوا تھا کہ عالمی پریس کو ہمارے مارچ کا نوٹس لینا ہی پڑا۔ لوکل میڈیا کیسے پیچھے رہتا، اسے بھی کوریج دینا ہی پڑی۔"

رافع نے انمول کو بھی کریڈٹ دیا۔

"اب اس لڑکی کو یہ سب کہہ کر سر پر مت چڑھا لینا۔ اس چیک کی تو بھنک بھی انمول کو مت پڑنے دینا۔ ہم لوگ تین ماہ بعد سیلری دیتے ہیں تو ورکرز ہمارے انڈر رہتے ہیں۔ ورنہ یہ سب تو شوخے ہوجائیں۔ ویسے بھی تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ آفس وغیرہ میں کام کرنے والی لڑکیاں صرف دل بہلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ اس سے زیادہ کا سوچنا بھی مت۔" روزینہ نے اسے ڈپٹا۔ وہ رافع کی بڑی بہن تھیں۔ وہی اس این جی او کی کرتا دھرتا تھیں۔

"اس بات کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ مجھے وقتی طور پر ان اڑتی ہوئی تتلیوں کو اپنے بس میں کرنے اور ان کے رنگوں سے کھیلنے میں لطف آتا ہے۔ سنجیدہ تو میں آج تک نہیں ہوا۔ میری زندگی میں اگر کوئی لڑکی شامل ہوگی تو صرف آپ کی مرضی سے....."

وہ پریقین لہجے میں بول رہا تھا۔

انمول دو لمحوں میں ہی بے مول ہوگئی تھی۔ وہ اس شخص کے برتے پر زمان سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تھی۔ اس سے نفرت کی بنا پر اسے اس کے بکرے سے محروم کردیا۔ وہ جو آج زندگی کی سب سے بڑی مصیبت کے وقت اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ رافع اور روزینہ کی گفتگو نے اس کے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ وہ دونوں بہن بھائی کس طرح معصوم لڑکیوں کے جذبات سے کھیلتے تھے اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وہ بھی ان کے ہاتھوں بے وقوف بن گئی تھی۔

"ارے میڈم! آپ ابھی تک باہر ہی کھڑی ہیں۔ میڈم روزینہ اندر موجود ہیں، آپ مل لیں ان سے، آپ کو ایمرجنسی تھی نا۔"

میمونہ نے اسے دروازے پر گم صم کھڑے پایا تو بلند آواز میں بولی۔ وہ اس کو جواب دیے بغیر باہر کی جانب لپکی۔ اسے زمان کے پاس پہنچنا تھا جو اس وقت اکیلا اس کے والد کو سنبھالے ہوئے تھا۔

روزینہ اور رافع لپک کر باہر آئے مگر وہ راہداری سے مڑ چکی تھی۔ ان دونوں نے میمونہ کی جانب دیکھا۔

"میم انمول کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، وہ آپ سے مدد لینے کے لیے آئی تھیں۔ انہیں یہاں کھڑے دیکھ کر میں نے استفسار کیا تو وہ بغیر کچھ کہے چلی گئیں۔"

میمونہ انہیں صورت حال بتا کر چلی گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"انمول نے ہماری باتیں سن لیں ہیں شاید۔" رافع کو فکر ہوئی۔

"سنتی ہے تو سن لے، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک چھوڑ ہزاروں اس جیسی مل جائیں گی۔ تم

زیادہ فکر مت کرو۔'' روزینہ نخوت سے کہتی ہوئی اندر کی جانب بڑھ گئی تو رافع بھی سر جھٹکتا ہوا پیچھے پیچھے چل دیا۔

بڑوں کی مرضی سے زمان اور انمول کو منگنی کے بندھن میں باندھا گیا تھا۔ انمول نے ماسٹرز کیا تھا اور چھ ماہ سے وہ ایک این جی او کے ساتھ منسلک تھی۔ این جی او میں ملازمت کے بعد اس کے خیالات میں انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ اپنے ہی معاشرے میں رائج روایات اور اقدار کو فرسودہ ماننے لگی تھی۔

ایک اعتراض اسے زمان کے جاب لیس ہونے پر بھی تھا۔ جو کہ ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جگہ جگہ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کے برعکس انمول نے جب سے رافع کو دیکھا تھا، وہ اس کی مسحور کن شخصیت سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ دونوں بہن بھائی خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھے۔ مگر آج ان کی شخصیت کے پرت کھلے تو وہ ششدر رہ گئی۔

اسے اپنے ہی وجود سے وحشت محسوس ہونے لگی۔ وہ کیسے بے حس لوگوں میں گھر گئی تھی؟ وہ تپتے دماغ سے ہسپتال پہنچی۔ زمان ہسپتال میں آپریشن کے پیسے جمع کرا چکا تھا۔ اس نے نہ جانے کیسے تمام رقم کا بندوبست کیا تھا۔ تایا اور تائی تو حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ابا کا آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ وہ کچھ شرمندہ سی تھی۔

''نہ جانے اسے اس کے چہیتے بکرے کی گمشدگی کی اطلاع ملی یا نہیں؟'' وہ کوریڈور میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ زمان سے منگنی کی سزا اس نے اسے اس کے بکرے سے محروم کر کے دی تھی۔ اسی وقت اماں بھی قدیر کے ساتھ پہنچ گئیں۔

قدیر نے پہنچتے ہی زمان کے کان میں نہ جانے کیا کہا کہ اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں گہری ہو گئیں۔ وہ پورے ایک سال سے اسے مال رہا تھا۔ اس کی جدائی اسے کس قدر بے چین کر سکتی تھی، وہ سمجھ سکتی تھی۔

☆☆☆

عید کی صبح اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں مخصوص چہل پہل تھی مگر اس کا دل اداس ہو رہا تھا۔ اس نے بہت بڑی گڑبڑ کر دی تھی۔ وہ دل سے اپنی حرکت پر شرمندہ تھی۔ اس کی وجہ سے آج گھر پر کوئی قربانی نہیں ہوگی اور بہت سالوں میں یہ پہلی بار ہوگا۔

یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ شرمندگی کا احساس اس کے ضمیر کو کچوکے لگا رہا تھا۔

ابا عید کی نماز کے لیے نہ جا سکے تھے۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ قدیر اور زمان نماز پڑھ کر آئے تو سب سے عید مل کر وہیں ابا کے کمرے میں ہی بیٹھ گئے۔ فضا میں عجیب سی خاموشی تھی۔ قربانی کے بغیر سب کچھ پھیکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کی بدلے کی آگ نے سارے گھر کے افراد کی خوشی بھسم کر دی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں

جانے لگی کہ بکرے کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ دروازے پر بیل ہوئی۔ ''قصائی آ گیا۔'' قدیر دوڑ کر دروازہ کھولنے گیا۔ اس کے پیچھے ہی زمان بھی باہر چلا گیا۔

''یہ کیسے ہوا؟'' اس نے سوچا۔

''کیا بکرا مل گیا؟'' وہ ابھی ابھی سی تھی۔ گھر میں ایک دم ہی پرجوش سی فضا قائم ہو گئی تھی۔ قربانی، کلیجی کی پکوائی، بکرے کے گوشت کی تقسیم کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ آج اسے یہ سب شور، چہل پہل اور ہنگام جو برپا تھا وہ اچھا لگ رہا تھا۔ رشتے داروں کے لیے بنائے گئے گوشت کے لفافے فریزر میں رکھ لیے گئے تھے۔ لفافوں پر سیاہ مارکر سے سب کے نام لکھے گئے تھے۔

محلے میں گوشت ان لوگوں کے ہاں بھجوایا جا رہا تھا جو اس سال قربانی کی سعادت سے محروم رہ گئے

گئے۔ کچھ حصہ کرین کی پرچیوں نے کریب موجود جھونپڑیوں کے مقیموں کو بھجوا دیا گیا۔ کچرے والے، گلی میں جھاڑو دینے والے اور کام والی کا حصہ بھی رکھا گیا۔ زمان اور قدیر شہر میں مقیم رشتے داروں کو گوشت دینے روانہ ہو گئے۔

بہنوں کی مدد سے کچن سمیٹ کر وہ فراغت سے بیٹھی تھی۔ سب گھر والے مصروف تھے۔ ایک اسی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ زمان نے اکیلے ہی یہ سب کیسے مینج کیا۔ ابا جان کا آپریشن، قربانی اور دوسرے اخراجات؟ مہمانوں کی آمد نے اسے وقتی طور پر ان سوچوں سے نجات دلا دی۔

مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ چائے کا کپ لے کر ٹیرس پر آ گئی۔ اچانک ہی تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ جیسے کہیں دور سے بادلوں کو اپنے ساتھ دھکیل کر لا رہی ہوں۔ وہ سوچوں میں گم چہل قدمی کر رہی تھی کہ اچانک زمان وہاں آ گیا۔

''ایک بات بتاؤں؟'' اس نے رازدارانہ انداز میں قریب آتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس وقت چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔'' زمان نے چائے کا کپ انمول کے ہاتھ سے لے لیا۔ انمول کا رکا ہوا سانس جیسے بحال ہوا۔

''تم اتنی الجھی ہوئی کیوں ہو؟'' وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے شرارت سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔ ''کچھ نہیں..... بس ایسے ہی۔'' وہ جھجکی۔

''تم نے یہ سب کیسے مینج کیا، آئی مین..... اتنے پیسوں کا انتظام کہاں سے کیا؟ ابا کا آپریشن، پھر تمہارا بکرا بھی.....''

''میرے والد یعنی تمہارے تایا جان حج پر جانے سے پہلے کچھ چیک سائن کر گئے تھے۔ تاکہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں بینک سے پیسے نکلوائے جا سکیں۔ اس سے بڑی ایمرجنسی کیا ہو سکتی تھی۔ رہا بکرا تو وہ میں نے تمہیں کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں تو اسی وقت بکرا اپنے دوست کے گھر باندھ آیا تھا تاکہ رسی نہیں تنگ کرے۔ کل قربانی کی حالت نے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ دو روز تک بکرا ساتھ والے گھر بندھا رہا۔ انہوں نے ہی اس کی دیکھ بھال کی۔ مگر تم بتاؤ؟ تم نے یہ کیوں کیا؟ میں اب تک تمہاری اس حرکت کے بارے میں حیران ہوں۔''

''وہ سب میں نے تمہاری وجہ سے کیا تھا۔ پلیز، مجھے معاف کر دینا۔ میں تم سے خفا تھی مگر غصہ بکرے پر نکال دیا۔'' اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''لیکن خفا ہونے کی کوئی وجہ بھی تو پتا چلے۔'' وہ اسے مڑ کر نیچے جاتا دیکھ کر تشویش سے بولا۔

''ماں، بابا نے مجھ سے پوچھے بغیر میری بات تم سے..... میرا مطلب آپ سے طے کر دی تو مجھے غصہ آ گیا۔ میری رائے جاننا ضروری ہی نہیں سمجھی۔''

''اوہ اچھا تو یہ بات ہے اس کا مطلب تم مجھ سے میرا مطلب ہے اس رشتے پر راضی نہیں ہو۔'' زمان کے لہجے میں اداسی گھلی۔ ''یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے، میں خود چچی جان سے انکار.....'' مگر انمول نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی۔

''نہیں، مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں صرف طریقۂ کار پر اعتراض تھا مگر اب وہ بھی نہیں ہے کیونکہ جو شخص پورے گھر کی ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے وہی میرا جیون ساتھی بننے کے لائق ہے۔ اگر آپ نے امی سے بات کی تو میں اگلی عید پر پھر سے آپ کا بکرا بھگا دوں گی۔''

وہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ تیزی سے زینہ اترتی چلی گئی۔ اس کا آنچل ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا۔ زمان بے اختیار مسکراتے ہوئے گردن کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اسے دور جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆

عنبر بن ابدال

طلوعِ عشق کی پہلی کرن

"کیا محبت کو کبھی لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہے محبت؟ صاف شفاف جھرنے کی مانند گرتا پانی جو اتنا صاف ہوتا ہے کہ اُس میں اپنا عکس اتنا خوب صورت دِکھائی دیتا ہے کہ پھر اس کے سوا کچھ دیکھنے کو کہاں جی چاہتا ہے۔

ہاں، ہاں وہی محبت جو زندگی میں گھل کر شرینی کی مانند میٹھی ہو جاتی ہے اور پھر اگر اس محبت میں توجہ، پروا کا جذبہ بھی گھل جائے تو بیان کرنے کے لیے نہ تو مناسب لفظ ملتے ہیں اور نہ ہی اُن لفظوں کو ادا کرنے والی زبان، یہ تو محسوس کی جانی ہے۔

"میں نے محبت کی ہے۔ ان احساسات کو محسوس کیا۔ لیکن..... آہ!" وہ سسکی۔ اس ایک آہ نے اُسے اندر تک اداس کر دیا تھا۔

"ہر احساس کو بس میں نے محسوس کیا۔ اسے تو کبھی احساس بھی نہ ہوا۔ میں اُس سے اتنی محبت کرتی ہوں۔ پاگلوں کی طرح اُسے چاہتی ہوں۔ اُسے دیکھتی ہوں تو جی اُٹھتی ہوں۔ وہ پاس ہو۔ پھر اس کے سوا کچھ یاد کب رہتا ہے۔ وہ دور ہوتا ہے۔ تو لمحہ بھر کے لیے بھولتا کب ہے؟ اتنی محبت کرتی ہوں۔ گھنٹوں اُسے دیکھتی رہوں۔ تب بھی تشنگی کم نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے، وہ بیٹھا رہے دیوتا کی مانند اور میں داسی بن کر اُس کے قدموں میں بیٹھی رہوں۔ لیکن میں ہی اُس سے محبت کرتی رہوں۔ اور وہ....." آنسو درد سے ٹوٹ کر اُس کی آنکھ سے ٹپکا۔

مکمل ناول

ی داستی ہوں میں۔ بس تو بتاؤں، میں
کیلے پن کے اِس دوزخ میں روز جلتی ہوں۔ میں
بے اعتباری کی چلچلاتی دھوپ میں مر جاؤں گی۔"
ایک اور آنسو ٹوٹ کر گر گیا۔ دفعتاً کسی کے تیز رونے
کی آواز نے کمرے میں بکھری خاموشی کو توڑا۔
خاموشی کی اِس فضا میں یہ تیز آواز کچھ زیادہ ہی زور
سے گونجی تھی۔ اُس کی سوچوں کے بہتے دھارے
میں خلل پڑا۔ وہ چند لمحوں کے لیے اپنی سوچوں کے
بھنور سے اُبھری اور پھر سے اُسی بھنور میں کھو گئی۔

"محبت نہ ملے۔ کبھی نہ کبھی صبر آ جاتا ہے۔
انسان خود کو قسمت میں نہیں تھا' کہہ کر تسلی کی ڈوز تو
دیتا رہتا ہے اور اگر محبت مل کر بھی نہ ملے تو....."
اُس نے زور سے اپنی آنکھوں کو بند کیا۔ "یہ حقیقت
کس قدر کرب ناک ہے۔ کوئی کیسے جان سکتا
ہے۔"

محبت پاس ہو کر بھی اُس کی نہیں تھی۔ وہ اُس کا
بن کر بھی اُس کا نہیں ہو پایا تھا۔ کتنی اذیت تھی، یوں
جیسے ہر لمحہ کوئی آری لے کر اُس کے وجود کو ٹکڑے
ٹکڑے کرتا ہے۔ ہر پل خنجر ہاتھ میں لے کر اُس
کے دِل پہ یکے بعد دیگرے وار کیے جاتا ہے۔ اور
پھر کرتا ہی چلا جاتا ہے۔

رونے کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے
سوچنے کا تسلسل پھر ٹوٹا۔ اُس نے پھر سے اس
رونے کی آواز کو نظر انداز کرنا چاہا اور وہیں سے
اپنے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑنا چاہا جو چند ساعتوں
پہلے ٹوٹا تھا۔ مگر وہ اِس بار ایسا نہیں کر سکی تھی۔ رونے
کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ تھک کر اُس
نے گہری سانس لی اور آنسوؤں سے بھرا چہرہ اپنے
گھٹنوں سے نکال کر اپنے قریب پڑے چھوٹے
سے وجود کی سمت موڑا جو دونوں ہاتھ پاؤں ہوا میں
مارتا ہوا رو رہا تھا۔

اُس نے اپنی بھرائی ہوئی آنکھوں سے
سامنے راکنگ چیئر پہ بیٹھے وجود کی طرف دیکھا۔ جو
اب ساکت بیٹھا اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی
آنکھوں میں دھند چھائی ہوئی تھی۔ اِسی لیے بہت
جاننے کے باوجود بھی اُس کے وجود کو واضح نہیں
دیکھ پا رہی تھی۔

اور پھر..... پھر ہمیشہ کی طرح وہ سیدھا ہوا۔
اپنی بیک کو کرسی کی بیک سے لگا کر سر کو کرسی کی پشت
پہ ٹکایا اور آنکھیں موند کر کرسی جھلانے لگا۔ یعنی اب
اُسے اُس سے یہاں تک کہ اپنے روتے ہوئے
بیٹے سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔

تکلیف کی ایک تیز لہر اُس کے دِل میں
اُٹھی۔ لیکن اِس بار اُس نے اپنی ہر تکلیف اور درد کو
پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ وہ محبوبہ، بیوی بعد میں تھی۔
اب پہلے بس ماں تھی۔ اُس کا دِل اپنی تکلیف بھول
کر بیٹے کے رونے سے دُکھ رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ
بڑھائے اور بیڈ پہ روتے ننھے سے وجود کو اُٹھا کر
اپنے سینے سے لگایا۔ بچہ کچھ ہی دیر میں ماں کے محبت
بھرے لمس کو محسوس کر کے خاموش ہو گیا تھا اور اب
اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ اپنے
لبوں کو بیٹے کی پیشانی پہ رکھا اور اُسے اپنے سینے سے
لگا لیا۔ اُس کی نظریں بے ساختہ ہی سامنے بیٹھے
وجود پہ پڑیں۔ جو ابھی بھی آنکھیں موندے دنیا و
مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔

"اگر اِس ننھے سے بچے کو محبت بھرے لمس کا
پتا تھا تو پھر اِس شخص کو کیوں نہیں احساس ہوتا۔ محبت
تو لمحوں میں آشکار ہو جاتی ہے۔ تو پھر کیوں اِس شخص
کو میری محبت پہ یقین نہیں آتا۔ کیوں یہ میرے
جذبوں کی ہر روز توہین کرتا ہے؟ میں اِس کی بیوی
ہوں۔ اِس کے بچے کی ماں ہوں۔ تو پھر کیوں؟"
وہ دِل ہی دِل میں اُس سے مخاطب ہو کر بے بسی سے
کہہ رہی تھی۔

اچانک جنبش کرتی ہوئی کرسی ساکت ہوئی اور
وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ اُس کے
عقب میں پڑی کرسی پہلے تیز تیز ہلتی رہی اور پھر
آہستہ ہوتی چلی گئی۔ بے بسی کی آخری آہ اُس کے
اندر سے اُٹھی۔ اُس نے اپنے سینے سے لگے بیٹے کو

بیڈ پہ لٹایا اور خود بھی اُس کے ساتھ لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ہر بار ایسے ہی تو کرتی تھی۔ جب ہار جاتی تو آنکھیں موند کر خاموشی سے لیٹ جاتی۔ اِس کے سوا وہ اپنے لیے اور کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

☆☆☆

وہ ہنسی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ بلاشبہ اُس کی ہنسی بے حد دلکش اور حسین تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اِرد گرد کھڑے لوگ بے ساختہ ہی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اُن میں سے ایک تقی بھی تھا۔ اُس نے اپنے سامنے پڑے نوٹس سے نظریں اُٹھا کر اپنے دائیں سمت دیکھا۔ اُس نے اور باقی سب نے اُس لڑکی کی اور دیکھا جواب اپنے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھے نم آنکھوں سے اپنی خوب صورت ہنسی کا گلا گھوٹنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ باقی سب کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ وہ لڑکی اور اُس کی ہنسی تھی ہی اِتنی خوب صورت۔ مگر اُن ستائش بھری نظروں میں فقط دو آنکھیں ایسی تھیں۔ جن میں ناگواری اُبھرتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ اور وہ یہ دو آنکھیں تقی نوشیرواں کی تھیں۔ تقی کی قہر برساتی نظریں آئمہ کے وجود پہ پڑیں اور اگلے ہی لمحے وہ رُخ بدل چکا تھا۔ اور اب اپنے سامنے پڑے نوٹس کی طرف اپنی توجہ مبذول کر چکا تھا۔

''اچھا منزہ آپی، اب تو آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔'' بالآخر وہ اپنی ہنسی روک چکی تھی۔ اور اب اُس کے چہرے پہ خوب صورت مسکراہٹ آویزاں تھی۔

''یس، آف کورس۔ کسی بھی ہیلپ کی ضرورت ہو مجھے ضرور بتانا۔ آفٹر آل اِس یونی ورسٹی کی سینئر اسٹوڈنٹ ہوں۔'' منزہ نے آگے بڑھ کر اپنی کزن اور ہونے والی نند کے گال پہ ہلکی سی چٹکی بھری۔

''اوکے!'' آئمہ نے اثبات میں سر ہلایا اور منزہ سے ہاتھ ہلا کر لائبریری سے نکل گئی۔ منزہ بھی مسکراتی ہوئی تقی کے عقب میں پڑی ٹیبل کے گرد بیٹھے اپنے گروپ کی سمت بڑھ گئی۔

''منزہ! تمہاری کزن تو بہت پیاری ہے۔'' اقصیٰ نے تبصرہ کیا۔

''پیاری، تم تو اچھے خاصے اختصار سے کام لے رہی ہو۔ یار منزہ کی کزن بہت خوب صورت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اُس کی ہنسی۔ میں نے بہت کم اتنی پیاری مسکراہٹ کو دیکھا ہے۔'' یہ تبصرہ اُن کے گروپ کے لڑکے فیض کا تھا۔

''اوو....وو۔'' اُس گروپ کے سب ہی لڑکے اور لڑکیوں نے اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر لمبی سی 'اُو' کی آواز نکالی۔

''ایکسکیوزمی، خبردار اگر کسی نے میری کزن کے بارے میں کوئی بھی فضول بات کی، ورنہ.....'' منزہ نے کہہ کر بات کو ادھورا چھوڑا اور اُن سب کی طرف تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''ہم تو ویسے ہی بات کر رہے تھے۔ فیض، سعید اور اسامہ کے لیے تو آئمہ چھوٹی بہنوں جیسی ہے۔'' زرتاشہ نے کہا۔ تو اِس بار وہ سب ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اِس بار اُن کی اِس ہنسی میں منزہ کی ہنسی بھی شامل تھی۔

تقی نے غصے کی لہر کو اپنے اندر اُترتے محسوس کیا۔ اُس نے گردن گھما کر ایک کٹیلی نگاہ منزہ اور اُس کے گروپ پہ ڈالی۔ اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے سامنے پڑے نوٹس سمیٹ کر لائبریری کے بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا تھا۔ اُس کا اِرادہ کلاس اٹینڈ کرنے کا نہیں تھا۔ بلکہ کینٹین جا کر ایک کپ چائے پینے کا تھا۔ اور اپنے اِس ارادے پہ عمل کرنے کے لیے وہ کینٹین کے راستے کی سمت مڑ چکا تھا۔

یہ اُس کی آئمہ بختیار کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ اور وہ اِس ملاقات میں اُس کے لیے اچھے تاثرات لے کر نہیں اُٹھا تھا۔ بالکل بھی اچھا تاثر نہیں لیا تھا تقی نوشیرواں نے۔ اور یہ کہانی یہیں سے شروع ہونے والی تھی۔

بات تھی۔ جب نقی یونی پارکنگ سے اپنی گاڑی نکال کر سڑک پہ لایا تھا۔ جب اُس نے بیک مرر میں کسی لڑکی کو بھاگتے ہوئے آتے دیکھا۔ وہ تیزی سے پبلک بس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ آئمہ اُس کی گاڑی کے قریب سے گزر کر آگے کی سمت بھاگی جا رہی تھی۔ مگر اُس کے قدم اسپیڈ پکڑتی بس کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے؟ وہ رُکی۔ ذرا سا جھک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔

نقی نے اُسے بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر گہرے سانس لیتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر سر جھٹک کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ آئمہ نے پلٹ کر پہلے سامنے اور پھر اپنے عقب میں موجود گاڑی کو دیکھا۔ وہ اب دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے کسی کو اشارہ کر رہی تھی۔

نقی کی شفاف پیشانی پہ دو بل نمودار ہوئے۔ اُس نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو مزید بند کیا اور اس کوشش میں اُس کے جبڑے کی ہڈی مزید اُبھر آئی تھی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اور اُس کا اِس لڑکی کو لفٹ دینے کا کوئی بھی اِرادہ نہیں تھا۔ اچانک ہی ایک دوسری لڑکی سرپٹ بھاگتی ہوئی اُس کی گاڑی کے عقب سے نکلی اور کچھ فاصلے پہ کھڑی لڑکی کی طرف بھاگتی ہوئی بڑھ گئی۔ سڑک پہ اِکا دُکا اسٹوڈنٹ موجود تھے۔ پاس سے گزرتے دو لڑکوں نے اِس بھاگتی ہوئی لڑکی پہ کوئی کمنٹ پاس کیا اور پھر دونوں ہی ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس پڑے۔

نقی جانے کیوں گاڑی اسٹارٹ کیے سڑک کے کنارے اُن دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب نہ جانے کیا بات ڈسکس کر رہی تھیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے نقی اُن کی گفتگو سُن نہیں پا رہا تھا۔ دفعتاً دوسری آئی لڑکی نے نقی کی گاڑی کی سمت اشارہ کیا۔ یعنی لفٹ مانگنے کی تیاری آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ آئمہ نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ یوں کسی بھی غیر لڑکے سے لفٹ مانگنے کے حق میں نہیں تھی۔

ہیں۔ یہ مین سڑک پہ اُتار دے گا۔ یار! میں تو بالکل بھی پیدل نہیں چل سکتی۔'' ماہا نے منہ بسور کر کہا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چل کر نقی کی گاڑی کی طرف آنے لگی۔ اُس سے پہلے کہ وہ اِس وائٹ ایل جی کے قریب پہنچتی، اُس میں موجود شخص گاڑی کو زن سے اڑا کر اُس کے قریب سے گزر چکا تھا۔

اور ماہا۔ ''ہیں..... ارے..... سنیں تو۔'' کہتی ہی رہ گئی۔ آئمہ جو کچھ دور کھڑی یہ سب منظر دیکھ رہی تھی۔ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ماہا نے پہلے تو سٹپٹا کر آئمہ کی طرف دیکھا اور پھر خود بھی کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی مرے مرے قدموں سے اُس کی سمت واپس آ گئی۔

''کس قدر بد ذوق لڑکا تھا۔ اتنی خوب صورت دو لڑکیاں بیچ راہ میں کھڑی تھیں۔ بندہ تو خود ہی لفٹ کی آفر کر دیتا ہے اور یہاں میں خود بہ نفس نفیس لفٹ مانگنے گئی تھی۔ اور وہ بھاگ گیا۔'' مین سڑک آنے تک ماہا کی دُہائیاں فل عروج پہ تھیں اور آئمہ کی ہنسی عروج پہ تھی۔ یہ دُہائیاں تب تک جاری رہیں جب تک اُنھیں آٹو نہیں مل گیا۔

''آج کے بعد کبھی بھی باتوں میں اتنی مصروف مت ہونا کہ بس چھوٹ جائے۔ ورنہ یہی ہوگا، جو ہوا۔ تھکاوٹ الگ اور انسلٹ الگ۔'' آئمہ نے گھر کے قریب اُترتے ہوئے اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔ اور اِس بار ماہا نے ہمیشہ کی طرح بحث کرنے کی بجائے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور آٹو والے بھائی کو چلنے کے لیے کہا۔ اس وقت ماہا بس گھر جاتے ہی بستر پہ گر کر سونا چاہتی تھی۔ اِس کے علاوہ ابھی تو اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ آئمہ کی باتیں بھی۔

آئمہ نے اُسے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ سیدھا اپنے کمرے میں جانے کے بجائے

کچن میں آیا۔ فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور گردن کو پیچھے کی طرف گرا کر پانی پینے لگا۔ اُس کی ماں اُس کے قریب آ کر کھڑی ہوئیں۔ اُن کے لبوں پہ ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

''تقی بیٹا! تم یونی ورسٹی سے کب آئے؟'' مسکراہٹ کی طرح اُن کا لہجہ بھی شیرینی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ابھی چند منٹ پہلے ہی۔'' تقی نے جواب دیا اور پانی کی بوتل کو شیلف پہ رکھ دیا۔

''تم فریش ہو لو۔ میں تمہارے لیے کھانا بھجواتی ہوں۔'' اُن کا ہاتھ تقی کے مضبوط بازو پہ آ ٹھہرا۔

''نہیں، مجھے کھانا نہیں کھانا۔'' تقی نے ایک نظر اُن کے ہاتھ کو دیکھا جو اُس کے بائیں بازو پہ دھرا ہوا تھا اور دوسری نظر اپنے سامنے کھڑی عورت پہ ڈالی۔ وہ فوراً ہی پیچھے ہوئی تھیں۔

''جب مجھے کھانا ہوگا، میں خود کھا لوں گا۔ آپ فکر مت کریں۔'' وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کچن سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

انیلا بیگم نے لاپروائی سے کندھے اُچکائے اور وہ بھی اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھ گئیں۔ آج نوشیرواں صاحب گھر پہ تھے اور اُن کے سامنے تقی کو پوچھنا لازمی تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اپنی پوچھنے والی عادت کی وجہ سے شوہر کی نظروں میں چبھتی رہی تھیں۔ اور آگے بھی وہ اِسی طرح رہنا چاہتی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح محبت والی اور خلوصِ دِل والی..... اور پھر یہ ایسا مشکل بھی تو نہیں تھا۔ اِس لیے انیلا بیگم بنا کسی غصے یا منہ بنائے یہ کام انجام دے رہی تھیں۔ اور اِسی طرح انجام دیتے رہنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

''یار! وہ لڑکا مجھے ایک بار مِل جائے، تو دیکھنا میں اُس کا حشر کیا کرتی ہوں۔'' ماہا اگلے دِن زور و شور سے کل کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ایک ہاتھ کو فضا میں بلند کیے بہ بانگ دہل اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

''اچھا ماہا! بس بھی کرو۔ غلطی تو ہماری خود کی ہے۔ کیوں اسماء کے منگیتر کے دیے گفٹ کو دیکھنے کے لیے رُکیں۔ اب بس ڈرائیور ہمارے انکل تھوڑی ہیں جو باقی سب کو ہماری وجہ سے ویٹ کرواتے۔'' آئمہ نے اُسے تیسری بار خاموش کروانا چاہا۔

اُن دونوں کی کلاس نہیں تھی۔ اِسی لیے وہ دونوں یونی کے عقب میں موجود لان میں آ بیٹھی تھیں۔ آج موسم اچھا خاصا خوش گوار ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوا نے سب ہی کے موڈ پہ خوش گوار اثر ڈالا تھا۔ سوائے ماہا کے جو کل کی ہونے والی انسلٹ کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

''ہاں تو بس نکل گئی تھی۔ وہ تو تھا۔ وہ سب دیکھ رہا تھا اور جب میں نے اُسے اشارہ کیا تو جھٹ سے گاڑی لے اُڑا۔''

آئمہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ماہا نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے بولنے سے منع کیا۔

''نہیں.... میں تو یہ کہہ رہی ہوں۔ اِتنی خوب صورت لڑکیوں کو وہ اگنور کر کے کیسے چلا گیا۔ پوری یونی ہمارے پیچھے پاگل ہے۔ اور ایک وہ تھا گھامڑ، چغد، پَرلے درجے کا پاگل۔'' ماہا غصے کا ٹریک چھوڑ کر مزاح کے ٹریک پہ آ چکی تھی۔

وہ بولنے میں اتنی مگن تھی کہ آئمہ کے چہرے کی اُڑتی ہوائیاں بھی اُسے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ منہ کھولے حیرت سے آنکھیں پھاڑے ماہا کے عقب میں کھڑے تقی کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی آنکھوں میں موجود غصہ اس کو مزید حواس باختہ کر رہا تھا۔

''نہیں ماہا، پلیز چپ کر جاؤ۔'' آئمہ کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''ایسے ہی چپ کر جاؤں۔ وہ میرے سامنے

بھی آئے گا تو میں ایسے ہی کہوں گی کہ ذرا اپنی آنکھوں کا علاج کروالے۔ لوگ تو خوب صورت لڑکیوں سے بات کرنے، اُنھیں لفٹ دینے کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں اور ایک وہ ہے کہ.....'' ماہا کی چلتی زبان لمحہ بھر کے لیے رُکی۔ اُس نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی آئمہ کو دیکھا جو سر اُٹھائے اُس کے عقب میں مسلسل دیکھے جارہی تھی۔

''تمھیں کیا ہوا۔ کون سا بھوت دیکھ لیا جو.....'' ماہا نے کہتے ہوئے سر گھما کر اپنے عقب میں دیکھا تو یوں اچھلی جیسے اُسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ مار دیا ہو۔

''وہ .....میں۔'' ماہا اٹکی۔ وہ لڑکا چند قدم آگے بڑھا۔ ماہا جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور ساتھ میں آئمہ بھی۔

''میں بہت دیر سے آپ کی بکواس سُن رہا ہوں۔ ایڈیٹ.....ڈفر، چغد ہوں گی آپ خود۔ اور جہاں تک خوب صورت لڑکیوں کا سوال ہے۔'' وہ رُکا اور ایک شعلہ بار نظر ماہا کے ساتھ کھڑی آئمہ پہ ڈالی۔ ''تو میں آپ جیسی لڑکیوں کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ لفٹ دینا تو دور کی بات ہے۔'' اُس کے لفظوں سے زیادہ ہتک آمیز اُس کا لہجہ اور انداز تھا۔ جیسے وہ کوئی.....

آئمہ جو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔ اُس کی بات پہ سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ہم بس.....'' آئمہ خود کو بولنے سے روک نہیں سکی تھی۔

''مجھے آپ کی کسی بھی بات میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔'' تقی نے ہاتھ اُٹھا کر آئمہ کو بولنے سے منع کیا۔

''اگر آپ کو کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ تو آپ کو بھی ہمارے بارے میں ایسے کمنٹس پاس کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' آئمہ درشتی سے بولی اور ماہا کا ہاتھ تھام کر وہاں سے جانے لگی۔ جب کہ اُس کے عقب میں تقی کی آواز بلند ہوئی۔

''اچھی لڑکیاں اپنے بارے میں خود بھی ایسے کمنٹس پاس نہیں کرتیں۔ جیسے آپ خود اپنے بارے میں کر رہی ہیں۔ اور اگر آپ کو زیادہ ہی اپنے بارے میں خوش فہمی ہے کہ آپ بہت خوب صورت ہیں تو اپنی اِس خوب صورتی کو یونی میں ایکسپوز مت کریں۔ اور بہت سی جگہیں ہیں جہاں آپ اپنی خوب صورتی کا خراج وصول کرسکتی ہیں۔''

لفظ تھے کہ تیزاب، انداز تھا کہ تیز دھار خنجر جو اُس نے آئمہ اور ماہا کو مارا تھا۔

''آپ۔'' غصے، شرمندگی.....ہتک کا شدید احساس کہ آئمہ کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر لفظ منہ میں ہی گم ہوگئے۔

وہ کہہ کر ایک استہزائیہ نظر اُن دونوں پہ ڈال کر گردن اکڑائے آگے بڑھ چکا تھا۔ کتنی دیر گزری تھی، شاید پانچ منٹ یا پھر شاید دس منٹ۔ وہ دونوں خاموش کھڑی ایک دوسرے سے نظریں چرائے وہاں دیکھ رہی تھیں جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑا اُن پہ طنز کے تیر برسا رہا تھا۔

''تم دونوں کون سے مراقبے میں کھڑی ہو؟'' اسماء ہاتھوں میں برگر اور کوک پکڑے اُن کے قریب آئی۔ ''یار جلدی سے پکڑو۔ اتنی مشکل سے لے کر آئی ہوں۔ آج تو لگتا ہے پوری یونی نے کینٹین پہ دھاوا بول دیا ہو۔''

اسما نے ساکت کھڑی آئمہ اور ماہا سے چلا کر کہا تو ماہا نے ہڑبڑا کر اُس کے ہاتھ سے برگر تھام لیے۔ اور ایک برگر آئمہ کی طرف بڑھایا۔ آئمہ نے ایک شکوہ کناں نظر ماہا پہ ڈالی اور جھک کر گھاس پہ پڑے بیگ کو اُٹھا کر کندھے پہ ڈالا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

''ہیں..... اِسے کیا ہوا؟'' اسما نے برگر کھاتے ہوئے ماہا سے کہا اور ماہا کوئی بھی جواب دیے بنا واپس اپنی جگہ پہ بیٹھ گئی تھی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا وہیں بیٹھ کر زور زور سے رونے لگے۔ اتنے چھوٹے مذاق کی اتنی بڑی قیمت اُسے خود پہ سخت

غصہ آرہا تھا۔ اور کچھ ہی دیر میں یہ غصہ دکھ میں ڈھل کر اُس کی آنکھوں کے کنارے بھگونے لگا تھا۔ اسما حیرت سے کبھی ماہا کو دیکھ رہی تھی تو کبھی سر اُٹھا کر اُس طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے آئمہ گئی تھی۔

''کیا ہوا، تم دونوں میں پھر سے کوئی بحث ہو گئی؟'' اسما نے ماہا کے قریب کھسکتے ہوئے پوچھا۔

ماہا نے اپنی نم آنکھوں کو اُٹھایا اور کچھ بھی کہے بنا سامنے گھاس کے پتے توڑتی چڑیوں کو دیکھنے لگی' جو اپنی ننھی سی چونچ میں گھاس کے پتے کو بھرتی اور ہلکا سا زور لگا کر توڑ دیتیں۔

اسما نے کوئی جواب نہ پا کر ماہا کی طرف دیکھا اور سر جھٹک کر اپنا برگر کھانے لگی۔ کیوں کہ اُسے اس کے بعد اپنی کلاس بھی لینے کے لیے جانا تھا۔ ''کھاؤ نا، کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے اور پتا ہے نا سر فراز کا رَج کے بے عزتی کرنے میں پوری یونی ورسٹی میں کوئی ثانی نہیں ہے۔'' اسما نے برگر کا ٹکڑا حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے، سرفراز کی ڈانٹ سے ڈرایا تو یہ نسخہ خاصا کارگر ثابت ہوا۔ وہ چھوٹے چھوٹے لقمے توڑتی اپنا برگر کھانے لگی۔

☆☆☆

''اچھا سوری نا، آئمہ غلطی ہو گئی۔ مجھے کیا پتا تھا۔ وہ ہماری باتیں سُن لے گا۔ اور نہ صرف سن لے گا، اِس طرح انسلٹ بھی کرے گا۔'' ماہا کو پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا، آئمہ کی منتیں کرتے اُسے مناتے ہوئے۔ مگر اس بار وہ اُس سے سخت ناراض تھی۔

''تم ماہا، مجھ سے بات بھی مت کرو۔ تم نے انسلٹ کروائی ہے۔ میں تمہیں منع بھی کر رہی تھی مگر تم.....'' آئمہ کی آواز بھرانے لگی۔ وہ پورے ایک ہفتے کے بعد یونی ورسٹی آئی تھی۔

''آئی ایم سوری یار، تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی تو انسلٹ ہوئی ہے۔ آئی سوئیر میں آئندہ ایسے نہیں کروں گی۔'' ماہا نے پاس بیٹھی آئمہ کا ہاتھ تھاما۔ آئمہ نے اپنی نم آنکھوں کو ٹشو سے صاف کیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تھینک یو۔ تھینک یو سو مچ۔'' ماہا نے آئمہ کے گلے ملنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلایا۔ مگر اگلے ہی لمحے آئمہ کے گھورنے پہ اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیا۔

''ویسے ماہا، میرا دِل چاہتا ہے۔ ایک بار اُس کا منہ ضرور توڑوں۔ آخر اُس کی ہمت کیسے ہوئی ہم سے اتنی فضول بات کرنے کی۔ اُس وقت تو میرا دماغ ہی گھوم گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں لیکن اب دِل چاہتا ہے اُسے ایسے لتاڑ کر جواب دوں کہ نانی یاد آجائے۔'' آئمہ نے غصے سے اپنے ایک ہاتھ کا مُکا بنا کر دوسرے ہاتھ پہ مارتے ہوئے کہا۔

''دفع کر یار۔'' ماہا نے ناک چڑھا کر کہا اور ٹوٹس کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیے۔

آئمہ بھی سر جھٹک کر اپنی نوٹ بک پہ دیکھنے لگی تھی۔ ''آئمہ۔'' کچھ ہی دیر گزری تھی جب ماہا نے اُسے پکارا۔

''ہوں۔'' آئمہ ہنوز سر جھکائے نوٹ بک پہ لکھنے میں مصروف تھی۔ ''میں پتا کیا سوچ رہی تھی۔'' ماہا نے ٹوٹس سے نظریں اُٹھا کر آئمہ کی سمت دیکھا۔

''خدا کے لیے کچھ اچھا سوچ لینا۔'' آئمہ نے توجہ نہیں دی۔

''میں سوچ رہی تھی۔ وہ اتنا اچھا اور ویل مینرڈ نظر آنے والا شخص کیسے اتنی فضول سی بات کر گیا۔ تم نے اُسے دیکھا۔ دیکھنے میں وہ کس قدر پولائٹ اور نائس نظر آتا ہے۔ لیکن جب بولتا ہے تو.....'' ماہا نے رُک کر اپنی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھتی آئمہ کی طرف دیکھا۔

''میں تو بس ویسے ہی سوچ رہی تھی۔'' اُس کی نگاہوں سے جز بز ہوتے ہوئے ماہا نے پہلو بدلا اور جلدی سے اپنے چہرے کے سامنے نوٹ بک کر لی۔

''ہم یہاں پڑھنے آئے ہیں۔ دوسروں پہ ریسرچ کرنے نہیں۔ بہتر ہے ہم اپنی توجہ پڑھائی پہ مبذول رکھیں۔'' آئمہ نے مدبرانہ انداز میں کہا تو

ماہا نے جھٹ سے اپنے چہرے کے سامنے سے نوٹ بک ہٹالی۔

''ہاں، میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں۔ ہمیں پڑھائی پہ توجہ دینی چاہیے۔'' ماہا نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا اور مل مل کر پیرا گراف یاد کرنے لگی۔ آئمہ نے اپنے ہونٹوں کے کنارے بکھری مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے اپنا جھکا ہوا سر مزید جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

تقی نے لائم جوس کا بلوریں گلاس کرسٹل کی ٹیبل پہ رکھا اور سر جھٹک کر اپنے اِردگرد کی رنگین دنیا کو دیکھنے لگا۔ وہ شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ موجود تھا۔ یہ پارٹی شہریار نے اپنی انگیجمنٹ کی خوشی میں اپنے دوستوں کو دی تھی۔ تقی ویسے تو ایسی تقریبات سے دور ہی رہتا تھا۔ مگر آج کل وہ عجیب سے مخمصے میں اُلجھا ہوا تھا۔ جب سے اُس نے آئمہ اور ماہا کی انسلٹ کی تھی۔ جانے کیوں اُسے پشیمانی محسوس ہو رہی تھی۔ آئمہ کی آنکھوں سے نمی کا ابھرنا اُس کی آنکھوں سے مخفی کب رہا تھا۔ ہاں وہی تو لمحہ تھا جس کی وجہ سے وہ احساس ندامت میں گھرا ہوا تھا۔ ''کچھ بھی سہی، مجھے اُنھیں اِس طرح کہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔'' دِل نے ایک بار پھر اُسے سرزنش کی۔ اِس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتا۔ سعد نے اُس کے کندھے پہ زور سے ہاتھ رکھا۔

''کیا بات ہے پیارے۔ کس کے خیالوں میں گم ہو؟'' سعد نے کہہ کر معنی خیز انداز میں اپنی آنکھوں کو گھمایا۔

''کوئی حسیں، مہ جبیں دِل میں براجمان تو نہیں ہوگئی۔'' اب کے رضا نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

تقی جی بھر کے بدمزہ ہوا۔ ''کم آن یار۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی خاموش ہوں تاکہ تم سب کی باتیں سُن لوں۔ سب ہی بولیں گے تو سُنے گا کون؟'' تقی نے بات کے آخر میں ہلکا سا قہقہہ لگایا تو ٹیبل کے گرد بیٹھے سب ہی لڑکے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''یار! وہ دیکھ میں کب سے نوٹ کر رہا ہوں۔ وہ لڑکی مسلسل تمہیں دیکھے جا رہی ہے۔'' سعد نے پھر سے تقی کا شانہ ہلا کر اُسے سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف متوجہ کیا۔ تقی نے اُس کے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دیکھا۔ سامنے ہی جینز کے اوپر انتہائی باریک اور مختصر شرٹ پہنے ہوئے بیٹھی لڑکی نے تقی کے متوجہ ہوتے ہی اُسے ہاتھ اُٹھا کر، انگلیوں کو ہلا کر ہائے کہا۔ تقی کے پھیلے ہوئے ہونٹ لمحہ بھر میں سکڑ گئے اور وہ فوراً ہی رُخ بدل کر سعد کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''مجھے اِس حلیے کی لڑکیاں زہر سے بھی زیادہ بُری لگتی ہیں۔''

''اور مجھے سویٹ سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔'' فہد نے سرعت سے کہا۔ اِس سے پہلے کہ تقی کوئی مزید جواب دیتا۔ وہ لڑکی اپنی جگہ سے اُٹھ کر تقی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

''ہائے! آئی ایم رینا۔'' لڑکی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے ادائے بے نیازی سے اپنے ڈائی شولڈر تک آتے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا اور اپنا ہاتھ تقی کی سمت بڑھا دیا۔ تقی نے اطمینان سے اپنا جوس کا گلاس اُٹھایا اور لبوں سے لگا لیا۔ جیسے وہ لڑکی اُس سے نہیں کسی اور سے بات کر رہی تھی۔

''ایٹی ٹوڈ۔'' وہ کہہ کر دھیرے سے مسکرائی۔

''ایسے ایٹی ٹوڈ آپ پہ سوٹ بھی کرتے ہیں۔ اینی ہاؤ، اِٹس مائی سیل نمبر۔'' اُس نے اپنے سنہرے رنگ کے ہینڈ بیگ سے ایک کارڈ نکال کر تقی کی سمت بڑھایا۔ جسے تقی نے اَن دیکھا کر دیا۔ اِس بار لڑکی کے چہرے پہ غصے کی سرخی چھانے لگی۔

''آپ جانتے نہیں ہیں کون ہوں۔ میں رینا صدیقی.....'' اِس سے پہلے کہ وہ لڑکی اپنا تعارف کرواتی۔ تقی نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹیبل پہ رکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہوا۔

وہ لڑکی کے عین مقابل کھڑا تھا۔ ''تم کون ہو، مجھے یہ جاننے میں رتی بھر بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔ کیوں کہ تم اس قابل ہی نہیں ہو۔'' وہ چبا چبا کر کہتا غصے میں بول رہا تھا۔ رضا نے بات بڑھتی دیکھ کر جلدی سے اپنی جگہ کو چھوڑا۔ اور تقی کے قریب آ کر اُس کا بازو تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ الگ بات ہے تقی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔

''پلیز، آپ جائیں۔ یہ پاگل ہے۔'' رضا نے تقی کو آنکھیں نکالتے ہوئے، پلٹ کر رینا سے کہا۔

''آپ کیوں بیچ میں بول رہے ہیں۔ میں اِن سے خود بات کرلوں گی۔'' رینا نے بری طرح رضا کو لتاڑا تو وہ شرمندہ ہو کر پیچھے کی جانب کھسک گیا۔

''مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔'' تقی نے بے نیازی سے ایک ہاتھ اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں۔ اِس ہوٹل میں موجود کسی بھی لڑکے کو اشارہ کروں۔ وہ فوراً میرے پیچھے دم ہلاتا چلا آئے گا۔ میں منتخب ایم این اے آصف صدیقی کی بیٹی ہوں اور الیکٹرونک میڈیا کے ایک چینل کی ایم ڈی.....'' اپنی دانست میں اُس نے تقی کو امپریس کرنا چاہا مگر وہ نہیں جانتی تھی سامنے تقی نوشیرواں تھا۔ جسے کبھی کسی سے متاثر ہونا نہیں آیا تھا۔

اُس کے چہرے پہ اکتاہٹ بھرے تاثرات اُبھرے۔ ''میں اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹی کرنے آیا ہوں۔ کیا میں اپنے فرینڈز کے ساتھ انجوائے کرسکتا ہوں۔'' اُس نے لفظ فرینڈز پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

رینا اپنے تعارف میں سے سب سے تگڑا تعارف تقی کے گوش گزار کرچکی تھی۔ مگر وہاں تو بے نیازی کا عجب جہاں موجود تھا۔

''لیکن میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' رینا نے یہ ایک فقرہ بڑی مشکل سے ادا کیا تھا۔ اُس کے لبوں کی مسکراہٹ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اب وہ تقی سے انتہائی سنجیدہ انداز میں بات کررہی تھی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کسی نے اُس سے بات کرنے سے انکار کیا تھا۔

تقی نے ایک کٹیلی نگاہ رینا صدیقی پہ ڈالی اور پھر پلٹ کر اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ ایک گہری سانس بھری اور ذرا سا جھک کر ٹیبل پہ پڑا اپنا اسمارٹ فون اُٹھایا۔ اور کسی کی بھی طرف دیکھے بنا ہوٹل کے بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

''ایکسکیوز می! میں آپ سے بات کررہی ہوں۔'' رینا اُس کے عقب میں لپکی۔

''شٹ اپ اینڈ جسٹ شٹ اپ۔'' تقی نے اپنے عقب میں آتی رینا کو انگلی اُٹھا کر بری طرح ڈپٹا تھا۔ رینا وہیں رُکی، مانو پتھر کی ہوگئی ہو۔

''مجھے تم سے بات کرنے میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ سو کوئی بھی ڈرامہ کری ایٹ کرنے کی کوشش مت کرو۔''

اُس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا اور پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہوٹل کی راہداری کی سمت بڑھ گیا۔ رینا صدیقی سانس لینا بھول گئی تھی۔ پہلی بار، ہاں! اُس کی چوبیس سالہ زندگی میں یہ پہلی بار ہوا تھا۔ جب کسی لڑکے نے اُس سے اِس طرح بات کی تھی۔ اور اُس سے بات کرنے سے انکار کیا تھا۔ ایسا کب ہوا تھا، رینا کی فرینڈ عنایا اُٹھ کر اُس کے قریب آئی۔

''کم آن رینا، دفع کرو۔ کچھ زیادہ ہی ایٹی ٹیوڈ دکھا رہا تھا۔'' عنایا نے اُسے تسلی دینا چاہی۔ رینا نے اُس کا ہاتھ بُری طرح جھٹکا اور ٹک ٹک کرتی ہوٹل کی پارکنگ میں آ گئی۔ سامنے ہی تقی ہونٹوں میں سگریٹ کے سرے کو دبائے لائٹر کی مدد سے اُس کو سلگا رہا تھا۔ اُس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اُس نے اپنا ذرا سا جھکا ہوا سر اُٹھایا، گہرا کش لیا اور جیب سے اپنا والٹ نکال کر کوئی کارڈ اپنے سامنے

کھڑی لڑکی کو دے دیا۔ لڑکی اُس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے رینا بس اُس کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ سکی تھی۔ سن نہیں سکی تھی۔

تقی نے اثبات میں سر ہلایا اور چند لفظ بول کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔ جیسے ہی گاڑی پارکنگ سے نکل کر سڑک کی سمت مڑی۔ رینا تیزی سے عقب سے نکل کر اُس لڑکی کے پاس پہنچ چکی تھی۔

''سنو، اُس نے تمہیں کیا دیا ہے۔ دکھاؤ مجھے۔'' وہ لہجے میں تحکم بھر کر بولی۔ لڑکی نے اپنے ہاتھ کی مٹھی میں بند وزیٹنگ کارڈ رینا کی سمت بڑھا دیا۔ ''نوشیرواں انٹر پرائز رکمپنی۔'' رینا نے نام پڑھا۔ ''اِس کا نام نوشیرواں ہے؟'' رینا نے جانے کس سے پوچھا تھا۔

''نہیں تو، اِن کا نام تو تقی ہے۔'' لڑکی نے جلدی سے تصحیح کی۔ رینا نے نظر اُٹھا کر لڑکی کی سمت دیکھا۔ وہ عام سے نقوش اور عام سے حلیے والی لڑکی تھی۔ رینا کی آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگی تھیں۔ ''مجھ سے بات کرنا پسند نہیں، جس سے بات کر کے ہر کوئی فخر محسوس کرتا ہے۔ اور یہ.....'' وہ رُکی اور گہری نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگی۔

''جس سے کوئی بات نہ کرے۔ اُس سے وہ بات کر کے گیا۔ تم ہو کیا چیز۔'' رینا کا غصے سے بُرا حال ہوا۔ اُس نے اپنے ہینڈ بیگ سے اپنا سیل فون نکالا۔ کارڈ کے نیچے دیے گئے دونوں نمبرز کو اپنے سیل فون میں سیو کیا اور کارڈ اُس لڑکی کی طرف بڑھا کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گئی۔ عقب میں کھڑی لڑکی نے حیرت سے رینا کی پشت کو دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر کارڈ کو یوں سنبھال کر پرس میں رکھنے لگی، جیسے وہ بہت قیمتی چیز ہو۔

☆☆☆

آئمہ جیسے ہی کلاس لے کر نکلی تھی۔ اُس کا فون بول اُٹھا۔ آئمہ نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر فون نکالا تو اسکرین پہ منزہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ ''جی آپی۔'' اُس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

''آئمہ فری ہو تو آڈیٹوریم ہال کے بیک سائڈ پہ آ جاؤ۔'' اُس کے بولتے ہی منزہ نے عجلت بھرے انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ ''ایک تو منزہ آپی بھی ناں! بات سنتی نہیں۔ اپنی سنا کر فون بند کر دیتی ہیں۔'' آئمہ نے بڑبڑا کر کہا اور اپنے ساتھ کھڑی اسماء کو بتا کر ساتھ چلنے کا کہا۔

''آئمہ! تم چلی جاؤ۔ مجھے لائبریری سے بک ایشو کروانی ہے۔'' اسماء نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو آئمہ اثبات میں سر ہلا کر آگے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ جیسے ہی آڈیٹوریم ہال کے عقب میں پہنچی وہاں کافی لوگ ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے باتوں میں مگن تھے۔

''یہ یہاں پڑھنے آتے ہیں کہ باتیں کرنے۔'' وہ دل ہی دل میں کہتی منزہ کی تلاش میں نظریں گھمانے لگی۔ کچھ ہی دور اُسے منزہ ہاتھ ہلاتی نظر آئی۔ آئمہ نے گہرا سانس لیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی منزہ کی طرف بڑھ گئی۔ منزہ کے پاس ہی ایک لڑکا رُخ موڑے کھڑا تھا۔ شاید وہ فون پہ بات کر رہا تھا۔

''جی منزہ آپی۔'' آئمہ نے لڑکے کی بیک سے نظریں ہٹا کر منزہ کی سمت استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''ماہا نہیں آئی تمہارے ساتھ۔'' منزہ نے سر اُٹھا کر آئمہ کے اِردگرد دیکھا۔

''وہ آج یونی ورسٹی ہی نہیں آئی۔ اگر مجھے پتا ہوتا وہ یونی نہیں آ رہی ہے تو میں بھی نہ آتی۔'' آئمہ نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر کہا تو منزہ مسکرا دی۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں یونی میں؟'' منزہ نے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' آئمہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اب تو بس ہمارے بھی چند دن ہیں۔ اِنٹرن شپ کے بعد بس رپورٹ لکھنی ہے۔ پھر

اُسے سب مٹ گروانا ہے اور پھر وائیوا.... اِس کے بعد ہم فری۔'' منزہ کہہ کر کھلکھلائی۔

''ایسے ہی فری۔ اب تو تیاری کر لیں۔ میرے بھائی کو بہت تنگ کر لیا آپ نے۔ ہم لوگ آپ کے گھر پہنچنے والے ہیں، بینڈ باجوں سمیت۔'' آئمہ نے محبت بھری نظروں سے منزہ کو دیکھا۔

''یعنی اب میں اتنا پڑھ لکھ کر جاب بھی نہ کروں۔'' منزہ نے مصنوعی صدمے سے کہا۔

''کیوں نہیں۔ آپ جاب کریں گی۔ ٹوئنٹی فور آورز۔ لیکن میرے بھیا کی۔'' آئمہ کہہ کر ہنسی۔ اُس کی ہنسی نے کسی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جو فون پہ بری طرح متوجہ تھا، چونک گیا اور بے ساختہ ہی فون والا ہاتھ نیچے کر کے پلٹ کر دیکھا۔ اُسی لمحے آئمہ کی ہنسی کو بریک لگا اور وہ ہونٹ سکیڑ کر منزہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''اِن سے ملو۔ یہ میرے کلاس فیلو تقی نوشیروانی ہیں۔'' منزہ نے آئمہ کے چہرے پر ابھرتی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے آداب۔ میزبانی نبھائے۔

''آپی! میں آپ سے بعد میں ملتی ہوں۔'' آئمہ اِس شخص کو کبھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی، اِسی لیے جلدی سے بولی۔

''ارے رکو!'' منزہ نے پاس سے گزرتی آئمہ کا بازو تھام کر اُسے روکا۔ ''تقی نے تم سے بات کرنی ہے۔ اِسی نے تو مجھے کہہ کر تمہیں بلوایا ہے۔'' منزہ نے اُسے مطلع کیا۔

''آپی۔'' آئمہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''مجھے بس دو منٹ تم سے بات کرنی ہے۔'' تقی نے اپنے بند ہونٹوں کو کھولا۔

''آپی! مجھے کوئی بات نہیں.....'' آئمہ نے ماتھے پہ تیوریاں ڈالتے ہوئے منزہ سے کہا اور نظریں اُٹھا کر تقی کی طرف دیکھا جو اُسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ آئمہ کی نظریں پل بھر کے لیے اُس سے ملی تھیں اور..... اور جانے اُس لمحے میں کیا تھا۔ کیا سحر تھا۔ وہ اُسے بے اختیار ہی دیکھنے لگی۔ تقی اُس کی نظروں سے اپنی نظروں کو ہٹا چکا تھا۔ وہ اب منزہ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ منزہ اثبات میں سر ہلاتی سعادت مندی سے اُس کی بات سن رہی تھی اور پھر پلٹ گئی۔

منزہ کے جانے کے بعد وہ آئمہ کی سمت متوجہ ہوا۔ اُس کے متوجہ ہونے پہ آئمہ نے جلدی سے اپنی نظروں کو جھکا لیا اور اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسلنے لگی۔ تقی نے گلا کھنکھارا اور بولنے کے لیے منہ کھولا۔ ''مجھے لمبی اور زیادہ بات کرنی نہیں آتی۔ بٹ اُس دِن میں نے آپ کو اور آپ کی دوست کو جو بھی کہا تھا۔ میں اُس پہ بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

آئی ایم سوری۔ رئیلی ویری سوری۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے آئمہ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ آئمہ کو کچھ بھی سُنائی کب دے رہا تھا۔ وہ تو اپنے دِل کو ڈپٹنے میں مصروف تھی جو ایک بار پھر اُن گہری سیاہ آنکھوں میں دیکھنے کی ضد کر رہا تھا۔

''میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔'' وہ آئمہ کی خاموشی سے اُکتایا۔

''جج..... جی اچھا۔'' آئمہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''اپنی فرینڈ سے بھی میری طرف سے معذرت کر لیجیے گا۔ آج میرا یہاں آخری دِن ہے۔ اِس کے بعد میں وائیوا کے لیے آؤں گا۔ سو شاید میں آپ کی دوست سے فیس ٹو فیس معذرت نہ کر سکوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں کہتا دِل میں اُترتا جا رہا تھا۔ آئمہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُسے کیا ہوا ہے؟

''کیا آپ نے میری معذرت کو قبول کر لیا؟'' وہ پوچھ رہا تھا اور آئمہ نظریں جھکائے اُس کے کالے چمکتے شوز کی سمت دیکھ رہی تھی۔

''آپ پاگل ہیں کیا؟ میں آپ سے بات کر

رہا ہوں اور آپ خاموش کھڑی ہیں۔'' وہ بھڑکا تھا۔
آئمہ نے ڈرتے ڈرتے نظروں کو اُٹھایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ کالی سیاہ مگر چمک دار آنکھیں۔ ان میں ایسی چمک تھی، جو آئمہ کو چاروں طرف سے خود کو جکڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے بامشکل اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کے لبوں پہ بڑی آسودہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ مطمئن ہوتا اُس کا اطمینان غارت کر چکا تھا۔

دادی کہا کرتی تھیں۔ ''کبھی کسی مرد کی آنکھ میں براہِ راست نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ گناہ بے لذت ہے۔'' مگر اُسے یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی تھی۔ وہ تھینک یو کہہ کر جا چکا تھا۔ مگر وہ بے ایمان تھا۔ وہ جاتے جاتے آئمہ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تقی نوشیرواں کی آنکھیں اُس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ بستر پہ کروٹیں بدلتے ہوئے اُس نے بارہا خود سے پوچھا۔ ''کیا یہ محبت ہے؟'' اور ہر مرتبہ اِس سوال کے جواب میں پہلے سے گہری خاموشی اُس کے اندر اتر آئی۔

''خاموشی کا مطلب تو نیم رضا مندی ہوتا ہے۔'' وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور سائیڈ ٹیبل پہ پڑے پانی کے گلاس کو اُٹھا کر اپنے منہ سے لگایا۔

☆☆☆

''وہ کل آیا تھا۔ سوری کرنے۔'' آئمہ نے غائب دماغی سے نوٹ بک پہ گول گول پنسل گھماتے ہوئے کہا۔

''کون آیا تھا؟'' ماہا نے سر اُٹھا کر ناسمجھی سے آئمہ کی طرف دیکھا۔

''وہ تقی نوشیرواں۔ وہی جس نے ہماری انسلٹ کی تھی۔ ایکسکیوز کر رہا تھا۔'' آئمہ نے کہہ کر زور سے آنکھوں کو بند کیا۔ جیسے اُس کی آنکھوں کی مقناطیسیت سے فرار چاہتی ہو۔

''اچھا، وہ۔ اُس کا نام تقی نوشیرواں ہے۔ کہنا تھا اپنا ایکسکیوز اپنے پاس رکھے۔ کس قدر بری طرح اُس نے ہماری انسلٹ کی تھی۔ جب دل چاہا انسلٹ کر دی اور جب دل چاہا معافی مانگ لی۔ اونہہ..... بڑا آیا۔'' ماہا نے ہنکارا بھرا۔ آئمہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔

''تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں اتنی حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو۔'' ماہا نے کہتے ہوئے ابرو اچکائے۔

''کچھ نہیں۔ میں منزہ آپی سے ملنے جا رہی ہوں۔'' وہ اپنے دل کی ضد کے سامنے ہار گئی تھی۔ اُسے تقی نوشیرواں کو دیکھنا تھا۔ ایک بار، بس ایک نظر۔ اُس نے اپنے بیگ کو کندھے پہ ڈالا اور ماہا کو حق دق وہیں چھوڑ کر کامرس ڈیپارٹمنٹ کی سمت بھاگ گئی۔

وہ بے تابی سے نظریں گھما رہی تھی۔ ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہی تھی۔ مگر وہ نظر نہیں آیا۔

''ارے..... آئمہ تم۔'' اُس کے عقب میں منزہ کی آواز گونجی۔ اُس نے شاید اُس کے سر پر اسکارف سے پہچان لیا تھا۔ آئمہ پلٹی اور لحظہ بھر کے لیے سٹپٹا گئی۔

''وہ میں..... میں وہ۔'' وہ بری طرح اٹکی۔

''کیا وہ میں، میں وہ؟'' منزہ اُس کے قریب آئی۔

''میری فائل نہیں مل رہی تھی۔ کیا میں آپ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔'' اُسے نہیں معلوم تھا۔ وہ کیا بول رہی ہے۔

''نہیں تو، میرے پاس تو تمہاری کوئی فائل نہیں ہے۔'' منزہ نے نفی میں سر ہلایا تو آئمہ کے چہرے پہ تاریکی چھانے لگی۔

''کیا ہوا، تم ٹھیک تو ہو؟'' منزہ نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے لوٹ آئی تھی۔ کتنی ناعجیب بات۔ وہ پہلی نظر کی

محبت کا شکار ہو چکی تھی اور بری طرح اس محبت کی بیماری میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ جتنا اُس کی آنکھوں کو بھولنا چاہتی تھی۔ وہ آنکھیں اتنی ہی شدت کے ساتھ اُسے اپنی طرف دیکھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ لیکن وہ..... وہ یونی ورسٹی سے جا چکا تھا۔ عجب محبت کی کہانی عجیب موڑ پہ آ کر کھڑی تھی۔ جس میں نہ تو رستے کی خبر تھی اور نہ ہی منزل کا پتا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تکیے میں منہ چھپائے سو رہا تھا۔ جب خاموشی کی اس فضا کو اُس کے فون کی بیل نے توڑا تھا۔ تقی نے مندی مندی آنکھوں سے تکیہ ہٹا کر اپنے سے کچھ فاصلے پہ پڑے فون کو دیکھا اور پھر سے اپنے چہرے کو تکیے میں چھپا لیا۔ فون کرنے والا شاید بڑی فرصت سے اُسے فون کر رہا تھا۔ اسی لیے اُسے پانچویں بیل پہ بادل نخواستہ فون اٹھانا پڑا۔ فون کرنے والا انجان تھا کیوں کہ تقی کے فون میں اُس کا نمبر سیو نہیں تھا۔ اُس نے لیس کا بٹن دبایا اور فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو۔'' نیند میں ڈوبی آواز ایئر پیس پہ ابھری تھی۔

''ابھی تک سو رہے ہو؟'' یوں دریافت کیا گیا جیسے وہ اُس سے بہت فرینک ہو۔

''آپ کون؟'' تقی نے پشت کے بل لیٹتے ہوئے لمحے بھر کے لیے فون کان سے ہٹا کر نمبر یاد کرنے کی کوشش کی۔

''میں جو کوئی بھی ہوں۔ اِس وقت آپ کے ڈرائنگ روم میں آپ کی مما کے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں انہیں پچھلے بیس منٹ سے کنوینس کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ کو جگا دیں مگر.....'' اُس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ تقی نے فون کاٹا۔ کمبل ہٹایا اور فریش ہونے کے بعد وہ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے لاؤنج میں آیا۔ جہاں ملازمہ لوازمات سے بھری ٹرالی کو کھینچتے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر ملازمہ ٹھٹکی اور پھر جلدی سے سلام کر کے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ تقی نے سر کو ہولے سے جنبش دی اور ریحانہ سے پہلے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ کتنی ہی حیرتوں کی عمارتیں بلند ہوئی تھیں اور پھر ایک ایک کر کے تقی پہ آن گری تھیں۔ وہ اُس کے گھر تک چلی آئی تھی۔ بنا بتائے، بنا کسی جان پہچان کے۔

☆☆☆

''تمہیں کیا ہوا آئمہ؟'' ماہا نے کتنی بار اُس سے پوچھا مگر وہ کیا بتاتی، اُسے کیا ہوا۔ محبت ہوئی وہ بھی پہلی نظر میں اور پھر اس پہلی محبت، پہلی نظر کے بعد اُس نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی بات نہیں کی تھی۔ عجیب سی بے زاری تھی، عجیب بے چینی۔ جسے وہ کسی سے بھی شیئر نہیں کر پائی تھی۔ کہنے اور بتانے کے لیے تھا بھی کیا۔ وہ بس خالی خالی نظروں سے ماہا کو دیکھ کر رہ گئی۔

''گھر میں سب ٹھیک تو ہے ناں!'' ماہا کو یہی لگا شاید گھر میں کوئی پرابلم ہے۔

اب تو اُس کے بھائی کی شادی کو بھی دو ماہ ہو چکے تھے۔ کتنا کچھ سوچا تھا بھائی کی شادی پہ یوں کروں گی۔ ایسے کروں گی۔ مگر ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ایک موہوم سی امید تھی۔ وہ منزہ کی طرف سے شاید آئے۔ اور یہ امید آخری مہمان کے آنے تک زندہ تھی۔ اور پھر اُس وقت دم توڑ گئی۔ جب دلہن بنی منزہ کو فرمان کے پہلو میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ آئمہ نے داخلی راستے کی طرف دیکھا اور پھر اسٹیج پہ بیٹھی مسکراتی ہوئی منزہ کو۔ اِس سے زیادہ کی تاب اُس میں نہیں تھی۔ وہ منہ بناتی منزہ کے ساتھ آ بیٹھی۔

''آپی۔'' اُس نے جھک کر منزہ کو پکارا جو کہ فرمان کے ساتھ جانے کون سی باتوں میں مصروف تھی۔

''ہوں۔'' منزہ نے اپنا چہرہ آئمہ کی سمت موڑا۔

''آپ نے اُس کو اپنی شادی میں انوائٹ

نہیں کیا تھا؟'' آئمہ نے بظاہر مسکرا کر فوٹو گرافر کی سمت دیکھتے ہوئے بے قراری سے منزہ سے دریافت کیا۔

''کس کو؟'' منزہ حیران ہوئی۔

''وہی تقی نوشیرواں کو۔''

''وہ کیوں آئے گا۔ وہ میرا کلاس فیلو تھا بس، فرینڈ نہیں۔'' منزہ نے دھیمی آواز میں کہا اور فوٹو گرافر کی سمت متوجہ ہوگئی جو اُسے مسلسل اپنی طرف دیکھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

کتنا کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ یعنی وہ اُسے نہیں دیکھ پائے گی۔

''آئمہ، آئمہ۔'' ماہا نے خیالوں میں کھوئی ہوئی آئمہ کو پکارتے ہوئے اُس کا کندھا ہلایا۔

''ماہا۔'' آئمہ کے لب ہلے۔

''آئمہ تم ٹھیک تو ہو۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ نہ پہلے کی طرح ہنستی ہو، نہ پڑھتی ہو، نہ باتیں کرتی ہو۔'' ماہا کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''ماہا، مجھے محبت ہوگئی۔'' آئمہ کو لگ رہا تھا اِس سے زیادہ وہ چپ رہی تو اِس عجیب محبت کا بوجھ اُس کا دِل نہیں سہار پائے گا۔

تین ماہ بہت ہوتے ہیں، اندر ہی اندر گھلتے..... اندر ہی اندر پگھلتے۔ خود سے لڑتے وہ بار بار اپنے دِل کو سمجھاتی۔ مگر اُس کا دِل کچھ بھی سمجھنے کو راضی کب تھا۔ وہ تو بس اُس کے نام کی رٹ لگائے بیٹھا تھا۔ اور وہ..... وہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ وہ رو پڑی تھی۔ ماہا حیرت سے منہ کھولے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو آئمہ۔ یہ کیا بچپنا ہے۔ تم کہہ رہی ہو۔ تم اُس انسان کی محبت میں مر رہی ہو جس سے تم نے کبھی بات نہیں کی۔ نہ تم اُس کے بارے میں جانتی ہو۔ سوائے اس کے کہ وہ تمہاری بھابھی کا کلاس فیلو تھا۔''

''میں نے خود کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے ماہا۔ اور ہر کوشش ناکام ٹھہری۔ محبت سوچ کر تھوڑی ہوتی ہے۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ یونہی اچانک، ایسے ہی کسی بھی لمحے۔ یہ وہ سحر ہے۔ جو اچانک ہی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ میرے پاس لفظ نہیں میں کیسے اپنے جذبوں کو لفظوں میں بیان کروں۔ مجھے نہیں معلوم اس لمحے اُس کی آنکھوں میں کیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی سیاہی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مجھے خود میں مدغم کر لیا۔'' وہ رو رہی تھی۔ ہچکیوں سے رو رہی تھی اور ماہا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیسے اور کن لفظوں میں اُسے تسلی دے۔

''کیا محبت ایسے بھی ہوتی ہے ماہا؟'' آئمہ نے سر اُٹھا کر ماہا سے استفسار کیا۔

ماہا نے اُس کی آنسوؤں سے بھری نظروں سے نظریں چرائیں اور سامنے ٹنڈ منڈ سے درخت کو دیکھنے لگی۔ خزاں کا موسم آ چکا تھا۔ ہر شے پہ زرد رنگ عیاں تھا۔ سبز پتے پیلا پیراہن اوڑھے ہوا کے سنگ یہاں وہاں زمین پہ بکھرے پڑے تھے۔ کچھ پتے جب پاؤں تلے آ کر چرمراتے تو خوب احتجاج کرتے، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''درخت سے ٹوٹ کر گرنا تو ہمارے مقدر میں تھا۔ کیا پاؤں تلے روندنا ضروری ہے۔ مگر آہ! اُن کے احتجاج کی کہاں سُنوائی تھی۔ شاید ایسی ہی محبت آئمہ کے حصے میں آئی تھی جہاں بہار آنے کی خبر کسی کو نہ تھی۔ محبت اور وہ بھی یک طرفہ محبت اسی طرح جان لیوا محسوس ہوتی ہے۔ اپنا وجود اِسی طرح ناکارہ لگتا ہے جیسے شاخ سے ٹوٹ کر گرا پتہ۔ اب کون جانے آئمہ کی محبت یونہی خزاں رسیدہ رہنی تھی یا پھر بہار کا موسم ہر سو محبت کے پھول کھلانے والا تھا، کون جانتا تھا بھلا یہ.....!!

☆☆☆

تقی کی کشادہ پیشانی پہ کتنی ہی لکیریں نمودار ہوئی تھیں۔ ''تم۔'' وہ درشتی سے کہتا ہوا آگے بڑھا۔ رینا نے مسکرا کر پہلے تقی اور پھر انیلا بیگم کی سمت دیکھا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا آنٹی۔ آتے ہی

غصہ کرے گا اور مجھے یہاں سے نکل جانے کا کہے گا۔'' وہ ڈھیٹ تھی اور بہت ڈھیٹ تھی۔ اس کا اندازہ تقی کو ہو چکا تھا۔

''ارے نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ہمارے ہاں گھر آئے مہمان کی انسلٹ نہیں کی جاتی۔ اور تقی کیوں تمہیں گھر سے نکل جانے کا کہے گا۔ تم تو بہت ہی کیوٹ اور اچھی لڑکی ہو۔ تھینک گاڈ، تقی تمہارے دوستوں میں پہلی بار مجھے تمہاری اِس دوست سے مل کر بہت اچھا لگا۔'' انیلا بیگم نے مسکراتے ہوئے تقی سے کہا۔

''یہ میری دوست نہیں ہے۔ نکلو فوراً میرے گھر سے۔'' تقی اِس سے زیادہ ضبط نہیں کر سکتا تھا۔ اِسی لیے بنا کسی لحاظ کے بولا۔

''ارے تقی بیٹا۔'' انیلا بیگم فوراً تقی کی سمت بڑھیں۔

''آپ جائیں۔ آپ اندر جائیں۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''بیٹا میری بات....'' انیلا بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔ تقی نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں بولنے سے منع کیا۔ انیلا بیگم نے پلٹ کر رینا کی طرف دیکھا اور پھر تقی کی طرف دیکھ کر 'اِٹس اوکے' کہا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں۔

''تمہاری مام کافی ینگ ہیں۔'' رینا نے طمانیت سے کہا اور واپس صوفے پہ بیٹھنے لگی۔ مگر اِس سے پہلے کہ وہ صوفے پہ بیٹھتی، تقی نے سخت لہجے میں کہا۔

''مجھے ایسی حرکتوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ جا سکتی ہیں۔'' اُس نے اس کا بازو جھٹک کے چھوڑا۔

''عجیب انسان ہو۔ عام سے حلیے والی لڑکی کو اپنا کارڈ انتہائی احترام سے پکڑاتے ہو اور مجھ سے ڈر رہے ہو۔'' وہ کہہ کر مسکرائی۔

''میں تم سے کیوں ڈروں گا؟'' تقی اُس کی بات سے اچھل ہی تو گیا۔

''صاحب جی چائے۔'' ریحانہ نے دروازے سے سر نکال کر کہا۔

''کوئی چائے نہیں۔ لے جاؤ یہاں سے یہ سب۔'' تقی نے ٹرالی کی سمت اشارہ کیا جو ریحانہ کھینچ کر اندر لا رہی تھی۔

''ارے کس قدر ال مینرڈ انسان ہو تم۔ اتنی دور سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔ چائے تو ضرور پی کر جاؤں گی۔'' رینا نے یوں بے تکلفی سے کہا جیسے وہ دونوں بیسٹ فرینڈ ہوں۔

''کیا میں تمہارے اِس رویے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' تقی ڈھیلا پڑا۔

''سمپل، میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔'' رینا نے چائے بنانے کے لیے ٹرالی کو اپنی سمت موڑا۔ تقی نے اُس کی بات پہ لب بھینچے۔

''شوگر؟'' رینا نے خوب صورت مسکراہٹ چہرے پہ سجاتے ہوئے تقی سے یوں استفسار کیا جیسے وہ اُس کے گھر مہمان آیا ہو۔

''میرے پاس دس منٹ ہیں اور دس منٹ کے بعد مجھے جم جانا ہے۔ میں کسی کے لیے بھی اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتا۔ سو بہتر ہوگا، ہم ٹو دی پوائنٹ بات کریں۔'' تقی نے وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔ رینا کا رنگ بدلا۔ وہ کب ایسے رویے کی عادی تھی۔ وہ جہاں جاتی، اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ اُسے یوں ٹریٹ کیا جاتا جیسے وہ کسی ملک کی شہزادی ہو۔ اور یہ نوشیرواں....

''ایک منٹ گزر چکا ہے۔'' تقی کی آواز نے اُسے خیالوں کی وادی سے باہر نکالا۔ رینا نے ہاتھ میں پکڑے کپ کی طرف دیکھا اور پھر تقی کی طرف۔

''میں ود آؤٹ شوگر چائے پیتا ہوں۔'' اُس نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے ذرا سا آگے کی جانب کھسک کر رینا کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھام لیا اور پھر اپنی جگہ پہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے اُس نے

چائے کا ہونٹ لیا۔ رینا کا گرائی۔ اُس کا پرانا اعتماد لوٹ آیا۔ اس نے اپنے لیے چائے کا کپ تیار کیا اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھتے ہوئے تقی کی طرف دیکھا جو اُس کے بجائے سامنے کرسٹل کے پڑے ڈیکوریشن پیس کو دیکھ رہا تھا۔

''میں پچھلے تین ماہ سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔ اور تم میری آواز سنتے ہی فون بند کر دیتے ہو۔ کیا میں اس رویے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟''

''اس رویے کی کوئی وجہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' اُس نے اطمینان سے کہا۔

''کیوں بات نہیں کرنا چاہتے؟''

''اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا میں۔'' تقی نے کہہ کر سر جھٹکا۔

''تم میری انسلٹ کر رہے ہو؟'' رینا کا چہرہ سرخ ہوا۔

''تم اپنی انسلٹ خود کر رہی ہو۔'' وہ دوبدو بولا۔ رینا کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگی تھیں۔

''ایم سوری۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ ایک لڑکی ہو کر تم بنا کسی رشتے کے میرے گھر تک چلی آئی ہو۔ کیا یہ تمہارے عورت ہونے کی توہین نہیں۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ ان فیکٹ میں کسی بھی لڑکی کے ساتھ نہ تو فرینڈ شپ کرتا ہوں اور نہ ہی کوئی ریلیشن شپ بناتا ہوں۔ سو میں نے اُس دن ہوٹل میں انکار کر دیا تھا۔''

''کیا تم کمیڈ ہو؟'' وہ جیسے ہی سانس لینے کو رُکا، رینا نے سوال کیا۔ تقی نے ایک نظر اُٹھا کر رینا کو دیکھا۔ کیا تھا اُس کی اس نظر میں ..... تاسف، ترحم یا پھر کچھ اور..... وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

''کوئی بھی لڑکی اس قابل نہیں ہے جس کے ساتھ میں کمٹ منٹ کر سکوں۔ آئی ایم سوری ٹو سے اگر عورت کی ڈیفی نیشن یہ ہے۔'' اُس نے رینا کی سمت اشارہ کیا۔ ''تو مجھے ایسی کسی بھی لڑکی سے کمٹ منٹ میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔''

رینا کی رنگت متغیر ہوئی۔ ''تم میری انسلٹ کر رہے ہو۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''تم اپنی انسلٹ خود کر رہی ہو۔ یہ لباس پہن کر۔'' تقی نے اُس کے لباس کی طرف اشارہ کیا۔

رینا اس وقت وائٹ کلر کے ٹائٹ ٹراؤزر جو کہ اُس کی سفید دودھیا پنڈلیوں تک تھا، اوپر پنک کلر کا شارٹ کرتا پہنے ہوئی تھی۔ کرتا بھی وِد آؤٹ سلیوز تھا اور دوپٹہ ندارد۔

''آئی ایم سوری ایگین مس رینا صدیقی۔ میں ذرا اوتر ٹائپ کا انسان ہوں۔ میرے نزدیک عورت کوئی خوب صورت ڈیکوریشن پیس نہیں۔ جسے ہر کوئی آتے جاتے دیکھے۔ ہاتھ لگائے اور آخر میں اُس کی قیمت لگائے اور دل بہلانے کے لیے محبت نام کا کھیل کھیلنے لگے۔'' وہ کپ واپس ٹیبل پہ رکھ چکا تھا۔

''میرے سرکل میں ایسی ہی لڑکیاں ہیں۔ اب شاید یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے ایسا سرکل ملا۔ لیکن میں ایسی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا تو پھر اُن سے بات اور فرینڈ شپ کیوں کروں۔ میں اس مزاج کا بندہ نہیں ہوں۔ ہوپ فلی آپ میری بات سمجھ چکی ہوں گی۔ مجھے جم جانا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہوا۔

''تو آپ مجھے ان شارٹ ورڈز میں یہ باور کروا رہے ہیں۔ میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔'' رینا کا غصے سے برا حال ہو چکا تھا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ آپ اچھی ہوں گی۔ بہت اچھی ہوں گی۔ لیکن جب آپ ایک ہی سوال بار بار کریں گی تو مجھے اُس کا جواب دینا پڑے گا۔ اینی ہاؤ گڈ لک۔'' وہ کہہ کر جا چکا تھا اور رینا..... رینا کو لگا وہ جان بوجھ کر اس سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب کہہ کر گیا ہے۔

''اونہہ..... بڑا آیا۔'' وہ بڑبڑائی اور جھک کر اپنا پرس اُٹھا کر تک تک کرتی ڈرائنگ روم سے نکل

☆☆☆

''آپی۔'' آئمہ منزہ کے کمرے میں آئی۔

''ہاں!'' پیکنگ کرتے منزہ نے رُک کر آئمہ کی طرف دیکھا۔ فرمان اور منزہ کی آج رات دبئی کی فلائٹ تھی۔ اور وہ اسی سلسلے میں اپنی پیکنگ کر رہی تھی۔

''آپی! مجھے ماہا سے بات کرنی ہے اور میرے فون میں کریڈٹ ختم ہوگیا ہے۔ کیا میں آپ کا فون لے سکتی ہوں؟'' آئمہ نے کن انکھیوں سے سائیڈ ٹیبل پہ پڑے منزہ کے فون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔ وہ پڑا ہے فون۔'' منزہ نے فون کی سمت اشارہ کیا اور کیبنٹ کی طرف پلٹ گئی۔ آئمہ نے سرعت سے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل سے فون اُٹھالیا۔

''میں ابھی کال کر کے فون واپس کرتی ہوں۔'' آئمہ کہہ کر اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ لاک کر کے صوفے کے کنارے آبیٹھی۔

وہ منزہ کی کانٹیکٹ لسٹ چیک کر رہی تھی۔ شاید اس کے پاس تقی نوشیرواں کا نمبر ہو۔ اس نے منزہ کی کانٹیکٹ لسٹ کو دوبارہ چیک کیا۔ اس میں تقی کے نام سے کوئی بھی نمبر سیو نہیں تھا۔ آئمہ کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ ''واٹس ایپ پہ ہو؟'' ایک موہوم سی امید اُس کے اندر ابھری اور پھر اُس نے منزہ کے تمام سوشل نیٹ ورکس کو چیک کیا مگر وہ کہیں بھی ایڈ نہیں تھا۔ نہ واٹس ایپ، نہ انسٹاگرام اور نہ ہی فیس بک پہ۔

آنسوؤں کی نمی آنسوؤں میں ڈھلنے لگی تھی۔ اُسے یہ کیا روگ لگ گیا تھا۔ وہ محبت کرتے کرتے نڈھال ہو رہی تھی۔ اور مقابل کو خبر تک نہیں تھی۔

وہ جو بھی تھا لیکن آئمہ کے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر چکا تھا۔ وہ اسے اپنے حصار میں جکڑ چکا تھا۔ ایسا ان دیکھا حصار جس میں آئمہ کو اُس کے سوا کچھ دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ محبت ایسے تھوڑی ہوتی ہے جیسے آئمہ بختیار کو ہوئی تھی۔ یہ کیسی محبت کا آغاز تھا۔ جس میں محبوب ملنے سے پہلے ہی کھو گیا تھا۔ کیسی تڑپ تھی جس میں کسی پل آرام نہ تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ہاں وہ تقی نوشیرواں کے لیے رو رہی تھی۔ اُس کی محبت میں تڑپ رہی تھی۔

سنا ہوگا تم نے
کہیں آنکھوں کی رِم جھم کا
کہیں پلکوں کی شبنم کا
پڑھا ہوگا کہیں تم نے
کہیں لہجوں کی بارش کا
کہیں ساگر کے آنسو کا
مگر تم نے کبھی میرے ہمدم
کہیں دیکھے کہیں پر کے
کسی تحریر کے آنسو
مجھے تیری جدائی نے
یہی معراج بخشی ہے
کہ میں جو لفظ لکھتا ہوں
وہ سارے لفظ روتے ہیں

☆☆☆

رینا جب سے تقی کے گھر سے آئی تھی یونہی آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھے جا رہی تھی۔ آئینہ بتا رہا تھا اُس کا حسن کس قدر خیرہ کر دینے والا تھا۔ سامنے والے کی آنکھوں کو چندھیانے پہ مجبور کر دینے والا تھا۔ لیکن آج اُس نے کہا۔ ''اسے ایسی لڑکیاں پسند نہیں۔'' اُسے میری جیسی لڑکیاں پسند نہیں۔ یہ مذاق نہیں تو اور کیا تھا۔ ''کون ہے جو رینا صدیقی کو ناپسند کر سکتا ہے۔'' کوئی اُس کے اندر چلایا تھا۔

''تقی..... تقی نوشیرواں۔'' اُس کے لب ذرا سے ہلے۔ آنکھوں کی زمین پہ نمی ابھری۔ ریجیکشن کا درد بہت جان لیوا ہوتا ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی تو دانش نے اُس سے کہا تھا اور تب یہ ہلکی سی نمی اُس کی

آنکھوں میں تھی۔ اور تفاخر اور غرور سے گردن اُس کی تنی ہوئی تھی۔

''کم آن دانش، ڈونٹ بی اموشنل۔ تم بہت اچھے ہو۔ تمہیں کوئی بھی لڑکی پسند کرسکتی ہے اور تمہیں کبھی انکار نہیں کرسکتی۔''

''تو وہ اچھی لڑکی تم کیوں نہیں ہوسکتیں۔ تم کیوں مجھے انکار کررہی ہو؟'' وہ بے تابی سے گویا ہوا۔

''کیوں کہ مجھے ابھی محبت اور شادی جیسے جھنجھٹوں میں نہیں پڑنا۔ میں اپنی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ ہواؤں میں اُڑنا چاہتی ہوں۔ اور اتنے سوال تو کبھی میرے پاپا نے مجھ سے نہیں کیے۔ جتنے تم کررہے ہو۔'' وہ آخر میں ناک چڑھا کر بولی۔

''میں تمہیں کبھی کسی بھی بات کے لیے منع نہیں کروں گا۔ تم جو چاہتی ہو، کرنا۔ لیکن پلیز مجھے اِس طرح ریجیکٹ مت کرو۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''حد ہے بھئی۔ اِس میں کوئی زبردستی والی بات تو نہیں۔'' اُس نے اپنے گولڈن بالوں کو ادائے بے نیازی سے پرے جھٹکا تھا۔

''رینا.....'' دانش نے کچھ کہنا چاہا۔

''مجھے فہد کی برتھ ڈے پارٹی میں جانا ہے۔ اگر میں نہ گئی تو وہ سخت ناراض ہوجائے گا۔ اب میں چلتی ہوں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ دانش اُسے دیکھ کر رہ گیا تھا اور وہ گردن اکڑائے اُس کے سامنے سے اُٹھ آئی تھی۔

وہ تو اُس کی محبت کو ٹھکرا کر آئی تھی۔ اور آج تقی نوشیرواں نے بھی تو اُس کی دوستی کو انکار کیا تھا تو اتنی تکلیف کیوں ہورہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پارہی تھی اُسے کون سی بات زیادہ درد دے رہی تھی۔ تقی کا اُسے یوں اِگنور کرنا' بار بار اُسے جھڑکنا' اُس کے حلیے پہ یوں طنز کرنا یا پھر اُسے لحظہ بھر کے لیے ذرا بھی اہمیت نہ دینا۔

وہ پٹخی اور دھیرے دھیرے چلتی اپنے بیڈ پہ آ بیٹھی۔ دائیں بائیں پہلو میں رکھے ہاتھوں سے اُس نے بیڈ کی چادر کو اپنی مٹھیوں میں جکڑا۔ اُس کا ذہن تیزی سے کچھ تانے بانے بن رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اور پھر آخر کار اُس کے لبوں پہ بڑی پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ پشت کے بل بیڈ پہ گری اور چھت پہ چلتے پنکھے کو دیکھنے لگی۔ اُس کے لب مسکرا رہے تھے۔ آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ وہ اِس وقت بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اور ابھی اُسے بہت کچھ کرنا بھی تھا۔

☆☆☆

وہ جم سے جلدی لوٹ آیا تھا اور فریش ہونے کے بعد ڈنر کے لیے ٹیبل پہ آبیٹھا۔ انیلہ بیگم نے کھانا کھاتے نوشیرواں صاحب کی طرف دیکھا جو تقی کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ تقی اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔

''بابا مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' تقی نے سر اُٹھا کر باپ کی طرف دیکھا۔

''آں ہاں! شیور کرو۔'' نوشیرواں صاحب کہہ کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میں چند شارٹ کورسز کے لیے ابروڈ جانا چاہتا ہوں۔'' تقی نے چھری کی مدد سے چکن کے پیس کو الگ کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

''باہر کیوں؟ تم یہیں کسی اچھے سے انسٹی ٹیوٹ سے کورسز کرسکتے ہو۔'' نوشیرواں صاحب رُک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔

''ارے جانے دیں نا۔ ایک ہی تو ہمارا بیٹا ہے۔ اِس کی خواہش کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔'' انیلا بیگم نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہہ کر نوشیرواں کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مسکرائیں۔

تقی نے ایک نظر اُن کے اِس لگاوٹ بھرے انداز کو دیکھا۔ عجیب سا غصہ اُس کے اندر اُبلنے لگا تھا۔ اُس نے ناگواری سے اپنے باپ کو محبت لٹاتی نظروں سے اپنی بیگم کو دیکھتے ہوئے دیکھا۔ اور اگلے ہی لمحے اُس نے چمچہ پلیٹ میں پٹخا۔ چمچے کے

ہوئے۔

''چلو ٹھیک ہے۔ جیسے تم چاہو۔'' نوشیرواں صاحب نے فوراً ہی اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

''تھینک یو!'' وہ رکھائی سے کہہ کر اُٹھنے لگا تھا جب نوشیرواں صاحب کی آواز آئی۔

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے کہہ کر انیلہ بیگم کو پانی گلاس میں ڈالنے کا اشارہ کیا۔

تقی واپس اپنی جگہ پہ بیٹھ چکا تھا اور استفہامیہ نظروں سے باپ کی سمت دیکھنے لگا۔ ''آج ایک لڑکی گھر آئی تھی۔ کیا نام تھا اُس کا؟'' وہ لحظہ بھر کے لیے رُکے اور انیلا کی طرف دیکھا۔

''رینا، رینا صدیقی۔'' تقی انیلا بیگم کے بولنے سے پہلے ہی بول اُٹھا تھا۔

''ہاں وہی۔ تمہاری مام بہت تعریفیں کر رہی ہیں اُس کی۔ خوب صورت پڑھی لکھی اور ویل آف فیملی۔ تو میں یہ پوچھ رہا ہوں۔ تمہاری فرینڈ ہے یا فرینڈ سے کچھ زیادہ؟''

تقی کے ماتھے پہ دو لکیریں نمودار ہوئیں۔ ''نہ وہ میری فرینڈ ہے اور نہ ہی فرینڈ سے زیادہ۔'' اُس نے حتمی سے جواب دیا۔

''بات یہ ہے برخوردار! تمہاری پڑھائی مکمل ہو چکی ہے۔ جلد ہی تم اپنا فیملی بزنس اون کر لو گے۔ تو میں اور تمہاری مام چاہتے ہیں کہ ساتھ ہی تمہاری شادی کے فرض سے بھی سبک دوش ہو جائیں۔ رینا اچھی لڑکی ہے تو پھر کیا خیال ہے' میں اور تمہاری مام اُس کے گھر.....''

''فار گاڈ سیک پاپا۔ آپ لوگ اتنا آگے کا کیوں سوچ لیتے ہیں۔ کچھ اور تو دور کی بات ہے۔ وہ میری فرینڈ بھی نہیں ہے۔ آپ پلیز اتنا مت سوچا کریں اور مجھے ویسے بھی ابھی شادی نہیں کرنی۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہوا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا۔ تقی کو معلوم بھی نہیں ہو گا وہ کون ہے؟ وہ تو میں نے اُس سے ساری انفارمیشن لے لی تھی۔'' انیلا بیگم پرجوش لہجے میں بولیں تو تقی اُلجھ کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ ایک ایم این اے کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اُس کے ایک ماموں بیورو کریٹ ہیں اور ایک تایا ریٹائرڈ جج ہیں۔''

''تو؟'' تقی نے ماتھے پہ تیوریاں چڑھا کر قدرے تیز لہجے میں کہا۔ اُس کے لہجے کی تیزی سے خائف ہو کر انیلا بیگم نے مدد طلب نظروں سے اپنے شوہر کی سمت دیکھا۔

''تو یہ کہ فیملی میں تو تم پہلے ہی شادی سے انکار کر چکے ہو۔ حالاں کہ انیلا کی بہن کی بیٹی شفا تمہارے لیے پرفیکٹ تھی۔ انیلا اور میرا کنڈیل تھا۔ لیکن تم مان کر نہ دیے۔ اب کہیں نہ کہیں تو تمہاری شادی کرنی ہے تو پھر رینا صدیقی ہی سہی۔ ایسے موقع زندگی میں ایک بار ہی ملتے ہیں۔ انہیں گنوانا بے وقوفی ہے۔ رینا صدیقی سے دوستی کرو۔ اُسے اپنی طرف متوجہ کرو۔ یقین کرو' یہ رشتہ ہمیں رشتہ داری کے علاوہ کاروباری لحاظ سے بھی بہت فائدہ دے گا۔'' زبان بے شک نوشیرواں صاحب کی تھی مگر الفاظ انیلا بیگم کے تھے۔

تقی کے ماتھے پہ موجود بلوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''آپ کو اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی میں نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ اتنا کافی ہے یا مجھے کچھ اور بھی کہنا پڑے گا۔'' تقی نے رُک کر نوشیرواں صاحب سے استفسار کیا۔

''لیکن بیٹا.....'' انیلا بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

''مجھے جو کہنا تھا' میں کہہ چکا ہوں۔ اب اِس ٹاپک پہ مزید بات نہیں ہو گی۔'' تقی نے دوٹوک لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باہر نکل گیا۔

''نوشیرواں! آپ ہی کچھ تقی کو سمجھائیں۔'' غصہ تو انیلا بیگم کو بہت آ رہا تھا۔ مگر اظہار کا موقع نہیں تھا۔ اِسی لیے انہوں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان

نارمل رکھا۔
''میں کھانا کھا سکتا ہوں۔'' نوشیرواں نے پلٹ کر اپنی شریکِ حیات سے پوچھا تو انیلا بیگم بہت کچھ کہنے کی حسرت دل میں چھپائے سر کو اثبات میں ہلا گئی تھیں۔

☆☆☆

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ سورج چاند ستارے بھی اپنی جگہ پہ تھے۔ زندگی بھی ویسی ہی تھی۔ بظاہر آتو آئمہ بھی ویسی ہی تھی۔ مگر اُس کے اندر کچھ بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ اندر کی دنیا بدلی تو انداز بھی بدل گئے تھے۔ وہ پہلے کی طرح بہت باتیں نہیں کرتی تھی۔ اُس کی ہنسی کی کھنک بھی ویسی نہیں تھی اور اب وہ ہنستی بھی کہاں تھی۔ بہت ہوا، بس مسکرادی۔ مما بابا' منزہ آپی فرمان بھائی دن میں کتنی بار اُس سے پوچھتے وہ خاموش کیوں ہے؟ ہنستی کیوں نہیں؟ کبھی وہ خاموش ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دیتی تو بھی چڑ کر رونے لگتی۔ اور اب تو گھر میں اور بھی خاموشی کا راج چھا چکا تھا۔ فرمان بھائی، منزہ آپی کے ساتھ دبئی جا چکے تھے۔ جانے سے پہلے منزہ نے اُس سے کتنا پوچھا تھا کہ وہ کیا چھپا رہی ہے؟ وہ ان سے کیا کہتی۔ جو وہ چھپا رہی ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتی۔

☆☆☆

''آئمہ، آئمہ۔'' وہ جو بری طرح اپنے خیالوں میں مستغرق تھی' ہڑبڑا کر چونکی اور اپنے پاس بیٹھی ماہا کو دیکھنے لگی۔
''یہ لو، یہ اُس کا نمبر ہے۔'' اُس نے ہاتھ میں پکڑی چٹ آئمہ کی طرف بڑھائی۔
''کس کا؟'' وہ غائب دماغی سے پوچھ رہی تھی۔
''تقی نوشیرواں کا۔'' لفظ تھے کہ آبِ حیات جس نے مرتی ہوئی آئمہ کے وجود میں نئی زندگی ڈالی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس چٹ کو دیکھ رہی تھی۔ جس پہ تقی نوشیرواں کا فون نمبر درج تھا۔
''تمہیں کہاں سے ملا؟'' اُس کی سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔
''مت پوچھو، کیسے لیا اور کہاں سے لیا۔ لو اُسے فون کرو۔ اور اُسے بتا دو۔ جو بھی دل میں ہے۔ تاکہ دل سے اس یک طرفہ محبت کا بوجھ کچھ تو کم ہو۔'' ماہا نے کہتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھاما اور اُس کی ہتھیلی پہ وہ چٹ رکھ دی۔ آئمہ نے کسی قیمتی شے کی مانند اُس چٹ کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔
''اگر اُس نے مجھے جھڑک دیا؟'' ایک اندیشہ سنسناتا ہوا اُس کے لبوں سے نکلا۔
''وہ محبت ہی کیا، جس میں خوف نہ ہو' ڈر نہ ہو۔ تم ایک..... ایک بار اپنے دل کی بات کو اُس پہ آشکار کر دو۔ لیکن بس ایک بات یاد رکھنا آئمہ۔ اپنی محبت کے وقار کو کبھی بھی مجروح مت کرنا۔ اُسے ملنے سے مشروط مت کرنا۔ وہ تم سے محبت کرے یا نہ کرے۔ اگر وہ تمہاری محبت کی عزت کرے تو بہت ہوگا۔ زبردستی کے رشتے چاہے وہ دل کے ہوں یا پھر کاغذ کے، کبھی سکون نہیں دیتے۔ کبھی ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتے۔ کوشش کرنا تمہاری محبت کو کچھ ملے نہ ملے، عزت ضرور ملے۔'' ماہا کہہ کر رُکی اور آئمہ کی آنسو بھری آنکھوں میں دیکھا۔
''تم رو کیوں رہی ہو؟'' وہ حیران ہوئی۔
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ماہا! یہ محبت بھی بڑی عجیب شے ہے۔ دیکھو میں نے کب سوچا تھا' مجھے اس طرح یوں انجان شخص سے محبت ہو جائے گی۔ جو شخص ہمیں گاڑی میں لفٹ نہ دے۔ جو اونچا ہنسنے پہ ناگواری سے ہمیں دیکھتا ہو۔ وہ میرے محبت کے اظہار کو کیا سمجھے گا۔ وہی جو اُس دن اُس نے غصے میں کہا تھا۔ نہیں ماہا' میں اور میری محبت اتنی ارزاں نہیں کہ اُسے یوں ٹھکرا دیا جائے۔ میں اُس سے بات نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔'' آئمہ نے نفی میں سر ہلایا اور ہاتھ کی مٹھی میں بند اُس کاغذ کے ٹکڑے کو کئی ٹکڑوں میں منتشم کر دیا۔
''عورت کا غرور یہ ہے' مرد اُس سے اظہار

میں پہل کرے۔ اگر میں نے اُسے اپنی محبت پیش کی اور اُس نے بری طرح میری محبت کو ٹھکرا دیا تو نہ میرے پاس محبت کا مان بچے گا اور نہ ہی عورت ہونے کا غرور۔ میں نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے ناں ماہا؟'' آئمہ نے رُک کر ماہا سے تائید چاہی۔ اور ماہا کا سر اثبات میں ہل گیا۔

اُس نے آگے بڑھ کر اپنی دوست کو گلے سے لگا لیا۔ ''میں تمہارے لیے بہت دعا کروں گی آئمہ۔ وہ تمہیں مل جائے۔ لیکن کچھ دعائیں قبولیت کی منزل نہیں پاتیں اور اگر تمہاری یہ دُعا قبول نہ ہوئی تو.....'' ماہا نے آئمہ کے گلے سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دُعا قبول نہیں ہوتی جو دُعا قبول نہیں ہوتی اُس کا اجر اللہ اپنے بندے کو آخرت میں دے گا۔ اور اس اجر کو دیکھ کر بندہ اپنے کہے گا' کاش میری کوئی بھی دعا قبول نہ ہوئی ہوتی۔ ہمیں اپنے رب سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا۔ میں اللہ سے کہوں گی' اُس کے مل جانے میں میرے لیے بہتری ہے تو مجھے اُس سے ملوا دے۔ اور اگر وہ نہ ملا، میں پھر بھی خوش رہوں گی۔ جب میں نے اپنی رضا کو اُس کی رضا سے باندھ لیا۔ پھر کیوں رونا، کیوں واویلا کرنا۔'' آئمہ کے لبوں پہ اطمینان بھری مسکراہٹ ابھری تو ماہا نے مسکرا کر ایک بار پھر اُسے گلے لگا لیا تھا۔

''چلو آؤ، اب ہم اپنی کلاس اٹینڈ کریں۔'' آئمہ نے ہاتھ میں پکڑے ٹکڑوں کو گلاس پہ گرا دیا اور اپنا ہاتھ ماہا کی سمت بڑھا دیا۔ جسے ماہا نے فوراً تھام لیا تھا۔ اور اب وہ دونوں آہستہ آواز میں باتیں کرتی کلاس کی طرف جا رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی جم میں داخل ہوا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس رینا تقی کے سامنے آ گئی۔ ''ہائے! آئی ایم نیو کمر ان دس جم۔ ویلکم نہیں کہو گے۔'' وہ لبوں پہ مسکراہٹ سجائے اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ تقی نے ایک خفگی بھری نگاہ رینا پہ ڈالی اور پلٹ کر رننگ مشین کی طرف بڑھ گیا۔

''کل تمہارے گھر آنے کے بعد بہت سوچا۔ سوچا تمہاری باتوں کو اور پھر یہ فیصلہ کیا کہ میں ایسی ہی رہوں گی اور ایسی ہی رہ کر تم سے شادی بھی کروں گی۔ لیکن بدلنا تو پڑے گا' کسی ایک کو اور بدلو گے تم۔'' وہ کہہ کر ہنسی۔

''سوچیپ۔'' تقی نے قہر برساتی نظروں سے اُسے دیکھ کر کہا اور رننگ مشین کا بٹن آن کر دیا۔ اُسے رننگ کرتے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ تقی نے جھنجھلا کر بٹن آف کیا اور اپنے چہرے آئے پسینے کو ٹاول سے صاف کرتا نیچے اُتر آیا۔ سامنے ہی رینا لبوں پہ مسکراہٹ سجائے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تقی جم کے بیرونی دروازے کی سمت بڑھ چکا تھا جب رینا ایکسر سائز کرنے کے لیے انسٹرکٹر کی سمت متوجہ ہوئی تھی۔ ''ایک، دو، تین یا پھر کتنے دن تک تم مجھے اِگنور کرو گے مسٹر تقی۔'' وہ دل ہی دل میں اُسے مخاطب کرتی ایکسر سائز شروع کر چکی تھی۔

☆☆☆

رینا صدیقی نے تقی نوشیرواں کو پانے کے لیے ہر جگہ اُس کا پیچھا کیا۔ وہ جہاں جاتا رینا وہاں پہنچ جاتی۔ رینا تو اب اُس کے گھر بھی آنے جانے لگی تھی۔ انیلا بیگم کے ساتھ ساتھ نوشیرواں خان بھی رینا کے فین ہو چکے تھے۔ مگر جس کے لیے یہ سب محنت کی جا رہی تھی وہی انجان بنا پھر رہا تھا۔

وہ رینا کو دیکھ کر یوں ان دیکھا کرتا جیسے اُسے جیتی جاگتی سانس لیتی رینا نظر ہی نہیں آتی تھی۔ پتا نہیں تقی نوشیرواں کا دل گوشت کا تھا یا پھر پتھر کا۔ رینا کو تو پتھر کا لگنے لگا تھا۔ جس پہ کوئی جذبہ' کوئی احساس اثر ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ مغرور زیادہ تھا یا پھر بے حس' رینا کبھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ مگر وہ جو بھی تھا رینا کو اب جان سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ ہاں انا اور اُس کو جھکانے کی جنگ تو رینا کب سے ہار چکی

تھی۔ اب تو محبت کی جنگ تھی' جسے وہ کسی بھی صورت ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ اور عجب بات تھی اس محبت میں وہ اتنا کچھ کھو چکی تھی کہ خود کو بھول چکی تھی۔

اُسے خود بھی خبر نہیں تھی' کب وہ بدل گئی' کب اُس کا حلیہ بدلا۔ جینز اور ٹائٹ شرٹ سے وہ لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں آ چکی تھی۔ دوپٹہ جو کبھی بھی اُس کے لباس کا حصہ نہیں رہا تھا یا پھر کبھی لیا بھی تو لپیٹ کر گردن کے ساتھ لگا کر لیا جاتا تھا' اب اُس کے ہر لباس کے ساتھ اہم جزو بن چکا تھا۔ گردن میں رسی کی مانند پڑا دوپٹہ کھل کر سینے پہ آ گیا تھا۔ وہ کتنا بدلی تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ یہ تو اُس کے ساتھ رہنے والے' اُس کے دوست' اُس کے کولیگ بتاتے تھے کہ وہ رینا صدیقی نہیں رہی ہے اور وہ مسکرا دیتی۔ ''ہاں میں رینا صدیقی نہیں رہی۔ رینا کچھ نہیں جانتی تھی' سوائے اس کے وہ اُس سے محبت کرتی ہے اور بے تحاشا کرتی ہے۔

اور تیسری طرف تقی نوشیرواں تھا۔ بیک وقت دو لڑکیوں کی محبت کا واحد حق دار۔ ایک کی محبت اُس کی نظروں کے سامنے تھی مگر وہ دیکھ کر بھی ان دیکھا کرنے کا فن جانتا تھا اور دوسری خاموش محبت' جس سے وہ بے خبر تھا۔ مگر وہ بھی آخر انسان تھا' جیتا جاگتا..... سانس لیتا..... جذبوں کو محسوس کرتا' وہ جھنجھلا جاتا۔ جیسے ہی رینا اُس کے سامنے آتی ماتھے پہ بلوں کا جال نمودار ہونے لگتا۔ وہ کیسے بتاتا.....؟ جو وہ محسوس کرتا تھا' جو وہ سوچتا تھا' اُس کی خبر کسی کو بھی نہیں تھی۔ رینا اور اُس کی محبت کی شدتوں سے گھبرا کر وہ اگلے چند ماہ بعد ہی اپنے صوفی دادا کے پاس برلن آ گیا تھا۔ وہ محبت کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر یہ اُس کی خام خیالی تھی۔

☆☆☆

باہر برف باری ہو رہی تھی۔ تقی کان سے فون لگائے کھڑکی کے پاس کھڑا نرم نرم سفید برف کو گرتا دیکھ رہا تھا۔ سفید رنگ ہر شے پہ چھایا ہوا تھا۔ سڑک کنارے نفاست سے تراشے گئے درخت اِس وقت سفید پیراہن میں ملبوس تھے۔ سڑک پہ اِکا دُکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

''پاپا! مجھے شادی نہیں کرنی۔ آپ کر لیں یا پھر ایسا کرتے ہیں ہم صوفی دادا کی شادی کروا دیتے ہیں۔'' تقی نے صوفی دادا کو آتا دیکھ کر انہیں چھیڑا' جو ہاتھ میں دو مگ کافی کے اُٹھائے تقی کی طرف آ رہے تھے۔

''آئیڈیا برا نہیں۔'' صوفی دادا نے ہاتھ میں پکڑا مگ تقی کی طرف بڑھاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ مگر دوسری طرف سے آتی آواز سن کر اُس کے لب فوراً ہی سمٹے اور آنکھوں میں خفگی ابھری۔ ''مجھے رینا سے شادی نہیں کرنی۔ وہ اچھی لڑکی ہو گی لیکن میرے ٹائپ کی نہیں۔ آپ کے پاس کوئی اور بات ہے یا پھر میں فون بند کر دوں۔'' وہ انتہا درجے کی رکھائی سے بولا۔

دوسری طرف سے جانے کیا کیا کہا جا رہا تھا۔ بے زاری اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ صوفی دادا نے اپنا ہاتھ اُس کی سمت بڑھایا اور فون انہیں دینے کا اشارہ کیا۔ تقی نے فوراً ہی ہاتھ میں پکڑا فون انہیں پکڑا دیا اور پلٹ کر لاؤنج میں آ کر ٹی وی آن کر کے اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں کو سامنے ٹیبل پہ رکھے وہ گردن کو صوفے کی بیک پہ گرائے مندی مندی آنکھوں سے نیوز کاسٹر کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ یاد آ رہا تھا وہ جو کبھی یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آنکھوں میں کرچیاں سی بھرنے لگی تھیں۔ جیسے کسی نے ننھے منے شیشے کے ٹکڑے اُس کی آنکھوں میں ڈال دیے ہوں۔

''ماضی کو بھول جانے میں ہی عافیت ہے۔'' صوفی دادا کی آواز اُس کی پشت پہ ابھری۔ تقی نے پوری آنکھیں کھولیں' گردن کو ذرا سا گھمایا اور صوفی دادا کی سمت دیکھا جو دھیرے دھیرے چلتے اُس کے قریب صوفے پہ آ بیٹھے تھے۔ ستر سال کی عمر

ہونے کے باوجود صوفی دادا فٹ اور ایکٹو تھے۔ اکثر لوگ تو نوشیرواں خان کو صوفی دادا کا بھائی اور تقی کو اُن کا بیٹا سمجھتے تھے۔ تقی تھا بھی اُن کا پرتو، ویسا ہی لمبا قد، سرخ و سفید رنگت اور ان ہی کی جیسی عادات۔

''کیوں برخوردار، نظر لگانے کا ارادہ ہے۔''

صوفی دادا تقی کا ارتکاز محسوس کر چکے تھے۔ اِس لیے ہلکے پھلکے انداز میں اُسے چھیڑا۔ تقی دھیرے سے مسکرا دیا اور سر جھٹک کر اپنے سامنے پڑے کافی کے مگ کو اُٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

''بھئی تمہاری مرحومہ دادی کہا کرتی تھیں' کوئی بھی آپ کو یوں دیکھے مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اور آپ کو نظر لگ جایا کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے' آپ چڑچڑے ہو جاتے ہیں یا پھر کسی نہ کسی کے ساتھ لڑائی۔ ویسے ٹھیک ہی کہتی تھیں، تمہاری دادی مرحومہ۔ دیکھو اِس وقت مجھے لگ رہا ہے۔ طبیعت میں چڑچڑاہٹ ہو رہی ہے۔ اور لڑائی بھی ہونے والی ہے۔'' صوفی دادا نے کافی کا گھونٹ اپنے اندر انڈیلتے ہوئے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔

''ایسا کریں، آپ جا کر پہلے اپنی نظر اتار لیں۔ کیوں کہ میرا بحث کا بالکل بھی موڈ نہیں۔'' تقی نے کہتے ہوئے ریموٹ اُٹھایا اور چینل سرچ کرنے لگا۔

''تمہارے دِل میں اتنی بدگمانی کی دھول کیوں ہے تقی؟ دیکھو بیٹا ایسا.....''

''صوفی دادا! مجھے اِس ٹاپک پہ کوئی بھی بات نہیں کرنی۔'' وہ قطعیت بھرے لہجے میں بولا۔

''کیوں بات نہیں کرنی؟ آخر میرے بھی کچھ ارمان ہیں۔ کچھ خواہشیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں' میں تمہارے بچوں کو دیکھوں۔ انہیں اپنی گود میں کھلاؤں۔'' صوفی دادا نے اُسے جذباتی کرنا چاہا۔

''ایسا کریں' اگر آپ کو بچوں کا اتنا ہی شوق ہے تو خود کر لیں شادی۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

لاکھوں دلاتو گا۔ اب اِس عمر میں شادی کرنا اچھا لگوں گا میں۔ بیٹا جی وہاں تمہاری دادی بے قراری سے میرے انتظار میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہی ہوں گی کہ صوفی آئے اور کب وہ مجھے پھر سے ساری روداد سنائے۔ جیسے مشورے تم دے رہے ہو۔ کیوں اپنی مرحومہ دادی کو ہارٹ اٹیک کروانے کا ارادہ ہے۔'' صوفی دادا نے کہتے ہوئے اُسے گھورا۔ جواباً تقی بھی اُنھیں گھور کر رہ گیا۔

''اگر آپ کو میری مرحومہ دادی کی اِتنی ہی فکر ہے تو براہِ مہربانی ایسی باتوں سے گریز کریں۔ ورنہ میں آپ کو اِسی وقت نرسری میں لے جاؤں گا۔ وہاں پہ موجود بچے دیکھ کر خوش ہو جایئے گا آپ۔ یا آپ کہتے ہیں تو ایک عدد بچے کو اڈاپٹ نہ کر لیں ہم۔''

اُس نے اپنی جانب گھورتے ہوئے صوفی دادا سے کہا اور آخر میں ہنس پڑا۔ لیکن اِس بار اُس کی ہنسی میں صوفی دادا کی ہنسی شامل نہیں تھی۔ یعنی وہ بے حد سیریس تھے۔ تقی نے گہرا سانس لیا اور اپنا چہرہ ٹی وی کی سمت موڑ لیا۔

''ہر عورت بُری نہیں ہوتی تقی۔'' صوفی دادا بولے اور ریموٹ اُٹھا کر بولتی ہوئی نیوز کاسٹر کی آواز کو بند کر دیا۔

''صوفی دادا مجھے۔'' تقی نے کچھ کہنا چاہا لیکن صوفی دادا نے اُسے بولنے سے منع کر دیا۔

''عورت بڑی عجیب شے ہوتی ہے بیٹا۔ اِس کے پاس ایک مرد کو دینے کے لیے کچھ ہو نہ ہو۔ رشتوں کو دینے دِلانے میں بڑی سخی ہوتی ہے۔ کبھی ماں کے روپ میں، کبھی بہن، کبھی بیوی تو کبھی بیٹی۔ محسوس کرو بیٹا' کتنے رنگ اِس عورت سے جڑے ہیں۔''

''مجھے کچھ بھی محسوس نہیں کرنا صوفی دادا۔ اور اگر مجھ سے تنگ آ گئے ہیں تو صاف کہہ دیں' میں آپ کے پاس سے بھی چلا جاؤں گا۔'' وہ ناراض ہوا۔

''ٹھیک ہے، چلے جاؤ۔ لیکن پہلے میری باتیں سُن لو۔'' صوفی دادا کے اطمینان میں رتی بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ تقی جانتا تھا اُسے اب صوفی دادا کو سننا پڑے گا۔ اِسی لیے اُس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور ٹی وی میں نظر آتی حسینہ کی سمت دیکھنے لگا۔

''عورت کے پاس دو ہی جذبے ہوتے ہیں۔ محبت کرنا اور پھر ٹوٹ کر کرنا۔ محبت ایک ایسا نشہ ہے جس کے سُرور عورت کو مدہوش کر دیتے ہیں۔''

''اور اِس مدہوشی کا مرض اُسے کسی بھی عمر میں لاحق ہو سکتا ہے۔'' تقی نے ہنوز نظریں ٹی وی پہ جمائے ہوئے صوفی دادا کے جواب میں کہا۔

''پہلے میری بات مکمل ہونے دو۔ پھر اپنی بات کرنا۔'' صوفی دادا اُس کے ٹوکنے پہ ناراض ہوئے۔ تقی نے ہلکا سا سر جھٹکا۔

''اور دوسرا جذبہ وفاداری ہے۔ عورت سے بڑھ کر وفا کرنے والا تمہیں روئے زمین پہ کوئی نہیں ملے گا۔ عورت محبت میں دھوکا دے سکتی ہے۔ لیکن وفاداری میں نہیں۔ اس لیے ایک عورت کی غلطی کو سب عورتوں سے منسوب مت کرو۔ دیکھو، پرکھو گے تب ہی تم عورت کی اس صنف سے آشنا ہو گے۔''

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' وہ اب کے بری طرح چڑا تھا۔

''میں جانتا ہوں جو تم پہ گزرا۔ لیکن بیٹا.....!''

''آپ صرف جانتے ہیں صوفی دادا! سمجھتے نہیں۔ سمجھنے اور جاننے میں بہت فرق ہے۔ ایک خوف، ایک ڈر کنڈلی مار کر ہمیشہ کے لیے اندر رہ جاتا ہے اور آپ مجھے سمجھا رہے ہیں۔ مجھے ایک عورت پہ یقین کر لینا چاہیے۔ اُس کی محبت پہ ایمان لے آنا چاہیے۔ نہیں، میں وہ غلطی کبھی نہیں دُہراؤں گا۔ مجھے عورت کی محبت پہ یقین ہی نہیں۔ عورت جھوٹی ہوتی ہے۔ مکار ہوتی ہے۔ دل میں کسی اور کو رکھتی ہے اور زندگی دوسرے شخص کے ساتھ گزارتی ہے۔ اور پھر جب کبھی زندگی میں، دل میں بسا مرد اُس کے مقابل آ جائے تو وہ سب بھول جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے شوہر، اپنے گھر اور اپنی اولاد تک کو بھی۔'' وہ بولنے پہ آیا تو بولتا چلا گیا۔ وہ رُکا، سامنے پڑا گلاس منہ سے لگایا اور زور سے واپس میز پہ رکھا۔

''بس یا کچھ اور کہنا ہے۔'' اُس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے جو تم سے محبت کرتی ہے۔ اُس سے شادی مت کرو۔ ہم بہت اچھی لڑکی دیکھ کر تمہاری شادی کر دیتے ہیں۔'' صوفی دادا نے جلدی سے کہا تو تقی منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

''ویسے یار! عجیب بات ہے۔ جو لڑکی دل و جان سے تم پہ فدا ہے، تم اُس سے شادی کرنے پہ رضا مند نہیں۔ کوئی ریکارڈ بنانے کے چکر میں تو نہیں۔'' صوفی دادا واپس اپنے مزاح کے موڈ میں آ چکے تھے اور وہ ایسا جان بوجھ کر کر رہے تھے تاکہ تقی کا موڈ کچھ تو فریش ہو۔

''جو لڑکی بنا کسی رشتے، بنا کسی تعلق کے میرے گھر تک پہنچ سکتی ہے۔ وہ کل کو مجھے بھی چھوڑ کر بھی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی عزت خود نہیں کر رہی۔ میری عزت کیوں رکھے گی۔''

اس بار صوفی دادا اُسے دیکھ کر رہ گئے۔ ماضی کی تلخ یادوں نے اُسے کس قدر مجروح کر دیا تھا۔ وہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا، لیکن اندر سے وہ کس قدر شکستہ تھا۔ یہ صوفی دادا سے کوئی بھی بہتر نہیں جانتا تھا۔ اِسی لیے انہوں نے فی الوقت اس موضوع کو یہیں ختم کیا اور ریموٹ اُٹھا کر لب ہلاتی نیوز کاسٹر کو آواز سے نواز دیا۔

☆☆☆

''لڑکی بہت ہی اچھی، سمپل اور انتہائی خوب صورت ہے۔ تقی کے ساتھ پرفیکٹ رہے گی۔ آپ تقی سے بات کریں۔ رہنا سے نہ سہی، اِس لڑکی کے لیے تو ہاں کر دے۔'' نوشیرواں صاحب صوفی دادا سے منت آمیز لہجے میں گویا تھے۔

''وہ ابھی تک اُس واقعے کو نہیں بھلا پایا ہے

نوشیرواں۔" صوفی دادا پوتے کے لیے سخت فکر مند تھے۔ نوشیرواں صاحب لحظہ بھر کے لیے خاموش ہوئے۔

"جو ہوا اُس میں ہمارا یا تقی کا کیا قصور؟ میں نے تو ہر ممکن کوشش کی تھی۔ لیکن....." نوشیرواں صاحب خاموش ہوئے۔

"ابا جان! میں اپنے بچے کی خوشیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُسے اپنے گھر میں ہنستا بستا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش اتنی بڑی تو نہیں۔" وہ چند لمحوں بعد بولے تھے۔

"خواہشیں بڑی نہیں ہوتیں۔ بس کچھ خواہشوں کے نتائج..... بڑے ہوتے ہیں۔" صوفی دادا نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ابا جان کیا آپ کو لگتا ہے۔ اس سارے قصے میں میری کوئی غلطی تھی۔ میں تو خود ٹوٹ گیا تھا۔ بکھر گیا تھا۔ کس قدر جاں گسل تھیں وہ گھڑیاں' کتنی جان لیوا۔" درد اُن کے لہجے سے عیاں تھا۔ بیٹے کو اداس ہوتا دیکھ کر صوفی دادا خود بھی اداس ہو گئے تھے۔

"فکر مت کرو۔ میں اُسے راضی کر لوں گا۔ مجھے اُسے راضی کرنا آتا ہے۔" صوفی دادا نے امید کا جگنو بیٹے کے ہاتھ میں تھمایا اور فون بند کر کے بے تابی سے تقی کا انتظار کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

اُس دن برلن میں برف باری بہت ہو رہی تھی اور اُس گھر میں موجود صوفی دادا اور تقی کی بحث بھی اُسی شدومد سے جاری تھی۔ اگر تقی کی نا تھی تو صوفی دادا آج اُسے ہر صورت ہاں میں بدل دینا چاہتے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ اگر میری کسی بھی بات کی کوئی ویلیو نہیں تو تم یہاں میرے پاس کیا کر رہے ہو۔ جا سکتے ہو اور ہاں میرے مرنے کی خبر بھی ملے تب بھی آنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہ لوں گا۔ تمہارے ساتھ نہیں۔" صوفی دادا نے خفگی سے کہا۔

"یہ سراسر بلیک میلنگ ہے صوفی دادا۔" وہ اُن کے مرنے کی بات پہ ڈسٹرب ہوا۔ کچھ بھی سہی وہ اپنے دادا سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور اُن کی یہ بات سُن کر اُسے بہت بُرا لگا تھا۔

"بلیک میلنگ نہیں برخوردار! حقیقت ہے۔ بلکہ میں اپنی وصیت میں لکھ دیتا ہوں' مرنے کے بعد میری شکل تمہیں نہ دکھائی جائے۔" صوفی دادا نے تو جذباتی پن کی حد ہی کر دی تھی۔ اور تقی جو پچھلے ڈیڑھ سال سے اُن کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ سٹپٹا ہی تو گیا تھا۔

"اپنے لائر کو فون کرنے لگا ہوں۔" صوفی دادا نے سیل فون اپنی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"دِس از رئیلی ناٹ فیئر صوفی دادا۔" تقی صوفے سے اُٹھ کر اُن کے پاس آ بیٹھا۔

"اب تو فیئر تب ہی ہوگا' جب تم ہاں کرو گے ورنہ..... جی مسٹر پیٹر۔" کہتے ہوئے اُنھوں نے کن اکھیوں سے پوتے کی طرف دیکھا۔ "جی ایکچوئیلی مجھے اپنی وصیت میں تھوڑی ردوبدل کروانی تھی۔"

"صوفی دادا!" تقی نے اُن کے ہاتھ سے فون لیا اور مسٹر پیٹر سے معذرت کرنے کے بعد فون آف کر دیا۔ "ٹھیک ہے آپ جو کہیں گے' میں ویسے ہی کروں گا۔ لیکن پلیز آپ ایسی بات دوبارہ مت کیجیے گا۔" تقی نے اُن کے وجود کو اپنی مضبوط بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"مطلب تم شادی کے لیے مان گئے۔" صوفی دادا کو اُس کے اتنی جلدی مان جانے پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ایسی دھمکیاں دیں گے تو پھر ماننا ہی پڑے گا۔"

وہ منہ بنا کر کہتا ہوا اُن سے الگ ہوا تو صوفی دادا بے اختیار ہی اُس سے لپٹ گئے۔ اور چٹاچٹ اُس کی بلائیں لے ڈالیں۔ انہیں بے طرح خوش

ہوتے دیکھ کر تقی کے دل میں سکون سرائیت کرنے لگا۔ اپنوں کی خوشی کتنی خوشی دیتی ہے۔ کوئی اُس لمحے صوفی دادا کو دیکھتا۔ تقی کے ہاں کرتے ہی صوفی دادا نے فوراً ہی نوشیرواں صاحب کو فون کرلیا۔

''ابا جی! آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟'' انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

''بالکل سچ، میں نے کہا تھا نا تقی کبھی بھی میری بات سے انکار نہیں کرے گا۔ اب بس جٹ منگنی پٹ بیاہ کے انتظامات کرلو۔ ہاں جس لڑکی کی تم نے مجھے تصویر بھیجی تھی۔ بچی تو بہت پیاری ہے۔ مجھے تو اچھی لگی ہے۔ لیکن میں کہہ رہا تھا کہ رینا.....'' صوفی دادا بولتے بولتے خاموش ہوئے۔

تقی انہیں باتوں میں مصروف دیکھ کر اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ تکیے پہ سر رکھے وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کیا میری زندگی میں ایسی لڑکی شامل ہوگی' جو بس میری ہوگی۔ اُس کا دل میرے لیے دھڑکے گا۔ اُس کے دل کا مکیں میں ہوں گا۔ اُس کے دل کی لے پہلی بار میرے لیے دھڑکے گی۔ میں اُس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد ہوں گا۔ وہ مجھ سے وفا کرے گی۔''

وہ سوچتے سوچتے اُٹھ بیٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے چہرے پہ دو تین بار ہاتھ پھیرا جیسے اپنے اندر کی بے چینی کو چہرے سے صاف کررہا ہو۔

''رینا۔'' پہلی بار اُس کے لبوں سے بن آواز کے یہ نام نکلا تھا۔

''رینا وہ لڑکی ہوسکتی ہے۔'' اُس نے اپنے گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سوچا۔ ''کیوں نہیں ہوسکتی۔ دوسال تمہاری تمام تر بے اعتنائیوں اور کج ادائیوں کے باوجود وہ تمہارے رنگ میں رنگتی چلی گئی۔ دوسال سے وہ تمہاری ایک محبت بھری نظر کی منتظر ہے۔ جب کسی لڑکی کو زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تو وہ لڑکی رینا کیوں نہیں ہوسکتی۔''

اُس کے بالوں میں حرکت کرتی انگلیاں ساکت ہوئیں۔ وہ سر اٹھائے ٹراؤزر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے' لب بھینچے پُرسوچ نظروں سے کھڑکی کے باہر گرتی برف کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں ایک گھمسان کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔

رینا کی محبت نے اثر کیا تھا ہاں محبت اگر سچی ہو تو اثر ضرور دکھاتی ہے۔ کبھی نہ کبھی مقابل پر اپنا آپ ثابت ضرور کرتی ہے۔ تقی کی آنکھوں کا تناؤ کم ہوا۔ بھینچے ہونٹ ذرا کھلے اور اکڑی ہوئی گردن کو ذرا سا خم دے کر اپنے فون کی طرف دیکھا۔ وہ پلٹا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا اپنے اسمارٹ فون کی طرف بڑھا۔

فون کی اسکرین کو آن کر کے اُس نے کال لسٹ سے رینا کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جارہی تھی اور پھر دوسری ہی بیل پہ فون اُٹھالیا گیا تھا۔

''دوسال، میں نے پورے دوسال تمہارے فون کا انتظار کیا تھا تقی۔'' دوسری سمت رینا کی آواز ابھری۔

''میں۔'' تقی نے کچھ کہنا چاہا مگر اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا' وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ اور اچھا ہی ہوا' وہ بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا جب دوسری طرف سے آنے والی آواز پھر سے ماؤتھ پیس پہ ابھری۔

''مجھے آنٹی نے تمہارے بارے میں بتایا۔ تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کے بارے میں بتایا۔ سچ کہوں' میں جو پہلے تم سے خائف اور غصہ رہتی تھی۔ وہ سب غصہ ختم ہوگیا۔ ہم ظاہر دیکھتے ہیں۔ کبھی بھی کسی انسان کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ زندگی کے اصل راز تو ہمارے اندر دفن ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم زندگی بھر دفن ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ تقی! میں تم سے یہ ضرور کہوں گی' ہر عورت بُری نہیں ہوتی۔ ہر عورت بدکردار بھی نہیں ہوتی۔ اور ہر عورت ہر بار اپنے رشتوں کو دھوکا بھی

ئیں دی۔ عورت بہت عظیم ہوتی ہے۔ بیوی کے روپ میں حضرت خدیجہؓ کو دیکھو۔ کس قدر امیر اور مال و دولت ہونے کے باوجود وہ کیسے اپنے شوہر کے ہر کام میں اُن کے شانہ بشانہ رہیں۔ بیٹی کا روپ دیکھنا ہو تو حضرت فاطمہ کو دیکھو۔ بیٹی کے روپ میں تمہیں عظیم بیٹی کا کردار نبھایا۔ ماں بنیں تو ماں کی بہترین مثال قائم کی۔ ایسی تربیت کی زمانہ ماؤں کو اُن کی تربیت کی مثالیں دیتا ہے۔ عورت ویسی نہیں ہوتی جیسا تم نے پایا۔ اپنے دل سے اِس خوف کو نکال دو، تمہیں بے وفا عورت ملے گی۔ ہو سکتا ہے تمہیں ایسی بیوی ملے جس کی وفا اور محبت کی مثالیں تم خود دینے لگو۔''

''بالکل ہو سکتا ہے۔'' تقی آہستگی سے بولا اور صوفہ پہ آ بیٹھا۔ محبت طعنہ نہیں اعزاز ہوتی ہے اور مجھے فخر ہے، تمہاری محبت میرے لیے اعزاز ہے۔ اور اگر میں کہوں کہ.....'' تقی نے کچھ کہنا چاہا لیکن رینا نے شاید اُس کی آواز نہیں سنی تھی۔

''لیکن میں ایک بیٹی بھی ہوں۔ ماں باپ کی خوشی کے لیے میں نے ہاں کر دی تھی۔ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے سب کچھ دل سے قبول کر کے آگے بڑھی ہوں۔ دیکھو آج ہی میرا نکاح ہوا ہے۔ دانش کو لگتا ہے، وہ مجھ سے اتنی محبت کرے گا کہ اُس کی محبت کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں رہے گا۔'' وہ کہہ کر ہنسی، لیکن اُس کی ہنسی میں نمی کی آمیزش گھلی ہوئی تھی۔ تقی یکدم ہی خاموش ہو گیا۔

''لیکن میں نے دانش کو دھوکا نہیں دیا اور نہ ہی خود کو دھوکا دیا۔ میں نے بہت سوچا اور بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا۔ میں تمہاری محبت میں دو سال تڑپی ہوں۔ اور میرے ماں باپ تو مجھ سے چھبیس سال سے محبت کر رہے ہیں۔ اُن کی محبتوں کا قرض اتارنا ناممکن ہے۔ مگر انہیں خوشی دینا ناممکن نہیں تھا۔ میں نے انہیں خوشی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جو دوسروں کو اپنے سے وابستہ لوگوں کو خوشی دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ ہے ناں!'' اُس نے رُک کر تقی سے تائید چاہی۔

''ہوں۔'' وہ ہولے سے بولا۔ ''مبارک ہو تمہیں۔''

''تم آنٹی نے کہا تھا کہ آج میرا نکاح ہے۔ مجھے مبارک باد دے دینا۔'' وہ کہہ کر ہنسی۔

''مما نے بتایا تھا۔ تم سے سوری بھی کرنا تھی اور مبارک باد بھی دینا تھی۔'' اُس نے گہرا سانس لیتے ہوئے صوفے کی بیک پہ سر رکھا۔

''سوری کس لیے؟'' رینا حیران ہوئی۔

''تمہارا دل دُکھانے کے لیے۔ ایم سوری، میں نے تمہیں ہمیشہ ڈانٹا۔'' تقی نے دل سے کہا۔

''ہمم..... یہ تو ہے۔ تم نے ہمیشہ مجھے ڈانٹا ہی تھا۔ لیکن تمہارا تھینک یو۔''

''تھینک یو کس لیے؟'' وہ بھی حیران ہوا۔

''تھینک یو، مجھے محبت کا سلیقہ سکھانے کے لیے۔ تھینک یو میرے الول جلول حلیے پہ طنز کر کے اُسے ٹھیک کروانے کے لیے۔ ریئلی مجھ سے زیادہ تو دانش تمہارا شکر گزار ہے۔ بقول اُس کے بگڑی ہوئی حسینہ کو سدھار لیا تم نے۔'' اور وہ دونوں ہی اِس بات پہ ہنس پڑے تھے۔ اِس ہنسی میں دور کہیں اداسی ضرور شامل تھی۔

☆☆☆

بہار آنے کو تھی۔ درختوں کی کوکھ سے نئے پتے جنم لے چکے تھے۔ پھول مہکنے کے لیے بے تاب تھے۔ دھیمی دھیمی چلتی ہوا پاس سے گزرتے ہوئے چھیڑ خانی کرنے سے کب باز آتی۔ سرد ہوا میں ہلکی ہلکی حرارت کی آمیزش گھلنے لگی تھی اور ایسے ہی موسم میں تقی نے صوفی دادا کے ساتھ واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

تقی نے صوفی دادا اور اپنے پاپا کی پسند کی لڑکی سے شادی کے لیے ہاں کر دی تھی۔ اور اِسی سلسلے میں تقی دو بار پاکستان میں مقیم بختیار صاحب سے بات کر چکے تھے۔ تقی کو دیکھتے ہی بختیار صاحب دل و جان سے اُس پہ فدا ہو چکے تھے۔ اور تقی اُن کی بیٹی

کو دیکھے بنا ہی ہاں کر چکا تھا۔ اُس کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔ اُسے اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فرق پڑتا تھا تو بس اِس سے کہ تمام تر وفاداریاں اپنے ساتھ نہ ہونے کا۔ اِس لیے اُس نے ایک بار اس لڑکی سے بات کی تھی۔ تقی کے بہت سارے سوال نما اندیشوں کے جواب میں اُس نے یہی کہا تھا۔ ''جو میرے پیرنٹس کا فیصلہ ہے وہی میرا ہے۔ یعنی میں اپنی مکمل رضامندی سے اِس رشتے پہ راضی ہوں۔'' تقی کے لیے تو یہی بہت تھا اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

واقعی میں جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات تھی۔ رشتہ طے ہوتے ہی نوشیرواں صاحب لڑکی کو انگوٹھی پہنا آئے تھے۔ اور فقط ایک ماہ بعد کی شادی کی تاریخ بھی۔ مگر صوفی دادا تو ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تقی سے کیا بعید تھا' کچھ دن بعد وہ اپنے کہے سے مکر جاتا۔ اور یوں وہ شادی سے دو دن پہلے پاکستان آ چکا تھا۔

☆☆☆

دعائیں مستجاب ہوتی ہیں یا پھر رَد کر دی جاتی ہیں۔ قبول ہو جائیں' یہ مقام شکر ہوتا ہے۔ رَد ہو جائیں تو صبر کا مقام۔ اور آئمہ کو لگا تھا اُس کی ساری دُعائیں رد ہو چکی ہیں۔ اُس کے تہجد میں کیے گئے سجدے جو ہر گزرتے دِن کے ساتھ طویل تر ہوتے جا رہے تھے' بے فائدہ گئے۔

آتی جاتی سانسوں کے ساتھ ہمہ وقت مانگی گئی دُعا کو قبولیت کی سند نہیں ملی۔ ہاں اتنی دعاؤں کے باوجود اُسے یاد تھا اُس نے ماہا سے کیا کہا تھا۔ اور اگر نہ ملا تو بھی اپنے رب سے شکوہ نہیں کرے گی۔ اِس لیے شکوہ نہیں کرے گی کہ اُس نے اپنی رضا کو اُس کی رضا کے ساتھ باندھ دیا اور وہ اللہ جو حق میں بہتر ہو' وہی نعمت عطا کرتا ہے۔ اور جو حق میں بہتر نہ ہو اُس سے بھی نہیں نوازتا۔''

اور آج تقی نوشیرواں اُس کے مقابل تھا۔ اُس کے شوہر' اُس کے محرم کے روپ میں۔ آئمہ تو آئمہ اُس کے پاس بیٹھی منزہ بھی حیرت سے منہ کھولے کبھی تقی کو دیکھ رہی تھی تو کبھی آئمہ کو۔ آج مہندی تھی اور مہندی کے فنکشن سے پہلے اُن دونوں کے نکاح کی تقریب تھی جو کہ گھر میں خاص رشتہ داروں کی موجودگی میں ادا کی گئی تھی۔

''تقی۔'' منزہ حیرت سے اپنے پھیلے ہوئے وجود کو دوپٹے کے عقب میں چھپاتی اُس کے قریب آئی۔

''آئمہ۔'' تقی نے انگلی اُٹھا کر منزہ کے عقب میں سر جھکا کر کھڑی آئمہ کی سمت اشارہ کیا۔

''آئمہ وہی نا' جو تمہاری کزن اور.....'' تقی رُکا۔ وہ خود حیران تھا۔ اتفاق ایسے بھی ہوتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''کیوں برخوردار! تم جانتے ہو کیا ایک دوسرے کو؟'' صوفی دادا قریب آئے اور تقی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر استفسار کیا۔

''کچھ زیادہ نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں۔ یہ میری کلاس فیلو منزہ حسام کی کزن تھیں۔ اور ایک بار.....'' تقی کے ذہن میں یونی ورسٹی کا وہ واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ اُبھر چکا تھا۔

''لو پھر تو اور بھی اچھا ہو گیا۔'' صوفی دادا نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

صوفے پہ بیٹھی آئمہ کا پورا وجود پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ کیا دُعائیں اِس طرح مجسم ہو کر سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ اُس کا دِل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یوں جیسے پٹری پہ چلتی ریل گاڑی۔ تقی نوشیرواں..... ابھی کچھ دیر پہلے ہی مولوی صاحب نے اُس سے قبول و ایجاب سے پہلے یہ نام لیا تھا۔ اُس وقت تو اُسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور پیپرز پہ سائن کر دیے تھے۔

ہر اچھی بیٹی کی طرح وہ اپنے بابا کے کہنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ اور پھر انتظار بھی کس امید پہ کیا جاتا ہے۔ اور امید کا سرا تو کیا اُس کی ڈور بھی اُس کے

ہاتھ میں نہیں تھی۔ ماہا نے کہا تھا۔ ''دو سال خود کو دینے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ اُسے ملنا ہوتا تو کبھی تو ملتا۔ کبھی یوں ہی راہ چلتے' کسی مال میں' سڑک کنارے کبھی تو نظر آتا۔ مگر وہ جیسے گم ہو گیا تھا' دنیا کی بھیڑ میں یا پھر خود میں۔ اُس کی خبر آئمہ کو کہاں تھی۔

اُن ہی دِنوں بختیار صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ بروقت علاج سے جان تو بچ گئی تھی۔ لیکن انجانے خدشے سے آن لپٹے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنی اکلوتی بیٹی کے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔ حالاں کہ فرمان نے انہیں کتنا سمجھایا تھا' کتنی تسلی تشفی دی تھی۔ اِن ہی دِنوں میں منزہ کے ہاں ولادت متوقع تھی مگر وہ نہیں مانے۔

''میں اپنی بیٹی کی خوشیاں دیکھ کر مرنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے فرمان سے کہا تھا اور اپنے سرکل میں اچھے رشتوں کے بارے میں بتانے کا کہا۔ نوشیرواں خان اُن کے دوست شہباز بھٹی کے دوست تھے۔ ان ہی کے توسط سے نوشیرواں صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ اُن کے گھر آئے۔ آئمہ اِس سب سے بالکل بھی خوش نہیں تھی۔ وہ اپنے پاپا کو منع کرنا چاہتی تھی' لیکن ان کے چہرے پہ پھیلی خوشی دیکھ کر دِل مسوس کر رہ جاتی۔ اور پھر ایک دِن بختیار صاحب فون اُٹھائے اُس کے قریب چلے آئے۔ اور فون اُس کے کان سے لگا کر بات کرنے کا کہا۔ وہ جو بھی تھا' بار بار ایک ہی سوال کیے جا رہا تھا۔

''آپ اپنی پوری رضا مندی سے میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہیں ناں! اگر آپ کو کوئی اور پسند ہے تو آپ مجھے صاف بتا سکتی ہیں۔ میں خود آپ پہ آنچ آئے بنا انکار کر دوں گا۔''

وہ کہنا تو کچھ اور چاہتی تھی۔ مگر سامنے کھڑے باپ کی وجہ سے وہ کچھ نہیں کہہ پائی تھی۔

''اور اگر وہ انکار کر دیتی تو....'' یہ خیال اُسے جھرجھری لینے پہ مجبور کر گیا تھا۔ اُس کی کائنات سمٹ کر اُس کے پاس آ بیٹھی تھی۔ ہاں وہ شخص اُس کی کل کائنات ہی تو تھا۔ آئمہ کا جی چاہا۔ وہ اپنا جھکا ہوا سر اُٹھائے' اپنی گردن کو موڑے اور اپنی نظروں کو اُس کے چہرے پہ ٹکا دے۔ اور اپنی باقی کی عمر اِسی طرح گزار دے۔ محبت بھری خواہشیں اُس کے اندر اُمڈ رہی تھیں۔ اُس کے لب مسکرائے تو پھر سمٹنا ہی بھول گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں تشکر بھرے آنسو تھے۔ وہ اِس سے زیادہ خود پہ قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے زار و قطار رو رہی تھی۔

تقی نے گھبرا کر اپنے پہلو میں بیٹھی روتی ہوئی آئمہ کو دیکھا اور جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ آمنہ بیگم اور بختیار صاحب فوراً ہی آگے بڑھے۔ اور روتی ہوئی آئمہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ تقی نے ایک نظر آئمہ پہ ڈالی اور پاس ہی بیٹھے صوفی دادا کے قریب آ گیا۔

''میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ تو پھر یہ ایسے کیوں رو رہی ہے؟'' وہ خاصی پریشانی سے صوفی دادا سے پوچھ رہا تھا۔

''برخوردار! اب آنسو صاف کرنے کی عادت ڈال لو۔ اب بیویوں کا تو یہی کام ہوتا ہے۔ بنا بات کے رونا۔'' صوفی دادا نے اُسے چھیڑا۔ تقی کی پیشانی پہ دو بل اُبھرے۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

''واقعی میں بس یوں ہی ایسے ہی رونے کی عادت ہوتی ہے۔'' اُس نے سرگوشیانہ انداز میں دریافت کیا۔ اور پھر صوفی دادا کے اثبات میں سر ہلانے پہ اپنے سر کو بھی اثبات میں ہلا دیا۔ جیسے عادت ڈالنے کے بارے میں سوچ لیا ہو۔

☆☆☆

محبت بھی کتنی عجب شے ہے۔ نہ جانے کون سا ورد ہے جو جتنا بڑھتا جاتا ہے' اتنی ہی گہرائی سے اثر کرتا تھا۔ تقی جو عورت اور محبت کے نام سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ اِن چند ماہ میں ہی آئمہ کا دیوانہ ہو

چکا ہے اور صوفی دادا یہ کہتے تھے۔ ''اچھی عورت زندگی کو گلزار بنا دیتی ہے۔ ایک باوفا بیوی زندگی کو جنت بنا دیتی ہے۔''

اور تقی اپنی اِس محبت بھری زندگی میں بہت خوش تھا۔ اور پھر جس دن آئمہ کو معلوم ہوا۔ اُس کے قدموں تلے جنت آنے والی گئی ہے۔ اُس دِن وہ کتنا خوش تھا۔ اُس رات اس نے آئمہ کو سونے نہیں دیا تھا۔ کتنی باتیں' کتنے خواب تھے جو اُن دونوں نے اپنے آنے والے بچے کے حق میں سوچے تھے۔ اور پھر یہ خواب اور باتیں کچھ دِن کے بعد ہی بکھر گئی تھیں۔ جب ماہا اپنے شوہر کے ساتھ ملنے اُس کے گھر آئی تھی۔ اور..... اور پھر.....!!

☆☆☆

کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔ جب چائے پیتے ہوئے اچانک ہی ماہا نے بات شروع کی تھی۔

''بہت لکی ہو آئمہ۔ تم نے جو چاہا وہ پالیا۔ بھئی میں نے تو مان لیا۔ تمہاری دُعاؤں میں بہت اثر ہے۔ یار! ایسی دُعا میں اپنی اِس دوست کے لیے بھی کردو۔''

تقی اُٹھ کر آئمہ کے لیے چائے کا کپ اٹھا کر اُس کی سمت بڑھا تھا جب ماہا کی بات پہ مسکرایا اور اُس کی سمت دیکھنے لگا۔

''سچ میں تقی بھائی' میں مذاق نہیں کر رہی۔ آئمہ نے جیسے دعاؤں میں مانگا۔ دیکھیں نا' وہ کیسے اچانک سے اُسے مل گیا۔''

ماہا نے جیسے اُسے یقین دِلانا چاہا۔ آئمہ کے چہرے کی مسکراہٹ سمٹی۔ اُس نے گھبرا کر ماہا کی طرف دیکھا تاکہ اُسے بولنے سے منع کرے۔ مگر وہ اُس کی سمت متوجہ کب تھی۔

''کیا مانگا تھا آئمہ نے دُعاؤں میں ایسا جو اُسے مل گیا؟'' تقی نے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے ہوئے ماہا سے استفسار کیا۔

''ہیں..... آپ کو نہیں پتا۔ آئمہ نے آپ کو اپنی اسٹوری نہیں سنائی۔'' ماہا نے لمبا سا ہیں کرنے کے بعد آئمہ کی طرف دیکھا جو سر کو دائیں بائیں ہلا کر اُسے بولنے سے منع کر رہی تھی۔

''ارے اب بتانے میں کیا حرج ہے۔ اب تو تمہاری شادی ہوگئی۔'' ماہا نے لاپروائی سے ہاتھ جھٹکا۔ تقی نے حیرانی سے پہلے آئمہ اور پھر ماہا کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کو بتاتی ہوں۔'' ماہا کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر تقی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ماہا۔'' فیصل نے اُسے روکنا چاہا۔

''ارے آپ بھی ناں! آئمہ کی طرح بی ہیو مت کیا کریں۔ محبت کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ آئمہ نے تو بس محبت کی تھی اور دیکھیں اُس کی محبت کس قدر سچی تھی۔'' تقی بھائی کیسے اُسے ملے؟ اور پھر ماہا نے تقی کو آئمہ کی اُس سے محبت ہونے، اُس سے بات کرنے کا اِرادہ کر کے توڑ دینے کے بعد دُعاؤں سے مانگنے تک کی اسٹوری بتائی۔ تقی منہ کھولے حیرت سے ماہا کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

''یار آئمہ! تم کتنی گھنی ہو۔ تم نے تقی بھائی کو ابھی تک کیوں نہیں بتایا۔ تم اُن سے شادی سے پہلے ہی کتنی محبت کرتی ہو۔''

ماہا نے آئمہ سے استفسار کیا۔ جس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ اور دِل ..... دِل نہ جانے کیوں خوف سے سکڑا جا رہا تھا۔

''کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' ماہا اُٹھ کر آئمہ کے قریب آئی۔ جس کی پیشانی پہ چھوٹی چھوٹی پانی کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

''ہاں، بس ویسے ہی۔'' آئمہ نے ٹشو سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اور تقی کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ سپاٹ ہو چکا تھا۔ وہ چند منٹوں کے بعد معذرت کرتے ہوئے وہاں سے جا چکا تھا۔ اُس کے بعد ماہا بھی کچھ دیر بیٹھی تھی۔ اور آئمہ کو اپنے گھر آنے کی پرزور دعوت

بھی دی۔ جن دنوں آئمہ کی شادی ہوئی تھی۔ ماہا مسقط میں تھی۔ حالاں کہ اُس نے پاکستان آنے کی بہت کوشش کی تھی مگر فیصل کو چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ جیسے ہی چھٹی ملی وہ اور فیصل پاکستان گھومنے پھرنے کے لیے آچکے تھے۔

''تم تقی بھائی کو لے کر آنا۔ کوئی بھی بہانا مت بنانا۔'' ماہا نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بلا مبالغہ کوئی پانچویں بار اُسے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ آئمہ نے اُسے آنے کی یقین دہانی کروائی۔ اور اُن کے جانے کے بعد تھکے تھکے قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اُس نے کام والی کو برتن دھونے اور کھانا فریز کرنے کا کہا۔ کیوں کہ انیلا بیگم اور نوشیرواں صاحب تو اپنے دوست کے ہاں ڈنر پہ انوائیٹڈ تھے۔ اور صوفی دادا پچھلے ماہ ہی واپس برمن جا چکے تھے۔ اُس نے دھڑکتے دِل کے ساتھ اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ وہ تقی کی فطرت کو بہت کم عرصے میں پہچان چکی تھی۔ صوفی دادا تقی کی زندگی کا وہ تاریک پہلو اُس کے سامنے بیان کر چکے تھے جو وہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے تھا۔

''وقت نے اُسے توڑا۔ مجھے نے میں وقت تو لگے گا۔ اور مجھے لگتا ہے اب وہ وقت آ گیا ہے جب وہ ہر تلخی، ہر یاد کو اپنے دِل سے، ذہن سے نکال پھینکے گا۔ کیوں کہ اُس کی زندگی میں تم جو آ گئی ہو۔'' انہوں نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اور آئمہ نے نم آنکھوں سے سر کو اثبات میں ہلا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی جو اُس نے تقی کو اپنی محبت' اپنی شدتوں' دعاؤں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ کیوں کہ وہ چاہتی تھی تقی کا اعتماد بحال ہو جائے۔ وہ یقین کرنے لگے۔ لیکن آج ماہا نے.....''

آئمہ نے بے بسی سے اپنی انگلیوں کو مروڑا اور پھر گہرا سانس لے کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آئی۔ تقی راکنگ چیئر کی بیک پہ سر رکھے' آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اُس کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھی ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ابھی بھی دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ موجود تھا جس کا اُٹھتا ہوا دھواں فضا میں بلند ہو کر گم ہوتا جا رہا تھا۔ آئمہ نے ڈرتے ڈرتے تقی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کے مغرور کھڑے نقوش تنے ہوئے تھے۔ وہ اِس وقت سخت مضطرب تھا۔ آئمہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنے چہرے پہ موجود پسینے کو صاف کیا اور دھیرے دھیرے چلتی تقی کے قدموں میں آ بیٹھی۔ اُس کی موجودگی نے ساکت بیٹھے تقی پہ کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ پہلے ایسا کب ہوتا تھا۔ تقی اور اُس کے ہونے کو محسوس نہ کرتا۔

''اتنی بھی کیا بے اعتباری۔'' آئمہ کے دِل میں شکوہ اُبھرا۔ لیکن یہ وقت دِل کے شکوے سُننے کا نہیں تھا بلکہ تقی کی بدگمانی کو دور کرنے کا تھا۔ اُسے حقیقت بتانے کا تھا۔ اِسی لیے اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ کرسی کے ہتھے پہ رکھے تقی کے مضبوط مردانہ ہاتھ پہ رکھا۔ جسے اُسی لمحے جھٹک دیا گیا تھا۔ وہ اب سیدھا ہو کر بیٹھا اور غضب بھری نظروں سے آئمہ کو دیکھنے لگا۔

''مجھے کوئی بھی بات نہیں کرنی۔'' اُس کا لہجہ اِس قدر سرد تھا کہ آئمہ کا دِل ڈوبا۔

''لیکن مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ مجھے بتانا ہے کہ.....''

''کہ تم بھی عام عورت کے جیسی ہو۔ محبت کے نام پہ نامحرم کو دِل میں رکھنے والی ہو۔ لیکن تمہیں شاید ایک بات نہیں معلوم۔ میں عام مردوں جیسا نہیں ہوں۔'' وہ آنکھوں میں اجنبیت اور لہجے میں کرختگی سموئے بولا۔ اگلے ہی لمحے اُس نے آئمہ کو

ہلکا سا دھکا دے کر پیچھے کیا اور اُٹھ کر کھڑا ہوا۔

''نفرت ہے مجھے ہر ایسی لڑکی سے۔ جو دل میں کسی اور کو رکھے اور زندگی بھر سامنے والے کو دھوکے میں رکھے۔''

''میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ تقی میں آپ سے محبت کرتی تھی۔ اور آپ سے ہی محبت کرتی ہوں۔'' وہ تیزی سے سیدھا ہوتے ہوئے بولی۔

''مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ کس نے تمہیں یہ حق دیا تھا۔ کسی غیر مرد، غیر محرم سے محبت کرو۔'' وہ چلایا تھا۔ آئمہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور سراسیمہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ تقی نے آگے بڑھ کر نیچے بیٹھی آئمہ کا بازو اتنی زور سے پکڑا کہ بے اختیار ہی اُس کے لبوں سے سسکاری اُبھری۔

''اور اگر تمہاری شادی مجھ سے نہ ہوتی پھر۔ تو پھر تم کسی دوسرے شخص کو اپنی جھوٹی محبت اور وفاؤں کا اسی طرح یقین دلاتیں، جس طرح مجھے دلایا تھا۔'' وہ پھنکارا تھا۔ آئمہ کی آنکھوں میں تیزی سے نمکین پانی جمع ہونے لگا تھا۔

''بولو۔ جواب دو مجھے۔ تم عورتیں دھوکا دینے سے باز کیوں نہیں آتیں۔ اور پھر رو رو کر زمانے کے سامنے مظلوم بھی تم عورتیں ہی بنتی ہو۔ اس دُنیا کی سب سے بے چاری مخلوق عورت نہیں بلکہ ہم مرد ہیں۔ جو تم جیسی معصوم چہروں والی لڑکیوں پہ یقین کر لیتے ہیں۔ جو در حقیقت کسی کی بھی نہیں ہوتیں۔ جو بس دھوکا دینا جانتی ہیں۔ پہلے اپنے باپ کو، بھائی کو اور پھر تمام عمر شوہر نام کی مخلوق کو۔'' وہ چلا رہا تھا اور وہ اتنی ہی شدت سے روتی ہوئی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''میں نے بس آپ سے محبت کی تھی۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ پلیز ایک بار میری بات تو سنیں۔'' وہ جا رہا تھا۔ جلدی سے آئمہ اُس کے پیچھے لپکی۔ ایسے کیسے وہ معتوب ٹھہری تھی؟

''شٹ اپ!'' تقی نے اپنے پیچھے آتی آئمہ کو انگلی اُٹھا کر درشتی سے اپنے پیچھے آنے سے روکا۔ آئمہ ٹھٹک کر رُکی۔ ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھم کر رُکے۔ وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ محبت بھرا آشیانہ بے اعتباری کی گرد سے اپنی آب و تاب کھو رہا تھا۔ اُس کے خوب صورت رنگ پھیکے پڑتے جا رہے تھے۔ وہ دروازے کی سمت بڑھا۔ ہینڈل پہ ہاتھ رکھا۔ جب اُس کے عقب سے آئمہ کی آواز اُبھری۔

''میں آپ کی ماں کی طرح دھوکے باز نہیں ہوں۔ جو آپ کو اور بابا کو چھوڑ کر اپنے عاشق کے ساتھ چلی.....'' وہ کرنٹ کھا کر پلٹا۔ اُس کے پلٹنے پہ آئمہ کے لبوں سے نکلتے لفظ وہیں خاموش ہو گئے۔

''تمہیں یہ بات۔'' وہ بڑبڑا کر رُکا۔ اور پھر پلٹ کر باہر نکل گیا۔ اُس کا محبت بھرا آشیانہ تاش کے پتوں کی مانند بکھر گیا تھا۔

☆☆☆

وہ پچھلے تین گھنٹے سے بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی کو دوڑائے پھر رہا تھا۔ اُس کے دماغ کی رگیں کھینچی چلی جا رہی تھیں اور دل..... دل درد سے بے حال۔ پہلے نوشیرواں صاحب کی کالز اُس کے فون پہ آتی رہیں پھر انیلا بیگم کی اور پھر جب صوفی دادا کی کال اُس کے نمبر پہ آئی' اُس نے بے زار ہو کر اپنا فون آف کر دیا۔ اُسے اس وقت کسی سے بات نہیں کرنی تھی' کسی سے بھی نہیں۔

اُس نے گاڑی قدرے سنسان جگہ پہ روکی اور گاڑی سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے آ بیٹھا۔ وہ فٹ پاتھ پہ بیٹھا درخت کے تنے سے ٹیک لگائے اپنے سامنے آسمان پہ بکھرے سفید موتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بار بار دھند چھا جاتی۔ جسے وہ اپنی آستین میں جذب کر لیتا۔ ''بھولتا کون ہے وقت کے گھاؤ کو۔ بھول جانا بھی چاہیں تو بھول نہیں پاتے۔ بھول پائیں تو یاد کروانے والے کتنے لوگ ہوتے ہیں۔ جو کبھی ہمدردی کے پیراہن میں تو کبھی طنز کے نشتر میں یاد دلاتے ہیں۔ جانے کیوں جس سے اُس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محبت کی تھی وہ اُسے یوں چھوڑ گئی تھی کہ ایک بار

بھی اُس کا خیال نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں سوچا وہ اُن کے بغیر کیسے رہے گا؟''

ہاں اُس نے اپنی ماں سے بہت محبت کی تھی۔ پتا نہیں کیوں اُس کی ماں ایک پل کے لیے بھی اُس کی نظروں سے اوجھل ہوتی' وہ رونے لگتا۔ اور تب تک چپ نہ ہوتا جب تک وہ آ کر اُسے اپنے گلے سے نہ لگا لیتی۔ اُسے اپنے باپ سے اتنا لگاؤ نہیں تھا جتنا اپنی ماں سے عشق۔ اُس کی ماں بھی اُس سے کم محبت نہیں کرتی تھی۔ لیکن پھر اِس محبت کی اُس کی گم گشتہ محبت کے سامنے کوئی ویلیو نہیں رہی تھی۔ ابھی پچھلے ماہ ہی تو اُس نے اپنی چودھویں سال گرہ کا کیک خوب ٹھاٹ سے کاٹا تھا۔ اور صوفی دادا نے اُس کے لیے لیٹسٹ ویڈیو گیم بھیجی تھی۔ اور وہی آخری سال گرہ تھی جو اُس نے منائی تھی۔ اِس کے بعد تو.....

وہ چونکا۔ قریب سے ہی کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ تقی نے دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ دور ایک کتا کھڑا بھونک رہا تھا۔ اور پھر وہ ذیلی سڑک کی سمت مڑ گیا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اور گزرتے وقت کی بازگشت اُس کے کانوں میں گونجتی جا رہی تھی۔ اُسے ایک ایک بات یاد تھی۔ یہ وہ باتیں جو اُس کی ماں اُس کے باپ سے کر رہی تھی۔ وہ پاس ہی صوفے کے کونے میں سہما ہوا بیٹھا کبھی اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا تو کبھی غصہ ہوتے اپنے باپ کی طرف جو اُس پہ چلا رہا تھا۔

''نوشیرواں! تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔ میں امان کو اِس بار نہیں کھو سکتی۔ وہ میری محبت، میرا عشق ہے۔''

''میں اور تقی۔'' نوشیرواں نے صوفے پہ بیٹھے تقی کی طرف اشارہ کیا۔

''تم۔'' جہاں آرا لحظہ بھر کے لیے رُکی۔ ''تم مجبوری ہو نوشیرواں اور یہ اِس مجبوری کا نتیجہ۔''

وہ سفاک کب تھی؟ تقی نے کرب سے اپنی آنکھوں کو زور سے بند کیا۔ نم آنکھوں کی نمی پھسل کر آنکھوں کے کنارے آ ٹھہری تھی۔ ''تو میں اپنی ماں کے لیے بس یہ اہمیت رکھتا تھا۔'' کوئی اُس کے اندر گرایا تھا۔

''مجھے تمہارے ماضی سے کوئی لینا دینا نہیں جہاں آرا۔ میں تمہیں اپنی اور اپنے بیٹے کی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گا۔ معاشرے میں ہمارا ایک مقام ہے۔ میری عزت ہے۔ میری ایک ساکھ ہے۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔'' نوشیرواں نے غصے سے جہاں آرا سے کہا۔

''زبردستی ساتھ رکھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری ساکھ، تمہاری عزت کا منہ کالا کرتی رہوں، تمہیں یہ گوارا ہوگا۔'' وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''جہاں آرا۔'' نوشیرواں خان اِس بار اُس کے انداز پہ حیرت زدہ تھے۔

''محبت کبھی بھولنے والی شے نہیں نوشیرواں! میں نے چاہا تھا، میں امان کو بھول جاؤں۔ مگر دل اُس سے کم پہ کبھی راضی ہی نہیں ہوا۔ عورت کا دل پہلی بار جس کے لیے دھڑک جائے' مرتے دم تک اُسی کے لیے دھڑکتا ہے۔ باقی تو بس سمجھوتے ہوتے ہیں۔ مجبوریاں ہوتی ہیں۔'' اب کے جہاں آرا شکستگی سے بولی۔ یہ اُس کے لہجے کی شکستگی ہی تھی' نوشیرواں نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

کمرے میں اب تقی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ وہ کیوں رو رہا تھا۔ وہ ابھی خود بھی نہیں جانتا تھا۔ ''میرا بیٹا تم سے بہت پیار کرتا ہے جہاں آرا! اور بدقسمتی سے تم اِس کی ماں ہو۔ میرا مت سوچو۔ ایک بار، ایک بار ہمارے بیٹے کے بارے میں سوچ لو۔ وہ بڑا ہو رہا ہے۔ اِس کے ساتھ ظلم مت کرو۔ لوگ، معاشرہ اِسے کیا کہے گا۔ ایک بھاگی ہوئی عورت کا بیٹا۔ تمہارے پاس کیا کچھ نہیں۔ دولت، گھر، اولاد، اچھا نام۔''

''محبت نہیں ہے میرے پاس۔'' جہاں آرا نے اُن کی بات کاٹی اور اپنے کندھے پہ دھرا ہاتھ ہٹایا۔ ''تقی کو اپنے ابا کے پاس بھیج دو۔ یوں بھی وہ اکیلے ہیں۔ اچھا ہے وہ اور تقی.....''

"میں صوفی دادا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔" تقی اُٹھ کر ماں سے جا لپٹا۔ وہ اب اونچی آواز میں رو رہا تھا۔

"نوشیرواں! تم تقی کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے استعمال مت کرو۔" جہاں آرا نے روتے ہوئے تقی کو خود سے الگ کیا اور لب بھینچ کر کھڑے نوشیرواں سے کہا۔

"تم اِس قابل ہو بھی نہیں۔" وہ نفرت سے پھنکارے اور رُخ بدل لیا۔

"چھوڑو مجھے اور جاؤ اپنے باپ کے پاس۔" جہاں آرا نے اُسے دھکا دے کر خود سے الگ کیا اور کمرے میں چلی گئی۔

"بابا! میری مما کو روک لیں۔ میں اِن کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں انہیں جانے نہیں دوں گا۔" تقی نے باپ کے بازو کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔" وہ بڑبڑائے۔

کچھ ہی منٹوں کے بعد جہاں آرا اپنا اٹیچی کیس کھینچتی ہوئی کمرے سے برآمد ہوئی۔ تقی کے آنسو آنکھوں کے بجائے اندر گرنے لگے۔ وہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چہرہ جس سے اُسے سب سے زیادہ محبت تھی۔

"عورت محبت نہیں کرنا جانتی۔ نہ کرے۔ لیکن وہ عورت ہی کیا جو خود سے وابستہ رشتوں سے وفا نہ کرے۔" نوشیرواں نے جہاں آرا کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "محبت نے تمہیں وفاداری کرنا نہ سکھائی۔"

"میں نے امان سے محبت کی اور اُسی سے وفا۔" جہاں آرا نے تنی ہوئی گردن اُٹھا کر کہا۔ "امان باہر آ گیا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ امید ہے تم جلد ہی مجھے طلاق کے پیپرز دے دو گے۔ تاکہ میں امان سے شادی کر سکوں۔"

وہ کسی کی کب سُن رہی تھی۔ وہ تو بس اپنی سُنا کر چلی گئی تھی۔ اور پیچھے رہ جانے والے نوشیرواں کے لیے، بیٹے کے لیے سنبھلنا کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ بس وہی جانتے تھے۔

نے اپنی انگلیوں کی پوروں پہ گننا شروع کیا۔ ایک، دو، تین ..... وہ گنتا گیا۔ ماہ، سالوں میں بدلنے لگے۔ وہ گنتے گنتے دو سال پہ آ ٹھہرا۔ ہاں دو سال۔ جب وہ اپنے کمرے اور گھر سے نکلا تھا۔ وہ بھی صرف اپنے بابا کے لیے۔ جو اُس کے لیے رات رات بھر جاگتے۔ اُس کا خیال کرتے۔ اُسے بہلاتے اور سمجھاتے۔

زندگی کسی کے جانے سے رُکی نہیں تھی، چل پڑی تھی۔ لیکن اُسے عورت ذات سے بے زار کر گئی تھی۔ ہر وہ لڑکی جو اُس سے مسکرا کر بات کرتی اُسے زہر سے زیادہ بُری لگتی۔ کالج، یونی ورسٹی میں کتنی لڑکیوں نے اُس سے دوستی کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہر ایک کو بُری طرح جھڑک دیتا۔ ڈانٹ دیتا۔

رفتہ رفتہ وہ اپنے حلقہ احباب میں مغرور مشہور ہو گیا۔ اور اُسے اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کوئی اُسے کیا کہتا ہے؟ آئمہ اُس سے جونیئر تھی۔ اِن فیکٹ موسٹ جونیئر۔ جس وقت اس کالونی میں ایڈمیشن ہوا اُس کے بامشکل چند ماہ بچے تھے۔ اِن چند ماہ میں اُس نے آئمہ کو زور سے ہنستے ضرور دیکھا تھا۔ مگر کسی لڑکے سے بات کرتے نہیں۔ اُس کے لیے یہ اتفاق تھا۔ اُس کی شادی اُس لڑکی سے ہوئی، جسے وہ ڈانٹنے کے بعد سوری بول چکا تھا۔ ہاں! آئمہ اُس کی زندگی میں واحد لڑکی تھی جس کی انسلٹ کرنے کے بعد اُسے گلٹ فیل ہوا اور اُس نے اُس سے سوری کہا۔

اور جب آئمہ اُس کی زندگی میں آئی۔ وہ اندر ہی اندر خوف زدہ تھا۔ وہ خوف جو عورت کے حوالے سے ہمیشہ اُس کے اندر رہا۔ مگر جلد ہی آئمہ کی شرافت اور کردار کی پختگی نے اُسے مطمئن کر دیا تھا۔ وہ اُس کی طرف دیکھتا، وہ شرما جاتی۔ ایک سکون سا اُس کے اندر بکھرنے لگتا۔

وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ جھٹ سے نظریں جھکا لیتی وہ سرشار ہونے لگتا۔ وہ اُس کی تعریف کرتا تو وہ

مسرور ہو جاتی۔ وہ تقی ہی دیر اُس کے چہرے پہ بکھرے رنگوں کو حیرت سے دیکھنے کے بعد دِل سے مسکراتا۔

''آئمہ عام لڑکی نہیں ہے۔'' یہ خیال اُسے اُس کی طرف جھکاتا چلا گیا۔ اتنا کہ وہ اُس کی محبت میں بھر پور ڈوب گیا۔ ہاں وہ اُسے چاہنے لگا تھا۔ اُس سے محبت کرنے لگا تھا۔ کتنے خواب تھے جو اُس نے آئمہ اور اپنے آنے والے بچے کے متعلق دیکھے تھے۔ لیکن آج اُس نے جانا۔ وہ پھر سے غلطی کر بیٹھا۔ ایک عورت پہ یقین کرنے کی غلطی۔ رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک چکا تھا۔ یہ تھکن سوچوں کی زیادہ تھی یا آج پھر سے یقین ٹوٹنے کی۔ لیکن جو بھی تھا۔ تھا بہت کرب ناک۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے اپنی گردن کو دبایا اور اُٹھ کر گاڑی کی سمت بڑھا۔ اور وہ جس وقت گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔ رات کا آخری ستارہ ڈوب رہا تھا۔

اُس کا رُخ گھر کی جانب تھا۔ اور جس وقت وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے اپنے کمرے میں آیا۔ آئمہ سرعت سے اُٹھ کر اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس کے چہرے پہ اتنی کرختگی اور سختی تھی کہ آئمہ چاہنے کے باوجود کچھ بول نہیں سکی تھی۔ بلکہ سر جھکا کر اُس کے راستے سے ہٹ گئی۔ عقب میں کھڑا ہوا۔ نوشیرواں صاحب دروازہ بجا کر کے اندر آئے۔

''تم کہاں تھے تقی۔ فون کیوں آف تھا؟'' وہ بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔

''مجھے اِس وقت کوئی بات نہیں کرنی، بس سونا ہے۔'' اُس نے قطعیت بھرے لہجے میں کہا اور بیڈ کی سمت بڑھ گیا۔ نوشیرواں صاحب نے ناسمجھی سے آئمہ کی سمت دیکھا۔ وہ خود اُن سے نظریں چرائے ہوئے تھی۔

''تم بھی آرام کرو بیٹا! پریشان مت ہو۔ میں صبح تقی سے بات کروں گا۔'' انہوں نے آئمہ کے جھکے سر کو تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ آئمہ نے پلٹ کر بیڈ کی سمت نگاہ دوڑائی۔ جہاں تقی کمبل اوڑھے کروٹ سے لیٹا تھا۔ آئمہ نے اپنی اٹکی ہوئی سانس سینے سے نکالی اور خاموشی سے آ کر بیڈ کے دوسری سمت لیٹ گئی۔

☆☆☆

وہ جو بہت سالوں بعد پگھلا تھا۔ پھر سے پہلے جیسا ہو گیا۔ اُس کا رویہ آئمہ کو کھلا گیا تھا۔ نوشیرواں اور انیلا خود حیرت زدہ تھے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تقی کو پھر سے کیا ہوا۔ وہ دونوں پوچھ پوچھ کر تھک گئے تھے۔ مگر نہ تو آئمہ کی چپ ٹوٹی اور نہ ہی تقی کا منہ کھلا۔

آئمہ کی ڈلیوری کے دِن قریب آ رہے تھے۔ اُسے تقی کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ مگر مقابل تو مانو پتھر تھا۔ اُس دن بھی وہ انیلا بیگم کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے گئی تھی۔ جس وقت وہ دونوں گھر لوٹیں، تقی نوشیرواں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

''آخر تم دونوں کو ہو کیا گیا ہے۔'' وہ سخت غصے میں تھیں۔ اور آتے ہی آئمہ اور تقی پہ برس پڑیں۔'' نوشیرواں اِن سے پوچھیں کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر نے آج اتنی باتیں سنائی ہیں۔ دیکھیں آئمہ کی حالت دیکھیں۔ لگ رہا ہے اِس کی چند دِنوں کے بعد ڈلیوری ہے؟ یہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہے۔ اِسی لیے نہ خود کا خیال رکھ رہی ہے اور نہ ہی کھانے پینے کی فکر۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ نہ آئمہ کے لیے، نہ بچے کے لیے۔'' انیلا بیگم نے کہہ کر تقی کی طرف دیکھا۔

''میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ماں ہے تو کیا اُسے نہیں پتا۔ اُسے اپنا کیسے خیال رکھنا چاہیے؟'' اُس نے ہاتھ میں پکڑا کپ ٹیبل پہ پٹخا۔

''تقی!'' نوشیرواں صاحب نے اُسے سرزنش بھرے لہجے میں پکارا تو وہ غصے میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

''نوشیرواں۔ تقی کا رویہ بالکل اچھا نہیں۔'' انیلا بیگم نے تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی سمت جاتی آئمہ کی پشت دیکھتے ہوئے شوہر سے کہا۔

''میں ابا جی سے بات کرتا ہوں۔ یہ صرف ابا جی کی سُنتا ہے۔'' نوشیرواں صاحب نے پر سوچ نظروں سے کپ سے اُٹھتی بھاپ کو دیکھتے ہوئے

کہا۔ انیلا بیگم نے گردن چن کی سمت موڑتے ہوئے ملازمہ کو اپنے لیے چائے لانے کا کہا۔

''نوشیرواں۔'' انیلا بیگم نے سوچوں میں مستغرق اپنے شریک سفر کو پکارا۔ اُنھوں نے منہ سے کوئی جواب دینے کے بجائے اُن کی طرف دیکھنے پہ اکتفا کیا۔

''آئمہ کی ڈلیوری کے بعد ہم جا رہے ہیں ناں!'' انیلا بیگم نے ڈرتے ڈرتے استفسار کیا۔

''پتا نہیں۔'' نوشیرواں خان نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اور انیلا بیگم بڑبڑا کر چائے لاتی ملازمہ پہ برس پڑی تھیں۔

☆☆☆

آئمہ کمرے میں آئی۔ تقی سامنے ہی راکنگ چیئر کی بیک پہ سر رکھے چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔ آنسو چھلکنے کو بے قرار تھے۔ جنھیں وہ اپنے اندر اُتارنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔ اپنے ہونٹوں کو کچلتے ہوئے وہ بیڈ کے کونے میں آ بیٹھی اور کندھے پہ لٹکا پرس اُتار کر اپنے قریب رکھا۔

''محبت کرنا گناہ تو نہیں تقی۔ میں نے بس محبت کی تھی۔ کب، کیسے ہوئی، مجھے نہیں پتا۔ بس ہو گئی تھی۔'' وہ بھیگے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ تقی نے گردن موڑ کر آئمہ کی طرف دیکھا۔

''لڑکی کا شادی سے پہلے محبت کرنا گناہ ہی ہوتا ہے۔ تم نے گناہ کیا تھا۔''

''تقی! میں نے بس آپ سے محبت کی اور آپ سے ہی میری شادی ہو گئی۔'' آئمہ نے بے بسی سے اُس کی بات کاٹی۔

''اور اگر مجھ سے شادی نہ ہوتی پھر۔ پھر تم کسی اور کو دھوکا دے کر بہت اچھی بن کر اُس کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوتی یا تو تم عورتوں کی محبتیں جھوٹی ہوتی ہیں یا پھر تم عورتوں کے خمیر میں دھوکا دینا لکھا ہوتا ہے۔'' وہ غصے سے پھنکارا۔ آئمہ کے پاس اِس بات کا جواب نہیں تھا۔

بولو کیا تم ایسے نہیں کرتیں۔ شادی کرتیں۔ بچے بھی پیدا کر لیتیں اور پھر.....''

''اور پھر میں اُس کے ساتھ وفا دار بھی رہتی۔'' آئمہ نے خفگی سے تقی کی بات کاٹی۔

''اونہہ۔'' تقی نے نفی میں ہنکارا بھرا اور رُخ موڑ لیا۔

''اپنی ماں کا بدلہ مجھ سے مت لیں۔'' وہ اُس کے سامنے رو پڑی تھی۔

''نام بھی مت لینا اُس عورت کا میرے سامنے۔''

وہ بھڑک اُٹھا تھا۔ وہ غصے میں آئمہ کو گھورتا تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ اُس کی کنپٹی کی رگیں پھول چکی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کو مٹھیوں میں بند کیے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ آئمہ ڈر کر سمٹی۔ آنسو خوف سے خشک ہو گئے۔ چہرے پہ زردی نمودار ہوئی۔

تقی کو یکدم احساس ہوا اُس کے اِس طرح کرنے سے وہ خوف زدہ ہو چکی ہے۔ اور پھر اُس نے پلٹ کر فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور ڈھکن کھول کر منہ سے لگا لی۔ پانی پینے کے بعد اُس نے آئمہ کی طرف دیکھا جو ابھی بھی خوف کے زیرِ اثر تھی۔ اُس نے بوتل کو بند کیا اور گہرا سانس لے کر آئمہ کے قریب آیا۔ آئمہ ڈر کر بے اختیار پیچھے ہوئی۔

''میں.....'' اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کہے بنا ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے ہی نہیں بلکہ گھر سے بھی نکل گیا۔ اور آئمہ نڈھال ہو کر وہیں لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆

ننھے نقی خان کی آمد نے سب کو بے انتہا خوش کر دیا تھا۔ صوفی دادا تو اگلے دِن ہی پاکستان ڈھیروں تحائف کے ساتھ آ چکے تھے۔ وہ بار بار نقی کو گود میں لیتے، اُسے چومتے اور سینے سے لگا لیتے۔ بختیار صاحب کی اوپن ہارٹ سرجری تھی اور وہ اِن دنوں فرمان اور منزہ کے پاس دبئی میں تھے۔ منزہ کے ہاں بیٹی ہوئی تھی۔ چھوٹی بچی اور پھر تایا کو سنبھالنے کے لیے

اُس کا دبی میں رہنا بہت ضروری تھا۔

''ارے یار تقی! کیا رُخ موڑے بیٹھے ہو۔ دیکھو تو میرے شہزادے کو۔'' صوفی دادا نے خاموش کھڑے تقی کو پکارا۔ اُس نے پلٹ کر صوفی دادا اور پھر گلابی کمبل میں لپٹے وجود کو دیکھا اور کچھ بھی کہے بنا باہر نکل گیا۔ آئمہ کے چہرے پہ تاریکی چھانے لگی۔ بیٹے کی آمد سے بھی اُس کا دِل نہیں پسیجا تھا۔

''اِسے کیا ہوا؟'' صوفی دادا نے بیٹے سے دریافت کیا۔

''پاگل ہوگیا ہے۔ ارے لائیں ناں ابا جان۔ میرے پوتے کو مجھے دیں۔ میں اپنے پوتے کو سنبھال لوں گا۔ آپ اپنے پوتے کو سنبھال لیں۔''

''ارے نہیں۔ ابھی نہیں۔'' صوفی دادا نے تقی کو اپنے سینے سے لگایا۔

''ارے ابا جان۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔'' نوشیرواں صاحب نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''بس تقی کو مجھے دیں۔ میں اِسے آپ کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گا۔ یہ میرا پوتا ہے۔'' وہ تقی کو لینے کے لیے آگے بڑھے۔ اِسی دوران بچہ اُٹھ کر رونے لگا۔

''ہائے یہ کیوں رو رہا ہے۔'' وہ دونوں بیک وقت تقی پہ جھکے۔ تقی کے رونے میں کمی آنے کے بجائے تیزی آتی جارہی تھی۔

''آپ بچے کو اس کی ماں کو دیں۔'' نرس نے قریب آکر صوفی دادا کے ہاتھ سے تقی کو لیا اور ہنستی ہوئی آئمہ کی گود میں ڈال دیا۔ صوفی دادا اور نوشیرواں نے منہ بنا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور سامنے صوفے پہ جا بیٹھے۔

☆☆☆

وہ اپنے آفیشل ڈنر کے سلسلے میں میریٹ ہوٹل آیا ہوا تھا۔ فارن ڈیلی گیشن کے ساتھ میٹنگ اور ڈنر کرنے کے بعد جس وقت وہ ہوٹل کی لابی میں آیا۔ کچھ یاد آنے پہ رُکا۔ چند لمحے اُس نے اپنے ذہن پہ زور ڈالا اور پھر پلٹ کر کونے میں پڑی میز کے گرد بیٹھے نفوس کو دیکھا۔

''رینا۔'' وہ زیرِلب بڑبڑایا اور مکمل طور پر پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ رینا کے ساتھ ایک ہینڈسم سا مرد اور ایک ننھی بچی تھی۔ تقی نے کچھ سوچا اور اپنے قدم اُن کی ٹیبل کی سمت بڑھا دیے۔

''ہائے!'' وہ اُن کے قریب جا کر پکارا۔ رینا اور دانش نے ایک ساتھ سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا۔ رینا کی آنکھوں میں شناسائی اُبھری۔ اور پھر وہ ایک خوش گوار مسکراہٹ لیے اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''تقی نوشیرواں خان۔'' وہ کہہ کر مسکرائی تو تقی نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ رینا اِن دو سالوں میں بہت بدل گئی تھی۔ دُبلی پتلی رینا کی جگہ ایک فربہی مائل لڑکی تھی۔ ''اُس کا ڈریسنگ اسٹائل۔'' تقی نے حیرت سے ٹراؤزر شرٹ اور سر پہ دوپٹا لیے رینا کو دیکھا۔

''واٹ آ سرپرائز۔ آؤ نا بیٹھو۔ ہمیں جوائن کرو۔'' رینا کی پرجوش آواز پہ وہ چونکا۔

''آں ہاں۔'' جانے وہ انکار کرنے کی بجائے کیوں بیٹھ گیا تھا۔

''یہ میرے بزنیس پارٹنر ہیں دانش۔ اور دانش یہ تقی خان۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں!'' رینا نے تعارف کرواتے ہوئے دانش کی طرف دیکھا۔

''بالکل جی، بالکل..... پہچان لیا تقی خان کو۔ کیسے ہیں آپ؟'' دانش نے اپنا ہاتھ تقی کی سمت بڑھایا۔ جسے تقی نے مسکراتے ہوئے تھام لیا۔

''یہ میری بیٹی..... نیناں۔'' رینا نے پاس بیٹھی ننھی بچی کا تعارف کروایا۔

''کیوٹ..... بہت پیاری ہے تمہاری بیٹی۔'' تقی نے پھولے گالوں والی پنک بچی کے گال پہ چٹکی بھری۔ بچی گھبرا کر رونے لگی۔

''اوہ، میرا بچہ۔'' رینا نے فوراً ہی بچی کو اپنے کندھے سے لگایا اور تھپکنے لگی۔ ''اور تم سناؤ، کیا ہو رہا آج کل۔ شادی کر لی یا ایسے ہی پھر رہے ہو ابھی تک؟'' رینا نے معروف انداز میں تقی سے پوچھا۔

وہ اب بچی کے منہ میں فیڈر ڈال رہی تھی۔

''کرلی شادی۔ بیٹا ہے۔'' تقی نے مختصراً کہا۔

''کون ہے وہ خوش قسمت لڑکی۔ جسے تم نے اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔'' رینا حیران ہوئی۔

''تم گھر آجانا۔ مل لینا آکر۔'' تقی نے اُسے آفر کی۔

''ہمم..... ضرور۔ میں اور دانش آئیں گے۔'' رینا نے دانش کو شامل گفتگو کیا۔

''شیور۔'' دانش نے سر کو اثبات میں ہلایا۔

''رینا تم۔'' تقی رُکا۔

''کیا میں؟'' رینا نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''مطلب یہ سب، بہت چینج نہیں آگیا تم میں۔'' تقی دل کی بات زبان پر لے آیا۔ رینا نے دانش کی طرف دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ دانش بھی اُس کے ساتھ ہنسا تھا۔ تقی نے اُلجھ کر رینا اور پھر دانش کو دیکھا۔

''تم مرد کبھی عورت سے خوش نہیں ہوتے۔ تمہیں تو ایسی ہی لڑکیاں پسند تھیں۔ سر پہ اسکارف اور مشرقی لباس میں ملبوس۔'' رینا نے رُک کر تقی سے سوال کیا۔ تقی اِس بار بول نہیں پایا۔

''دانش کو بھی ایسی ہی لڑکیاں پسند تھیں۔ لیکن اِس نے کبھی مجھے یہ سب پہننے کے لیے فورس نہیں کیا۔ مجھے خود اچھا لگتا ہے اِس کی پسند میں ڈھلنا۔'' وہ محبت بھری نظروں سے دانش کو دیکھ رہی تھی۔

''ہم کتنی بھی ترقی کرلیں۔ کسی بھی پوسٹ یا عہدے پہ پہنچ جائیں۔ لیکن عورت کا غرور اُس کا شوہر اور اصل اُس کا گھر ہوتا ہے۔ تھینک یو سو مچ تقی! میں شاید کبھی یہ بات سمجھ نہ پاتی۔ لیکن تم نے مجھے یہ سکھایا۔''

بچی ایک بار پھر سے رو پڑی۔ ''او میرا بچہ۔'' رینا پھر سے اپنی بچی کی طرف متوجہ ہوئی۔ تقی کو جانے کیوں یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ بے حد عجیب۔ وہ جلد ہی وہاں سے اٹھ گیا۔ حالاں کہ رینا سے سوال کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کب اُس سے کچھ سیکھا۔ لیکن رینا اُس کی طرف متوجہ ہی کب تھی۔ وہ اپنی روتی ہوئی بچی کو چپ کروانے میں مصروف تھی۔

''پتا نہیں کیوں رو رہی ہے۔ دانش گھر چلیں۔'' رینا نے اپنے شوہر سے کہا اور وہ بھی فوراً اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ بھی کھائے بنا بل پے کیا اور آگے بڑھ گیا۔

رینا بھی اُس سے الوداعی کلمات کہہ کر آگے بڑھ چکی تھی۔ لیکن وہ وہیں کا وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ سوال اُس کے ذہن میں اودھم مچا رہے تھے۔ یہ وہ لڑکی تھی جو اُس کے لیے پاگل تھی۔ اُسے دیکھنے کے لیے وہ کیا کیا جتن کرتی تھی۔ وہ ڈانٹتا، جھڑکتا..... وہ پھر بھی اُس سے بات کرنے کے لیے مرتی تھی۔ اور آج..... اُس نے سر جھٹکا۔ گہرا سانس لے کر اپنا کوٹ ٹھیک کیا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

نقی مسلسل روئے جا رہا تھا اور آئمہ اُسے خاموش کروانے کی کوشش میں روٹھی ہو چکی تھی۔ تقی نے ایک نظر روتے ہوئے نقی کو دیکھا اور پھر آئمہ اور اُس کی نظریں لمحہ بھر کے لیے ملیں۔

''ابھی چپ ہو جائے گا۔'' آئمہ نے جلدی سے کہا اور نقی کو کندھے سے لگائے اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ جب تک وہ پھرتی رہتی نقی خاموش رہتا۔ اور جیسے ہی بیٹھتی وہ پھر سے رونے لگتا۔ وہ پچھلے دو گھنٹے سے مسلسل پھر رہی تھی۔ تقی کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُٹھ کر اسٹڈی روم میں آگیا۔

وہ سخت مضطرب تھا اور اضطراری انداز میں مسلسل اپنی ایک ٹانگ کو ہلائے جا رہا تھا۔ دفعتاً وہ رُکا۔ اُس کی حرکت کرتی ٹانگ ساکت ہوئی۔ تقی نے آگے کی جانب جھک کر اپنا فون اُٹھایا اور اُس کی تاریک اسکرین کو دیکھنے لگا۔ جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو، فون کو روشن کرے یا پھر تاریک رہنے دے۔ دفعتاً وہ ایک نقطے پہ آرُکا۔ وہ جاننا چاہتا تھا، پوچھنا چاہتا

تھا۔ اُس نے فون اُن کیا اور نمبر ڈائل کرنے کے بعد فون کان سے لگالیا۔ کئی بار بیل جانے کے بعد وہ اُس کا فون اٹینڈ کر چکی تھی۔

''میں سوچ رہی تھی۔ تمہیں کال کروں گی۔ لیکن اِس سے پہلے ہی تمہارا فون آ گیا۔'' وہ نارمل لہجے میں بول رہی تھی۔

''تمہارا کون سا روپ سچا تھا۔ پہلے والا یا پھر یہ والا۔'' اُس کا سوال سیریس تھا مگر وہ ہنس پڑی۔

''تم حیران کیوں ہو رہے ہو۔ کیا تمہیں میرا یہ روپ اچھا نہیں لگا؟'' وہ اُلٹا اسی سے سوال کرنے لگی۔

''بات میری نہیں تمہاری ہو رہی ہے۔ تم بتاؤ۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''وہ جنون تھا تقی! تمہارے لیے پاگل تھی۔ تم اچھے لگتے تھے۔ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے لیے میں نے وہ سب چھوڑا جو تمہیں پسند نہیں تھا۔ لیکن تم میرے نصیب میں نہیں تھے۔ میرا نصیب داؤد تھا۔ جب میں اُس کی طرف پلٹی دِل میں محبت نہیں تھی۔ اور اب، اب ہر جنون..... ہر محبت داؤد ہے۔ میری بیٹی ہے۔ عورت اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ تم سے محبت پاگل پن تھا۔ اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ تمہیں دیکھنے کی چاہ میں گھنٹوں تمہارے گھر بیٹھی رہتی۔ تم سے بات کرنے کے لیے دِن رات کال کرتی۔ اور تم ہر بار میرا نیا نمبر بلاک کر دیتے۔ ڈرامہ تب بھی نہیں تھا۔

لیکن بنا رشتے کے محبت کچھ نہیں دیتی سوائے بے رُخی اور خواری کے۔ عورت کو جو محبت اُس کا شوہر دے سکتا ہے، وہ کوئی اور نہیں۔''

وہ کہہ کر خاموش ہوئی۔ کتنے خاموشی کے پل اُن دونوں کے بیچ حائل ہوئے تھے۔ اور اِس خاموشی کو تقی نے توڑا۔

''اگر میں تمہیں کہوں، میں اب تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم سب چھوڑ کر میرے پاس آ جاؤ تو.....'' وہ آہستگی سے گویا ہوا۔ اُس کا دِل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ ہر عضو کان بن گیا تھا۔

''پاگل ہو گئے ہو تقی! میں اور تم..... کیا کہہ رہے ہو؟''

''شادی کرو گی مجھ سے۔ سب کچھ دوں گا تمہیں..... عزت، احترام، محبت۔''

''مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے تقی! اب کچھ نہیں چاہیے۔ میں ایک بیوی ہوں۔ ایک ماں ہوں۔ اور سب سے بڑھ کر ایک عورت۔ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں.....''

اُس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی اور تقی..... وہ پرسکون ہوتا جا رہا تھا۔ تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ وہ ریناصدیقی تھی، اپنی مرضی سے جینے والی، اپنی من مانی کرنے والی۔ اور آج اُس کے لہجے میں ممتا بول رہی تھی۔

''میں تو تمہیں اور مردوں سے بہت الگ سمجھتی تھی۔ لیکن تم..... آج کے بعد مجھے فون مت کرنا۔ اِن فیکٹ، ہر بار تم میرا نمبر بلاک کرتے تھے۔ آج میں کر رہی ہوں۔'' وہ غصے سے بولتی فون بند کر چکی تھی۔

''ریناا میری بات.....'' اُس کی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فون بند ہو چکا تھا۔ تقی نے پھر سے اُس کا نمبر ڈائل کیا۔ فون بند جا رہا تھا۔

''یہ عورتیں کبھی نہیں سدھر سکتیں۔ کبھی بھی پوری بات سنتی ہی نہیں۔'' اُس نے بڑبڑا کر فون رکھا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سر کے پیچھے رکھا۔ وہ خوش تھا..... بہت خوش۔ وہ سیدھا ہوا اور صوفی دادا کا نمبر ڈائل کیا۔

''دیکھو برخوردار۔ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ اِس لیے مجھے فون مت کرو۔'' صوفی دادا اُس سے ناراض تھے۔ اُنھوں نے اُسے کتنا سمجھانا چاہا تھا۔ مگر وہ.....

''صوفی دادا ہر عورت جہاں آرا نہیں ہوتی۔ ہر عورت اپنی پہلی پسند اور محبت کے لیے اپنے شوہر اور اولاد کو نہیں چھوڑتی۔'' وہ خوشی سے بتا رہا تھا۔ وہ اُٹھا اور بات کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف

بڑھ گیا۔ ”صوفی دادا میں جلد ہی آئمہ کے ساتھ آپ کے پاس آرہا ہوں۔“

وہ بولا تو نقی کو سلاتی آئمہ نے پلٹ کر حیرت سے نقی کی طرف دیکھا۔ اُس کے دیکھنے پہ نقی نے نظریں بدلنے کے بجائے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا۔ آئمہ نے جلدی سے اپنا چہرہ نیچے کرلیا۔

”صوفی دادا! آپ کی بہو تو بہت ناراض ہے۔ اب کیسے مناؤں؟“ وہ آئمہ کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور اپنا ایک بازو آئمہ کے کندھے کے گرد پھیلا دیا۔ جسے آئمہ نے فوراً ہی ہٹایا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اِس سے پہلے کہ وہ وہاں سے جاتی نقی اُس کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

”صوفی دادا! اب میں اپنی بیگم کو منالوں۔ بعد میں بات کروں گا۔“

نقی نے کہہ کر فون بند کیا اور آئمہ کی طرف دیکھا جو اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔

”سوری یار۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ ”سوری۔“

آئمہ کی آنکھوں میں آنسو ابھرے۔ ”میں شرمندہ ہوں آئمہ۔“ نقی نے کہا تو آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پہ آن ٹھہرے۔

”آئمہ۔“ نقی نے اُسے اپنے ساتھ لگانا چاہا۔

”آپ کے سوری کہنے سے وہ سب ختم ہو جائے گا۔ آپ نے میری کتنی انسلٹ کی۔ میری محبت کو بے عزت کیا۔ میرا جرم اتنا بڑا تو نہیں تھا جتنا آپ نے مجھ سے تاوان لیا.....“ وہ کہتے ہوئے رو رہی تھی۔ ”ہاں ہوگئی تھی آپ سے محبت۔ لیکن میں نے اللہ سے ہمیشہ یہی دُعا کی کہ جو میرے لیے بہتر ہو، وہ کردے اور اُس نے مجھے آپ سے محرم کی شکل میں ملا بھی دیا تھا۔ لیکن آپ نے.....“ اُس نے نقی کا ہاتھ جھٹکا اور اُسے دور ہٹایا۔

”ہاں بہت بُرا ہوں میں۔ میرے ساتھ ایسے ہی ہونا چاہیے۔ دیکھو، اللہ نے اُس لڑکی کو میرا ہم سفر بنایا۔ جس نے بس مجھے چاہا اور میں نے اُس کے ساتھ کیا کیا۔“

وہ کہتا ہوا اپنے بالوں میں اضطراری انداز میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

”لیکن تم وہ درد نہیں سمجھو گی آئمہ۔ جو میری سگی ماں نے مجھے دیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر اپنی سابقہ محبت کے پاس چلی گئی۔ کیا اسے ایک بار خیال نہیں آیا۔ وہ ایک عورت ہے۔ ایک ماں ہے۔ وہ مجھے کیا سبق دے کر جارہی ہے۔ وہ مجھے کیا سکھا کر گئی۔“ وہ اب اپنی پیشانی کو مسل رہا تھا۔

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ آئمہ نے دھندلائی ہوئی نظروں سے نقی کے چہرے کو دیکھا۔ جہاں کرب تھا..... شرمندگی تھی، اذیت تھی۔

”نفرت کبھی بھی بے وجہ نہیں ہوتی۔ اُس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ البتہ محبت بے وجہ ہوسکتی ہے۔“ نقی پھر سے رونے لگا۔ آئمہ نے آگے بڑھ کر نقی کو اُٹھایا اور دھیرے دھیرے چلتی کھڑکی کے پاس کھڑے نقی کے پاس آگئی۔ نقی نے چونک کر اپنے برابر دیکھا۔ آئمہ دھیرے سے مسکرائی۔

”جہاں محبت ہو، وہاں ناراضی کیوں کر ہوسکتی ہے۔“ اور ننھے سے نقی کو نقی کی جانب بڑھا دیا۔ اُن کے پاس تو محبت کرنے کی وجہ بھی موجود تھی۔ اُن کا بیٹا..... اُن کا نقی۔ نقی نے بیٹے کو بانہوں میں بھرا اور اپنا ایک بازو آئمہ کے کندھے پہ رکھ کر اُسے خود سے قریب کیا۔

وفا اور اعتبار کا موسم دِلوں میں گھر کرنے لگا تو ایک سکوں سا چہار سو پھیل گیا۔ ”آئی لو یو۔“ نقی نے جھک کر آئمہ کے کان میں سرگوشی کی تو آئمہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ محبت، مان اور اعتبار اپنی تمام تر وفا کے ساتھ مل جائے تو اِس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے؟ اور اِس وقت نقی کو اپنا آپ سب سے زیادہ خوش قسمت لگ رہا تھا۔ وقت نے اُسے بتا دیا تھا، ہر عورت جہاں آرا نہیں ہوتی۔ کچھ ہی دیر میں اُن دونوں کی ہنسی میں ننھے نقی کی کھلکھلاہٹیں بھی شامل تھیں۔

☆

"اسماء آپی! میرے ساتھ ذرا کالج چلیں گی، مجھے داخلہ فارم جمع کروانا ہے۔ آج ہے بھی لاسٹ ڈیٹ۔ امی بھی خالہ کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ احسن بھائی کو بھی میں فون کر چکی ہوں۔ آج انہیں لنچ بریک نہیں ملا۔"

اقصی نے بڑی بہن کے متوقع سوالات سے بچنے کے لیے تمام روداد لگے ہاتھوں سنائی اور ملتجیانہ نظروں سے اسماء کی طرف دیکھنے لگی۔

لہسن، پیاز اور پالک پہ غصہ نکالتی اسماء جو بظاہر چہرے پہ مظلومیت سجائے ہمسائی کو خود پہ ہونے والے نادیدہ ظلم کے قصے سنا رہی تھی۔ بہن کی بات پہ ایسے بدکی جیسے اس نے فیس کا نہیں موت کا پروانہ جمع کروانے کا کہہ دیا ہو۔

"میں تو تمہارے بھائی کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم نہیں نکال سکتی اور تم مجھے کالج جانے کا کہہ رہی ہو۔"

اسماء نے اپنے سامنے بیٹھی مزنہ کی طرف ترچھی نگاہ سے دیکھا اور لہسن کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے مریل سے انداز میں نہ جانے کی وجہ بتائی نہیں بلکہ اقصی کے منہ پہ دے ماری۔ اقصی حیرت کی تصویر بنی اپنی اس بہن کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی اجازت کے

حوریہ بتول

ڈھیر سارے رنگ کے لوگ

بغیر ناصر بھائی سانس بھی مشکل سے لیتے تھے اور ابھی خود بیٹھی مزنہ باجی کے سامنے اپنے شوہر کی برائیاں کر رہی تھی۔

اسماء ایسی ہی تھی پل میں تولہ اور پل میں ماشہ۔ دل ہوتا تو ناصر بھائی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود دنیا کے آخری کونے تک ہو آتی اور اگر دل نہ ہو تو دو قدم تک جانے کا کہہ دو تو شوہر کی اجازت کا خیال آ جاتا۔

"بھئی مزنہ شادی کے بعد میکے رہنے کی اذیت کوئی کیا جانے۔ لوگ تو سمجھتے ہیں عیش میں رہتی ہو گی وہ یہ نہیں جانتے کہ بیاہی لڑکی کو میکے میں ایک ایک پل کانٹوں پہ بسر کرنا پڑتا ہے۔"

اسماء نے آنکھوں میں آئے آنسو دل میں اتارتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا تو اقصی لاجواب سی ہو کر اندر چلی گئی۔

ناصر اکلوتا ہے۔ ماں نہ باپ، مارمل لگا پانچ مرلے کا گھر اور لڑکا پراپرٹی ڈیلر بیٹی عیش کرے گی۔''

کہہ کر زرینہ بیگم نے جھٹ سے ہاں کردی۔ وہ تو شادی کے بعد راز کھلا گھر کرائے کا ہے اور کاروبار کے نام پہ ایک چھوٹی سی پرچون کی دوکان ہے۔ وہ بھی اکثر و بیشتر بند پائی جاتی تھی۔ نکھٹو شوہر اور زبان دراز بیوی کی بے مثال جوڑی کے جوہر اکثر محلے والے بھی جوش و خروش سے دیکھا کرتے تھے۔ اسی لڑائی جھگڑے میں اسماء اپنی اکلوتی بیٹی کو لیے میکے آبیٹھی۔

چند دن بعد ہی شوہر کی یاد ستانے لگی۔ سینکڑوں بار فون کیا تو اسے یہ کہنے کے بجائے کہ مجھے لے جاؤ اسے یہیں آکر کاروبار کرنے کا نادر مشورہ دے دیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ناصر سب کچھ سمیٹ کر سسرال آبیٹھا۔ پہلے بھی اسماء کو زیادہ تر خرچہ سلیم صاحب ہی بھیجا کرتے تھے لیکن یہاں آکر تو ناصر نے بیوی اور بیٹی کی ذمہ داری سے بالکل ہاتھ اٹھا لیا۔ سلیم صاحب نے پہلے داماد کو کپڑے کی دوکان بنا کر دی جو بمشکل چند ماہ ہی چلی۔ جب سورج اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہا ہوتا اس وقت تو نواب صاحب سو کر اٹھتے۔ سونے پہ سہاگہ اسماء پہ نکھٹو شوہر کو عزت دلوانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ کھانے کے شوقین میاں بیوی مہمان بنے تینوں وقت فرمائشی کھانوں کی لسٹ زرینہ بیگم کو پکڑا دیا کرتے۔ آج کوفتے بنا لیں آج کھیر اور چرغہ بناتے ہیں۔ سلیم صاحب کے ہاں روز کسی ہوٹل کی طرح مینیو سیٹ ہوا کرتا۔ اخراجات زرینہ بیگم کے بس سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ ان باوکت ہاتھوں کی برکت نا جانے کہاں کھو گئی تھی۔ سلیم صاحب اور زرینہ بیگم کی تین اولادیں تھیں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ اسماء پہلی بیٹی تھی اس لیے اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد پیار دیکھا۔ بچپن میں سب بچوں کے کھلونے توڑ دیتی، منع کرو تو زمین پہ سر مار کے خوب رویا کرتی۔ بڑی ہوئی تو کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اچھی شکل صورت آہستہ آہستہ اس کے بدصورت رویئے تلے دبنے گی۔ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ہر کوئی اس سے بات کرنے سے پہلے سو بار سوچتا۔

''اسماء نا جانے کس پہ چلی گئی ورنہ اقصیٰ اور احسن تو بہت سلجھے ہوئے بچے ہیں۔'' جب بھی کوئی یہ جملے زرینہ بیگم کو کہتا ان کا دل ٹکڑوں میں بٹنے لگتا۔

اسی لیے اکلوتا لڑکا دیکھ اس کی شادی کی تھی تا کہ وہ اس کی طرف سے بے فکر ہو کر دوسرے بچوں کا سوچیں۔

لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ بیٹی شوہر کو لے کر میکے آبیٹھی۔ ناصر اور اسماء ایسے رہتے جیسے یہ ان کا گھر ہے اور باقی سب ان پہ بوجھ بن کر رہ رہے ہوں۔

بیوی سیر تھی تو میاں سوا سیر، دونوں کا واحد مشغلہ ہر کسی کی بات میں ٹانگ اڑا کر واویلا کرنا تھا۔

اور اسماء تو پوری پھپھا کٹنی بنی ہوئی تھی گھر والوں کو ناصر کی باتیں سنا کر اکساتی اور ناصر کے سامنے سب کی باتیں سنا کر لڑتی۔

''تمہارا اس طرح منہ اٹھا کر دوست کے گھر جانا ناصر کو بالکل پسند نہیں آیا۔''

اسماء نے آنکھیں گھماتے ہوئے چھوٹی بہن کو نکھٹو شوہر کا پیغام سنایا۔ یہ سن کر اقصیٰ پہلے تو دو منٹ ہونق بنی بڑی بہن کو دیکھتی رہی۔

''اپنے شوہر نامدار کے فرمودات ہمارے گھر سے دور ہی رکھا کریں تو بہتر ہوگا۔'' اقصیٰ کے تنک کے کہنے پہ اسماء نے ماں کے سامنے جو واویلا کیا۔

''میرے شوہر کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ آپ نے ہی اپنی ساری آل اولاد کو سر چڑھا رکھا ہے۔ کل احسن سے ناصر نے بائیک مانگی تو ٹکا سا جواب دے کر چلتا بنا۔ اقصیٰ تو بڑے بہنوئی کو جوتی کی نوک پہ رکھتی ہے۔ کالج سے آکر ناصر کو دیکھ کر جو کمرے میں گھستی ہے کہ رات کے کھانے پہ بمشکل نظر آتی ہے۔ چند دن میں مجبوری میں یہاں کیا آکر بیٹھ گئی اپنوں نے ہی آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی۔

امی! میری ایک بات کان کھول کے سن لیں

میں کل ہی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ اٹھائی رہیں اپنے نافرمان اور منہ زور بچوں کے ناز نخرے۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں یہاں رہ کر ذلیل ہونے کا میں آج ہی ناصر سے کہتی ہوں۔ چاہے تو سڑک پہ جھگی لگا لے بس مجھے یہاں سے لے جائے۔'' زرینہ بیگم نے مشکل سے معاملہ رفع دفع کروایا۔

گھر والوں سے دو دو ہاتھ کر کے بھی اسماء کا دل نہ بھرا تو اگلے ہی دن ناصر سے پانی پت کی جنگ چھیڑ بیٹھی۔ سب گھر والے پریشان اور حیران بھی تھے کے بہن کو منع کریں یا بہنوئی کو۔ ناصر لڑ جھگڑ کے باہر نکلا تو اسماء روتی دھوتی ماں کے پاس پہنچ گئی۔

''یہ رشتہ ڈھونڈا تھا آپ نے میرے لیے، زندگی عذاب بن گئی ہے۔ میرے باپ کے گھر اس آدمی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا اور میرے گھر والے بجائے اس کی ٹھکائی کرنے کے اس طرح خوش ہو رہے تھے جیسے بیٹا بہو کو سیدھا کر رہا ہو۔'' زرینہ بیگم ایسے سر جھکائے بیٹھی تھیں جیسے سارا قصور انہی کا ہو۔ قصور تھا تو یہی جو بیٹی کی زبان سے ڈر کر ہر اچھی بری بات پہ خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ ایسی ہی تھیں دھیمے مزاج کی نفیس سی خاتون۔ بیٹی اللہ جانے کس پہ چلی گئی تھی۔

اقصیٰ اور احسن بھی ماں کی طرح دھیما مزاج رکھتے تھے اور سلیم صاحب تو تھے ہی اللہ میاں کی گائے۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر، انہیں مطالعے کا شوق تھا اس لیے گھر میں ہوتے تو کمرے میں بیٹھے مطالعہ کرتے۔ سوائے ہر ماہ کی یکم کو ساری تنخواہ زرینہ بیگم کے ہاتھ پہ رکھنے کے ان کا گھر میں کوئی دخل نہیں تھا۔

''اسماء باجی! آپ کو ڈھائی رنگ کے لوگوں کا پتا ہے؟'' ماں اور بہن کی باتوں کو نظر انداز کر کے اقصیٰ نے سوال کیا تو اسماء نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ اسے اپنی بات کے درمیان کسی کا بھی ٹوکنا گوارا نہیں۔ اقصیٰ بہن کی کھا جانے والی نظریں نظر انداز کر کے گویا ہوئی۔

''ڈھائی رنگ کے لوگ آپ جیسے ہوتے ہیں۔ منافق سے بھی کچھ بڑھ کر۔ آپ تو منافقت بھی سرِ عام کرتی ہیں۔ زبان خود چلاتی ہیں اور الزام امی پہ دھر رہی ہیں۔ یہ ڈھائی رنگ کی سازشیں چھوڑ دیں۔

امی کو ناصر نے یہ کہا ناصر نے وہ کہا کہہ کر تنگ کیے رکھتی ہیں اور ناصر بھائی کو یہاں تم میری وجہ سے عیش میں رہ رہے کہہ کر درگت بنائے رکھتی ہیں۔ اور جب

شوہر کچھ کہہ دے تو امی ابو کو الزام دینے چلی آتی ہیں۔ اسماء حیرت سے منہ کھولے چھوٹی بہن کو چند ثانیے دیکھتی رہی اور پھر ایک دم اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بڑی بہن کو ایسے نہیں کہتے۔

زرینہ بیگم نے اقصیٰ کو سرزنش کی اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ آج تو گھر میں بھونچال آنے والا ہے۔ اسماء بھی چھوٹی بہن کی بات کو درگزر نہیں کرے گی۔

خلافِ توقع اس دن کے بعد اسماء نے کوئی واویلا نہیں کیا۔ رات کو جب سب بیٹھے نو بجے کا خبر نامہ سن رہے تھے۔ اسماء اور ناصر لاؤنج میں داخل ہوئے۔ ایک دم تو تمام نفوس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اسماء آہستہ آہستہ چلتی ماں کے پاس آئی اور ان کی گود میں سر رکھ کے رو دی۔

''امی میں نے آپ کی تربیت کو شرمندہ کروایا۔ اقصیٰ نے بالکل ٹھیک کہا ڈھائی رنگ کی شخصیت انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ امی ناصر نے کرائے کا گھر لے لیا ہے۔ میں اور ناصر نارمل زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ناصر کمائیں گے اور میں گھر سجاؤں گی۔'' زرینہ بیگم نے بیٹی کو سینے سے لگا کر ہزاروں دعائیں دیں۔ احسن اور اقصیٰ بھی محبت سے اس کے گلے آ لگے۔ جیسا سکون اسماء کو آج ملا تھا پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ ملاوٹ سے پاک محبتیں ہمیشہ سکون کا باعث بنا کرتی ہیں۔

☆

حسنہ حسین

عسر یسرا

خواب دیکھتے ہوئے جنت کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ خود کو برائڈل ڈریس میں دیکھ کر اسے یاد آتا ہے کہ اس کی شادی فارس وجدان سے ہو چکی ہے جو ''شیرازی انٹر پرائزز'' کا سی ای او ہے۔ وہ جنت کمال پر واضح کر دیتا ہے کہ یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جو اس نے اپنی ماں کی خاطر بنایا ہے۔ جب تک ماں زندہ ہیں، یہ رشتہ رہے گا۔

جنت کی فارس سے شادی سائرہ خالہ نے کروائی ہے۔ ان کا بیٹا عمار اس شادی پر ناراض ہے۔ اس کا خیال ہے۔ میڈیا پر فارس سے متعلق جو خبریں گردش کرتی رہی ہیں، وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

فارس کی والدہ مسز شیرازی ایک نیک دل عورت ہیں جو چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ وہ ایک آرٹسٹ ہیں۔ ان کی پینٹنگ عسر یسرا جنت کو حیران کر دیتی ہے۔ دونوں اس پر بات کرتی ہیں۔ مسز شیرازی اسے ان لفظوں کے معنی تلاش کرنے کو کہتی ہیں۔

فارس کے مرحوم بھائی حماد کا یتیم بیٹا اپنے ننھیال میں رہتا ہے۔ فارس اس بچے کو وجدان ہاؤس میں لانے کو تیار نہیں۔

فارس کی تمام تر نفرتوں کے باوجود جنت اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

آئمہ ظہیر فارس کی منہ بولی بہن جنت کو منگنی کی تقریب میں لے جاتی ہیں جہاں کچھ لڑکیوں کے تضحیک آمیز رویے سے جنت دل برداشتہ ہو جاتی ہے۔

فارس کے آفس میں برہان لغاری کا نام سن کر جنت متوحش ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے۔

جنت عسر یسر پر غور کرتی ہے اور اس کے کچھ معنی سمجھ جاتی ہے۔

مکمل ناول

جنت مسز شیرازی سے ان کے یتیم پوتے سے ملنے کی بات کرتی ہے۔ مسز شیرازی منع کر دیتی ہیں۔
اٹالین ریسٹورنٹ میں ڈنر کے دوران فارس جنت کی طلاق اور ماضی کا ذکر چھیڑ کر جنت کو پریشان کر دیتا ہے۔
جنت فارس کے ساتھ لندن جانا چاہتی ہے تاکہ وہ سائرہ خالہ کی بیٹی سدرہ کی شادی میں شرکت نہ کر سکے۔ فارس اسے ضد میں لاہور لے جاتا ہے۔
سدرہ کی شادی پر فارس کو علم ہوتا ہے کہ جنت کی پہلی شادی تایا کے اکلوتے بیٹے سے ہوئی تھی۔ پانچ سال تک رہی۔ بچہ نہ ہونے پر تایا کے بیٹے نے دوسری شادی کر لی۔ جنت کو اس کے بچے کو نقصان پہنچانے کی پاداش میں طلاق ہو گئی۔
فارس جنت کو وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لندن سے واپسی کے بعد وہ جنت کو لاہور سے لینے آتا ہے۔ جنت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی۔ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوتا ہے۔ دونوں محفوظ رہتے ہیں۔ گاڑی کا نقصان ہو جاتا ہے۔
لاہور سے واپسی کے بعد جنت بدل جاتی ہے۔ وہ فارس وجدان کے معاملات میں مداخلت ترک کر دیتی ہے۔
فارس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اسے الرجی ری ایکشن ہوتا ہے۔ بروقت سی پی آر دے کر وہ اس کی جان بچاتی ہے۔ ڈاکٹر بخاری بتاتے ہیں اسے بلی سے الرجی ہے جس کا ری ایکشن شدید ہوتا ہے
فارس کا بدلتا رویہ جنت کو خوف اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔
کراچی جانے سے پہلے فارس سرپرائز کی بات کرتا ہے۔
جنت مسز زوانی کے نواسے کی سالگرہ پر جاتی ہے جہاں عدینہ زبیر اسے ملتی ہے۔ جو بتاتی ہے کہ وہ فارس وجدان کی پہلی بیوی ہے۔
جنت کی چچی وجدان ہاؤس میں آ کر مسز شیرازی کو جنت کے ماضی سے آگاہ کر دیتی ہے۔ خوف میں آ کر جنت گھر چھوڑ دیتی ہیں۔
جنت کو گھر سے گئے، سات دن ہو چکے تھے۔ فارس بہت پریشان ہے، وہ اس کے سامان کا جائزہ لیتا ہے۔
ایک لکڑی کا باکس کھلنے پر چند خطوط، کچھ تصاویر اور باکس پر بنی نقاشی دیکھنے پر فارس ماضی میں پہنچ جاتا ہے۔
فارس کی ماں آرزو جہانگیر ایک ماڈل گرل ہے۔ وہ اس کے باپ ہارون سے طلاق لے لیتی ہے اور فارس کو ہارون کے پاس چھوڑ جاتی ہے۔
آرزو جہانگیر کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی اور خاندانی بیوی جمیلہ داؤد ہیں۔
ہارون کے باپ اعظم شیرازی بہت بڑے بزنس ٹائیکون ہیں۔ جمیلہ داؤد سے ہارون کا بیٹا حماد اعظم شیرازی کہتے ہیں "میں اس طوائف کے بیٹے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا پوتا صرف حماد ہے۔"
ہارون اعظم شیرازی کی منت سماجت کرتا ہے۔ ان سے معافی مانگتا ہے تو وہ اس شرط پر معافی دیتے ہیں کہ ہارون اپنا بیٹا ان کے حوالے کر دے اور اس سے کوئی تعلق نہ رکھے اور نہ ہی اسے اپنا نام دے۔ اعظم شیرازی جمیلہ داؤد کے خاندان سے خوف زدہ ہیں۔
شیرازی اور لاشاری خاندان کے درمیان جڑنے والا یہ رشتہ ایک بزنس ڈیل کی طرح تھا لیکن جمیلہ ہارون سے محبت کرتی تھیں۔
ہارون فارس کو اعظم شیرازی کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔
ایک رات اسے روتے سسکتے دیکھ کر جمیلہ اسے گلے سے لگا لیتی ہے۔ فارس زخمی ہوتا ہے۔ جمیلہ اسے ڈاکٹر مصطفیٰ کے پاس لے جاتی ہے۔
جمیلہ فارس کو کھلونے، نئے کپڑے لا کر دیتی ہے۔ اس کا کمرہ بھی سیٹ کرتی ہے۔ جمیلہ آرزو جہانگیر سے بھی ملتی ہے لیکن وہ بھی فارس سے ملنے سے انکار کر دیتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ وہ شادی کر رہی ہے۔
جمیلہ فارس کو محبت اور توجہ دیتی ہے۔ وہ بہتر ہونے لگتا ہے لیکن اعظم شیرازی کو یہ گوارا نہیں ہے۔ وہ اسے منع کرتے ہیں۔

شیرازی جمیلہ کو حماد کے پاس امریکہ بھجوا دیتے ہیں۔

فارس کے لیے جمیلہ داؤد کی جدائی آسان نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اسے پیار سے سمجھاتے ہیں۔

جمیلہ داؤد کے جانے کے فوراً بعد اعظم شیرازی اس کو بورڈنگ بھیج دیتے ہیں، وہ یہ سب برداشت نہیں کر پاتا۔ اس نفسیات پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس کی کارکردگی صفر ہو جاتی ہے۔ وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ شیرازی مینشن اب کبھی نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ، آغا علی کے ساتھ اس سے ملنے آتے ہیں اور ہر ہفتے آتے ہیں۔ وہ ان سے دوستی ختم کرنے کا اعلان کرتا ہے لیکن وہ بضد رہتے ہیں۔ وہ اسے جمیلہ داؤد کی مجبوریاں بتاتے ہیں، ان کے سمجھانے پر وہ اپنے آپ کو تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف کر لیتا ہے اور ہر مقابلے میں پہلی پوزیشن ہوتی تھی۔ اعظم شیرازی جب بھی آتے اس سے حقارت آمیز لہجے میں بات کر کے اس کی ماں آرزو جہانگیر کا تذکرہ ضرور کرتے۔

وہ بیمار ہوتا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ اپنی نواسی کے ساتھ اسے لے آتے ہیں۔ ان کی نواسی ساتھ ہوتی ہے جو پورا راستہ سوال کرتی رہتی ہے۔ وہ فارس سے دوستی کرنا چاہتی ہے، اپنے دوستوں کے ساتھ اس سے ملنے آتی ہے۔

جنت۔ کے جانے کے بعد وہ اس کی کمی محسوس کرنا لگتا ہے۔

جنت ہوش میں آئی تو صابرہ بوا پر اس کی نظر پڑی۔ صابرہ بوا اسے اپنے گھر لے آئیں۔ اس کے پریگننٹ ہونے کی خبر پر بہت خوش ہوتی ہیں۔ جنت حیران و پریشان ہو جاتی ہے۔ سائرہ خالہ کے گھر سب جمع ہو کر جنت اور اس کے کردار کو ڈسکس کرتے ہیں، عمار سب کو کھری کھری سنا دیتا ہے۔ فارس جنت کے موبائل پر مسز آفاق کے سات سالہ بیٹے زید کے میسجز آ رہے تھے۔

فارس اقصیٰ سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ صابرہ بوا جنت کو فارس سے صلح کا کہتی ہیں۔ جنت صابرہ بوا کے کہنے پر بچوں کے ساتھ باہر گھومنے جاتی ہے، واپسی میں اسے فارس ملتا ہے وہ صابرہ بوا کے گھر کا کھوج لگا لیتا ہے۔

آٹھویں قسط

کروٹوں پر کروٹیں بدلتی وہ کافی دیر تک بے آرام پڑی۔ بمشکل بارہ بجے آنکھ لگی تو ڈیڑھ بجے کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

پورا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب ہی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ایک وہی تھی جسے ایک پل کا آرام نہیں تھا۔

اس نے چپل ڈھونڈ کر پہنی۔ کچن میں جا کر پانی پیا، پھر فاطمہ پر ٹھیک سے لحاف ڈالتی سیڑھیوں کی طرف جا کھڑی ہوئی۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

نیچے سب سو رہے تھے تو اوپر وہ بھی یقیناً سو ہی رہا ہوگا۔ کچھ دیر تک وہ شال کو کندھوں پر ڈالے گومگو سی کیفیت میں اپنی جگہ کھڑی رہی۔

وہ فارس وجدان کو جگا کر بوا کی غیر موجودگی میں ہی اس کی آمد کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔ اور یہ کام وہ صبح سے پہلے پہلے کر لینا چاہتی تھی۔

جانتی تھی بوا مداخلت سے باز نہیں آئیں گی۔ وہ ان کے مابین صلح کی ہر ممکن کوشش کریں گی اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔

اسی طرح خود سے الجھتی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔ خیال تھا وہ سو رہا ہوگا، مگر کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ اس نے کھڑکی کی اوٹ سے اندر جھانکا۔ کمرہ خالی۔۔ فارس ندارد!!

یہ کدھر گیا؟ یہاں وہاں نگاہ دوڑاتے وہ منڈیر تک گئی۔ اور یہیں سے اس نے سڑک کی طرف دیکھا جہاں اندھیرے میں گاڑی کا گمان ہو رہا تھا۔

کمرہ اور پھر صحن کا چکر کاٹ کر اچھی طرح سے جائزہ لیتی وہ دائیں طرف مڑی اور اگلے ہی لمحے کسی سے ٹکرا گئی۔

خوف اپنی جگہ۔ جھٹکا دوسری۔ مگر جو چوٹ ناک پر لگی اس کا درد پورے جسم میں دوڑ گیا۔ فارس نے اسے بازو سے پکڑ کر گرنے سے الگ بچایا۔

آئرن مین کے تھے۔ ''ناک بہانے اس پر پھٹ پڑی۔ ''دیکھ کر نہیں چل سکتے۔''

حالانکہ چل تو وہ رہی تھی۔ آئرن مین تو کھڑا تھا۔

''تم..... ٹھیک ہو؟'' کھانسی اور زکام کی شکایت لیے فارس کی آواز بھاری۔ تنفس بھی بھاری۔ اور دل بھی بھاری۔ ''تیس سیکنڈ پہلے تک ٹھیک تھی۔'' اس نے فارس کے بخار سے تپتے ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا۔ ''بلکہ سات گھنٹے پہلے تک بالکل ٹھیک تھی میں۔'' تپ کر جھلا کر جواب دینے کے بعد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کے ہیزل آنکھوں کا اب جیسے کوئی رنگ نہ تھا۔ صرف سیاہی ہی تھی۔ ہر جگہ اور ہر طرف۔ اس کے تاثرات مبہم پیچیدہ تھے۔ نہ اس کی آمد سمجھ میں آرہی تھی۔ نہ وہ اس کا دماغ پڑھ پا رہی تھی۔ کچھ تو ہوا تھا اس کی غیر موجودگی میں..... یقیناً کچھ تو.....

یکا یک کسی ممکنہ خدشے نے سر اٹھایا تو دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

''آنٹی ٹھیک ہیں؟'' پہلا خیال ہی مسز شیرازی کا آیا۔ پہلی فکر، پہلا خوف، پہلا اندیشہ ہی ان سے متعلق تھا۔ اس کی وجہ سے انہیں کتنی پریشانی ہوئی ہوگی۔ اپنے بیٹے کے معاملے میں، اپنی پسند کو سوچ کر وہ کتنا ڈپریس ہوئی ہوں گی۔

فارس کا سر اثبات میں ہلا۔ اس کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوگئیں۔ صد شکر بات ان کی نہ تھی۔ صد شکر وہ خیر خیریت سے تھیں۔

''تو پھر.....؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

سرد ہوائیں سفیدے کے پتوں سے سرسرا کر گزریں۔ دھرتی پر پھیلا ہوا اندھیرا سمٹ گیا۔ چاندنی زمین پر اتر آئی۔ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے سیاہی میں نمایاں ہوئے۔ مگر جو خاموشی تھی وہ کچھ دیر تک ٹھہری۔

ادھورا رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا وہ اس کا انتظار کر لیتی۔ وہ کیسے کہہ دے وہ اس کا انتظار کر لیتی؟ اس کا ہر لفظ بے وقعت ہوگیا۔ ہر بات، ہر دلیل، ہر حجت بے وزن ہوگئی۔ باوجود کوشش کے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کچھ نہ بتا سکا۔

بات دل کی تھی۔ اور دل تک تھی..... اسے زباں پر لانے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ ہمت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ نہ اعتراف کی سکت رہی تھی نہ معذرت کا حوصلہ رہا تھا۔ جانے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو رلا کر آسانی سے معافی مانگ لیتے ہیں، اس سے تو نہیں ہو رہا تھا۔ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے اندر کی بے قراری پر قابو پاتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اس کے خیالات منتشر تھے۔ اس کی سوچ واہموں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کا دل اندیشوں کے جالوں سے پر تھا۔ درد اب ہر جگہ تھا۔ اندر باہر ایک سی کیفیت ہو رہی تھی۔

''اس رات جو ہوا مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔'' اس کے احساسات سے قطعی بے خبر جنت کمال کہہ رہی تھی۔ ''میں آنٹی کو کوئی بھی ٹینشن نہیں دینا چاہتی تھی لیکن فائزہ بچی اچانک آگئیں۔ انہوں نے آنٹی کو میرے بارے میں سب بتا دیا۔'' شال کے کنارے سے کسی دھاگے کو کھینچتے ہوئے وہ آنکھوں میں افسوس اور ندامت لیے اس طرح سے بات کر رہی تھی جیسے وہ تمام کی تمام باتیں اس کی پوشیدہ حقیقتیں، اس کی سچائیاں، اس کے اعمال تھے۔

جنت کمال کے سامنے کھڑا فارس وجدان موم کے پتلے کی طرح پگھلنے لگا۔ اس کا دل مٹھی میں جکڑا گیا تھا، اس کے سینے پر وزن بڑھ گیا تھا۔

''تم بہت اچھے ہو۔ بابا سے بھی اچھے!'' اس کے کمرے کے عین وسط میں ایک سات سالہ بچی نے بازو پھیلا کر گول گول گھومتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

آن کی آن میں بہت سی باتیں، لہجے، طنز اور

سے اسے پاد آئے۔ ہر وہ کچ بات جو اس سے کر چکا تھا۔ ہر وہ زخم جو لفظوں کی صورت اسے دے چکا تھا۔ کتنی چوٹیں تھیں۔ کتنا تشدد تھا۔ کتنی نفرت تھی۔ کتنا بڑا عذاب۔ کتنی بڑی سزا تھی یہ..... اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا اگر وہ تمام کی تمام باتیں جھوٹ ثابت ہوئیں تو؟

''میری وجہ سے آنٹی کو بہت دکھ پہنچا ہوگا۔'' وہ ابھی تک اسی غم میں تھی۔ ''اس کے لیے آئم ایکسٹریملی سوری۔''

فارس وجدان کی ماں کو جو تکلیف اس کے وجود سے پہنچی۔ اس کی معذرت! بہت دل سے معذرت!

اور وہ خاموش تھا۔ بہت زیادہ خاموش۔ اسے لگا وہ سانس بھی نہیں لے رہا۔

یکا یک کسی خیال کے ذہن میں آتے ہی اس نے شال کا سرا چھوڑ چھاڑ کر سر اٹھایا۔

''کہیں اب تم اس بات کا ایشو بنا کر مجھے کوئی ''سزا وزا'' دینے تو نہیں آئے؟'' اب کے خاصی مشکوک نظروں سے اس نے فارس کو گھورا۔

ہوا کے زور سے بال پیشانی پر جھکے۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ جنت کے ساتھ ساتھ ہر منظر دھندلا گیا۔

''اب اگر تم نے کہا میں تمہیں طلاق نہیں دینا چاہتا، ساری عمر اسی طرح لٹکا کر رکھوں گا۔ وغیرہ وغیرہ تو آئی سویئر میں خلع کے لیے کورٹ چلی جاؤں گی۔'' سخت لہجے میں دھمکا کر اس نے اپنے ارادے واضح کر دیے۔

وہ اس پر نظریں جمائے منجمد سا کھڑا تھا۔ جنت کمال اس سے کبھی نہیں ڈری تھی۔ نہ پندرہ سال پہلے۔ نہ پندرہ سال بعد۔

''اور اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں.....''

''ایک کپ چائے ملے گی۔'' اسے لگا اگر وہ اسے سنتا رہا بار بار اس کے شک، اس کے شبہات، اس کے سوالات کی زد میں کھڑا رہا تو فنا ہو جائے گا۔

جنت کمال نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ یہاں اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اور اس امیر زادے کو چائے کا کپ چاہیے تھا؟ وہ بھی رات کے ڈھائی بجے؟

دھتکار، نفرت ایک طرف۔ لحاظ اور مروت دوسری طرف۔ نوکروں کی فوج بہر حال یہاں نہیں تھی۔ سلگ کر اسے دیکھا۔

صرف اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اور صرف اس لیے کہ وہ بوا کا ''مہمان'' تھا، وہ غصے سے پاؤں پٹختی کچن میں چلی گئی۔

''اپنی چہیتی بیوی کو ساتھ لانا تھا نا ان خدمت داریوں کے لیے۔'' بڑبڑاہٹ واضح تھی۔

وہ اس کے پیچھے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ لبوں کو مسکراہٹ چھو کر گزری۔ دل میں غم سا ٹھہر گیا۔

''مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تمہیں اپنی پہلی بیوی سے اتنی محبت تھی تو تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ آنٹی نے گن پوائنٹ پر تو نکاح نہیں پڑھوایا تھا۔ تم انکار بھی تو کر سکتے تھے۔''

خاموشی۔ مکمل خاموشی۔

سلینڈر جلا کر کیتلی رکھی۔ دودھ ڈالا۔

''بھلے سے تمہیں برا لگے لیکن ایک بات ہے، تمھاری چوائس ہے بہت بری۔'' عدینہ زبیر ایک بار پھر اپنے تمام تر غرور، حسن اور نزاکت کے ساتھ اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی تو بھڑاس نکالنا ضروری ہو گیا تھا۔

''ممی کی چوائس اچھی ہے؟''

''ہاں بالکل۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی مگر اگلے ہی لمحے پل۔ جب سمجھ میں آیا کیا کہہ دیا ہے تو گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ لب بھینچ کر خود کو دل ہی دل میں کوسا اور لب سی لیے۔ کہ اب وہ کچھ نہیں بولے گی۔

خاموشی سے اس کی طرف پشت کیے چائے بنا کر کپ میں انڈیل کر مڑی تو کچن کے دروازے پر وہ نہیں تھا۔ اپنا مگ ساتھ رکھ کر وہ کمرے میں آ گئی۔ سامنے ہی وہ بیڈ پر ہلکی سی کھانسی کی زد میں بیٹھا تھا۔

نشو کا پیک ہاتھ میں تھا۔ روشنی میں اب اس نے دیکھا تھا آنکھیں سرخ اور کنارے سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔

اس نے چائے پیش کردی۔

''بسکٹس نہیں ہیں؟''

وہ جانے کے لیے مڑی اور پھر ضبط کر کے پلٹی۔ بسکٹس کے ساتھ ایک گلاس پانی بھی رکھ دیا۔ اپنا مگ ہاتھوں میں لیے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں تک اسے گھورتی رہی کہ اب وہ کچھ بولے گا اور اپنی آمد کی وجہ بتائے گا مگر فارس وجدان چائے اور بسکٹس کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اسے مکمل نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ اندر تک سلگ اٹھی۔

''تمہیں پتا ہے یہاں بوا کے گھر میرے لیے کتنے رشتے آچکے ہیں؟'' آخر اسے یہ باور بھی تو کرانا تھا کہ وہ کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہے۔ اور اگر فارس وجدان کو کئی لڑکیاں مل سکتی ہیں تو اسے بھی اپنانے والے بہت ہیں۔

وہ چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے لمحے بھر کے لیے رکا۔

''بوا تو ہنس کر ٹال دیتی ہیں، انہیں ہمارے معاملات کا علم نہیں لیکن میں بہت غور کر رہی ہوں۔ ایک رشتہ مجھے اپنے لیے مناسب لگا ہے۔ بوا کا دور پرے کا رشتہ دار ہے۔ بیوی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ دو چھوٹی چھوٹی سی بیٹیاں ہیں۔ لڑکا بھی کوئی زیادہ بڑی عمر کا نہیں۔ تم سے طلاق کے بعد مجھے اپنے لیے بھی کچھ سوچنا ہے۔ اب میں کہانیوں کی ہیروئن کی طرح یہ نہیں کہہ سکتی کہ پلیز مجھے اپنا نام دے دو۔ میں ساری عمر اسی نام کے سہارے تنہا رہنا چاہتی ہوں بلا..... بلا..... بلا!'' باقاعدہ چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہاتھ جھلا کر کہا۔

چائے میں بسکٹ ڈبو کر منہ تک لے جاتے فارس نے رک کر نظر اٹھائی۔ بسکٹ ٹوٹ کر چائے میں گرا۔ اس کا دل بھی۔

مگ ہاتھوں میں لیے اس سے دس قدموں کے فاصلے پر اب وہ میز پر پڑی کھلی تھی۔ پیچھے کھڑکی پوری کی پوری کھلی ہوئی تھی۔ ہوا کے زور سے دوپٹہ ڈھلک کر کندھوں پر آگرا تھا۔ شہد بالوں کی لٹیں پونی سے نکل کر چہرے کے اطراف میں ڈھیلی ہو رہی تھیں۔

''تمھارے لیے رشتے آرہے ہیں؟''

''تو کیا نہیں آسکتے؟'' ابرو چڑھا کر پوچھا۔ وہ اپنی چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جنت کمال نہیں بدلی تھی۔

''ویسے میں تم سے کچھ دنوں تک رابطہ کرنے والی تھی۔ میرا سامان بھی تمھارے گھر رہ گیا ہے۔ تم نے کہیں پھینکوا تو نہیں دیا؟'' ناک اونچی کر کے ظاہر کیا اسے تو اب صرف اپنے سامان سے مطلب ہے۔

ایک اور بسکٹ ٹوٹ گیا۔ آدھا جو منہ میں گیا اس کی مٹھاس ختم ہو گئی۔ اس نے پانی کے چند گھونٹ بھرے بسکٹ کا دوسرا پیک کھولا۔

''آنٹی کو معلوم ہے تم یہاں آئے ہو؟''

وہ خاموش رہا۔

اور یہ خاموشی جنت کے دل میں کرب اتار گئی۔ ظاہر ہے اگر وہ انہیں بتاتا تو کیا وہ اسے آنے دیتیں؟؟ اس جیسی لڑکی کی اب ان کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اس بات پر رنجیدہ ہوتی ہوں گی کہ انہوں نے فارس کے لیے اس کا انتخاب کیوں کیا؟

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' گھوم پھر کر وہی سوال۔ مگر وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ نہ طنز، نہ طعنے، نہ کوئی سخت بات، نہ کوئی تضحیک آمیز رویہ۔ نہ تلخ لہجہ۔

فارس وجدان اب کیا کرنے والا تھا؟ وہ فکر میں پڑ گئی۔

کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولا تو نوٹ بک کا صفحہ پھاڑ کر، اس میں اپنی کچھ چیزیں درج کر کے وہ اس کے پاس آگئی۔

''یہ تمھارے لیے بے شک کچرا ہو گا مگر مجھے

ملازم کے ہاتھ بھجوا دینا۔"

فارس نے صفحہ لے لیا۔ فولڈ کر کے اس کے ارسلان بھائی کی قمیص کی جیب میں رکھ دیا۔ وہ تپ گئی۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ پھر انہی بگڑے تیوروں کے ساتھ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ فارس نے ہاتھ تھام لیا۔

"تمھاری بوا کہہ رہی تھیں کوئی بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہوں گی؟"

وہ اپنی جگہ پتھر ہوئی۔ چہرے کا رنگ فق، آنکھیں نم، پلکیں بھاری ہو گئیں۔

"کچھ نہیں!" بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ گرفت سخت نہیں تھی مگر اتنی نرم بھی نہیں کہ وہ آزاد ہو سکتی۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔" آن کی آن میں اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ وہ کل سے بات کرتے ہوئے بھی غصے کی انتہا پر لگ رہی تھی۔ فارس نے چند لمحوں کے لیے اسے پشیمانی سے دیکھا۔

اسے اس نہج پر لانے والا وہ خود تھا۔ فاصلوں کی دیوار اس نے خود قائم کی تھی۔ نرمی کو اپنی سختی سے نوچا تھا۔ امید کو اپنے لفظوں سے مارا تھا۔

نازک کلائی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں دیوار سے لگ کر، کئی بار اپنی آنکھوں کو مسلا، لب بھینچ کر، گال رگڑ کر خود کو سنبھالا، خود کو سمجھایا کہ جس راستے پر وہ گامزن تھی، وہ اس کا اختیار کردہ ہرگز نہیں تھا۔ یہ مقدر کی چال تھی۔ نفرتیں، دھتکار اور بلاوجہ کی عداوتیں اس راستے کا خاصا تھیں جو اسے کچھ لوگوں کی بے رخی سے عنایت ہوا تھا۔

فارس وجدان، عدینہ زبیر کا تھا، اس کے دل پر عدینہ زبیر کی حکمرانی تھی۔ اس کی زندگی میں جنت کمال کی کوئی گنجائش نہ پہلے تھی، نہ اب ہو سکتی تھی۔ جو ملے ہو چکا تھا اسے قبول کر کے اسے ہر صورت اپنے سفر کو جاری رکھنا تھا۔ اسے کمزور نہیں پڑنا تھا۔

وہ بچے پی گی۔ اپنی چارپائی پر لیٹ کر، آسمان کو دیکھتے وہ مسلسل اپنے رونے پر قابو پاتی رہی۔

فارس کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس کے سکون میں خلل پڑ چکا تھا، اس کے لاشعور میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ وہ اس کے بچے کا باپ تھا۔ جتنی نفرت وہ اس سے کرتا تھا، وہ اولاد کے معاملے میں بھی اب اسے کسی نئے امتحان میں ڈال سکتا تھا۔

کروٹ پر کروٹ بدلتے رات گزر گئی۔ دن بیدار ہوا۔ صبح کی نماز پڑھ کر سونے کی کوشش کی تو آنکھ لگ گئی۔ کچھ گزشتہ شب کی بے خوابی تھی کہ وہ دن چڑھے تک سوتی ہی رہی۔

دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو سورج سوا نیزے پر آ چکا تھا۔ صحن میں دھوپ ہر کونے تک پہنچی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا، کھڑکیوں کی درز سے نیم تاریکی میں روشن لکیریں نمایاں ہو رہی تھیں۔

پہلا خیال اسے فارس کا ہی آیا۔ دماغ از سر نو الجھن گیا۔ ٹینشن شروع ہو گئی۔ اٹھ کر باہر گئی تو معلوم ہوا وہ تو صبح سے پہلے پہلے یہاں سے جا چکا ہے۔

جنت اپنی جگہ بے یقین کھڑی رہ گئی۔

"ضرور تو نے ہی اسے کچھ کہا ہو گا۔" صابرہ بوا اس سے سخت خفا تھیں۔ "تیری وجہ سے وہ بخار میں گھر چھوڑ کر چلا گیا۔"

بے دلی سے دہی کے ساتھ پراٹھا کھاتے ہوئے وہ آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پرے دھکیلتی رہی۔ بوا کے سوال، ان کا غصہ، ان کی ناراضگی اور ساری پچویشن کو کسی طور نہ سمجھنے کا یہ عمل اسے شدید اذیت سے دوچار کر رہا تھا۔

اب کیا وہ اس کے پاؤں پکڑتی کہ وہ اسے طلاق نہ دے؟ خود کو جتنا بے مول کرنا تھا وہ کر چکی تھی۔ محبت سے، اخلاق سے، خدمت گزاری سے اس رشتے کو بچانے کی جتنی کوشش اس نے کرنی تھی کر لی تھی۔ اب تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ نہ محبت، نہ

ہمت، نہ سکت اور حوصلہ کہ بات کر سکیں۔
اب تو برداشت بھی اپنی آخری حد کو چھو رہی تھی۔ وہ پھر سے کسی امتحان میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ پھر سے کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ مگر بوا.....

صندل آپا، ارسلان بھائی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں تو وہ چپ ہو گئیں۔ لیکن آنکھوں سے واضح کر دیا کہ ان کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔

سارا دن وہ پریشانی میں مبتلا یہاں وہاں ٹہلتی رہی۔ سکون تو کسی پل نہیں تھا۔ آخر وہ کیوں آیا تھا؟ اور معاملات کلیئر کیے بغیر کیوں چلا گیا تھا؟ ان کے مابین طلاق کا فیصلہ ہونا تھا۔ تو ایسے کیسے وہ خاموشی سے جا سکتا تھا؟ اس پر مستزاد یہ کے اس کے سامان کی لسٹ بھی یہیں چھوڑ گیا تھا۔

شام کو بوا کمرے میں آئیں تو وہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد بیڈ پر نیم دراز بیٹھی تھی۔ اخبار سامنے ہی کھلا پڑا تھا۔ ذہن الجھا ہوا تھا اور نگاہیں خلا میں کہیں بھٹک رہی تھیں۔

''اس نے بتایا نہیں وہ دوبارہ کب آئے گا؟''

تہ کیے ہوئے کپڑے الماری میں اندر رکھتے ہوئے انہوں نے ہنوز خفگی سے پوچھا۔ اس نے گردن موڑ کر انہیں مضطرب نگاہوں سے دیکھا۔ ان کی سوچ ابھی بھی وہیں تھی۔

''ہو سکتا ہے کچھ دنوں تک وہ مجھے طلاق کا نوٹس بھجوا دے۔'' ہمت مجتمع کر کے اس نے کہہ دیا۔ اب بھلے سے بوا سخت ناراض ہوں اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ کچھ باتیں ان پر ہر صورت واضح کر دینا چاہتی تھی۔

''مگر طلاق تو نہیں ہو سکتی۔'' الماری بند کر کے بوا اس کی طرف مڑیں۔

''ہو جاتی ہے بوا! عورت حمل سے ہو تب بھی طلاق ہو جاتی ہے۔''

''مگر وہ شیدو تو یہی کہہ رہی تھی کہ نہیں ہوتی۔'' اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق جو انہوں نے سن رکھا تھا کہہ دیا تھا۔

بید سائڈ ٹیبل سے قرآن اٹھا کر اس نے مطلوبہ سورت ڈھونڈی، اور پھر مطلوبہ صفحہ کھولا، مطلوبہ آیت پر اپنی انگلی رکھی۔

''یہ دیکھیں۔ یہاں لکھا ہے۔'' اور حمل والیوں کی عدت ان کے بچہ جننے تک ہے'' (سورہ طلاق)۔ یہ آیت مطلقہ اور بیوہ دونوں کے بارے میں ہے بوا۔ طلاق ہر صورت ہو جاتی ہے۔'

دلیل قرآن سے تھی، بوا کے پاس نفی یا انکار کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اب وہ الجھن میں کھڑی تھیں۔ فکر نے از سر نو گھیر لیا تھا۔ انہیں اب معاملہ سلجھتا ہوا ہرگز نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن انہیں اپنی طرف سے ہر ممکن سعی کرنی تھی۔

کچھ سوچ کر وہ اس کے پاس بیڈ آ بیٹھیں۔

''تو نے اسے خوشخبری تو سنا دی تھی؟''

جنت کا دل بھاری ہوا۔ نظریں جھک گئیں۔ کس قدر کوشش سے اس کا سر نفی میں ہلا۔

صابرہ بوا حق دق اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ جنت یہ کیا کر رہی تھی؟

''تو اس بات سے اسے کیسے بے خبر رکھ سکتی ہے جنہ؟؟ کیسے؟؟ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے بیٹا۔''

''اور جو زیادتیاں میرے ساتھ ہوئیں وہ؟''

صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ آواز بھرا گئی۔ ''مجھے اس کے ساتھ اب نہیں رہنا تو کیا زبردستی ہے؟'' وہ اس لمحے بہت پریشان۔ مضمحل۔ اور شکست خوردہ سی لگ رہی تھی۔ بوا کے دل کو کچھ ہوا۔

''میں پہلے سے بہت مشکل میں ہوں اور آپ۔ آپ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے اور مشکل میں ڈال رہی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے۔

اسے ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بوا نے بہت نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''عورت کو رشتہ نبھانے کے لیے بہت قربانیاں دینا پڑتی ہیں بچے! یہ شادی۔ عمر بھر کا ایک

فیصلہ ہوتا ہے۔ اسے یوں جذبات میں آ کر نہیں لوڑا جاتا۔ گھر بسانے کے لیے عورت کو بہت کچھ برداشت کرنا ہے۔''

اس نے سر اٹھا کر تکلیف دہ نگاہوں سے بوا کو دیکھا۔ بات گھر بسانے، رشتہ نبھانے اور برداشت کی انتہا پر جانے کی تھی۔ بوا کو اندازہ ہی نہیں تھا فارس وجدان کے ساتھ اپنے اس رشتے کو بچانے کے لیے اس نے کیا کچھ برداشت نہیں کیا تھا۔

اس کا صبر، اس کا تحمل، اس کا انتظار کیا ابھی بھی ناکافی تھا؟ وہ خود مٹ چکی تھی مگر اس کا صبر باقی رہنا چاہیے؟ اس کی ہمت، اس کی برداشت۔ اس کا تحمل باقی رہنا چاہیے؟ یہ کیسی منطق تھی؟ یہ کیسا طریقہ تھا؟

کتنی ہی دیر تک وہ اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ اندر ہی اندر خود کو نوچتی کھسوٹتی رہی۔ محاسبہ شروع ہو چکا تھا۔ پانچ سالوں کا موازنہ پانچ مہینوں سے ہونے لگا تھا۔

برہان ایک طرف تھا تو فارس وجدان دوسری طرف۔ وہ دو گھروں کے درمیان۔ ایک ویران گلی میں تنہا لاوارث کھڑی تھی۔ دروازے دونوں طرف سے بند تھے۔ اور وہ خود کو جانچ رہی تھی۔ دل میں جا کر، روح کی گہرائیوں میں اتر کر، ماضی کی تکلیفوں کو سہتے ہوئے، مستقبل کا خوف اٹھاتے ہوئے۔

اس کے اندر کی الجھنیں بڑھ گئیں۔ سوال بڑھ گئے۔ اضطراب بڑھ گیا۔

سر اٹھا کر اس نے بوا کو دیکھا۔ اب تک جانے وہ گھر بسانے سے متعلق اسے کتنے گر بتا چکی تھیں۔ ان کے لب متحرک تھے۔ آنکھوں سے ایک آس چہرے سے امید جھلک رہی تھی۔ وہ بہت پیار سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''بوا ایک بات تو بتایئے۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئیں تو اس نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ ذرا سا آگے سرک کر ان کے قریب ہوئی۔

''عورت نکاح نامے پر سائن کس لیے کرتی ہے؟'' نم آنکھوں میں ایک سادہ سا سوال لیے وہ اب ان سے پوچھ رہی تھی۔ بوا کو اس کا سوال سمجھ میں نہ آیا۔

''ذلت؟ دھتکار؟ بے عزتی؟ طنز؟ تحقیر؟ محرومیوں کے لیے؟ کیا یہ سب برداشت کرنے کے لیے شادی کی جاتی ہے؟ اسی عذاب کو جھیلنے کے لیے ''قبول ہے'' کہا جاتا ہے؟''

بوا کو سکتہ سا ہوا۔ لبوں کو جنبش دے کر کچھ کہنا چاہا مگر آواز نے ساتھ نہ دیا۔ جنت یہ کیا پوچھ رہی تھی؟ اس نقطے کی طرف کیوں جا رہی تھی جس نقطے سے یہ رشتہ آغاز پکڑتا تھا۔ وہ ایجاب و قبول کی گھڑی۔ جب دو لوگ ایک ہوتے تھے؟ اور جب دو لوگ ایک ہوتے تھے تو رشتہ نبھانے کے معاملے میں وہ ''دو'' الگ کیوں ہو جاتے تھے؟؟ سفر کا سارا بوجھ صرف ایک کے کندھے پر کیوں آ جاتا تھا؟ رشتہ بچانے کی ساری محنت پھر کسی ایک فریق کو کیوں کرنی پڑتی تھی؟؟

''شادی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ کیا ہمارے نبی کی سنت یہ کہتی ہے اپنی عزت فنا کر دیں۔ اپنا وجود مٹا دیں۔ اپنے حق کے لیے آواز نہ اٹھائیں اور ظلم برداشت کریں۔ اور مرتے دم تک کرتے جائیں؟''

بوا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''آپ ہی مجھے سمجھا دیں یہ گھر بسانے کا، رشتہ نبھانے کا کون سا طریقہ ہے بوا؟'' اس کی آواز کپکپائی، ''عورت نفسیاتی مریضہ ہو جائے اور اف تک نہ کرے؟ اندر سے مر جائے، مٹ جائے، فنا ہو جائے لیکن آہ تک نہ کرے؟''

وہ بائیس سالہ جنت کمال۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی۔

تتلیوں کے پیچھے بھاگنے والی۔ پریوں کی باتیں کرنے والی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اور بوا اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسے سن رہی تھیں۔ وقت اور حالات نے اسے کتنا بڑا کر دیا تھا۔ اس کی سوچ کتنی پختہ ہو گئی تھی۔ اس کی باتوں میں کتنا وزن آ گیا تھا۔ تسلی دینے کو، تشفی کرنے کو ان کے پاس ایک لفظ بھی تو نہیں رہا

تھا۔ جو کچھ وہ سہ آئی تھی اور جن حالات سے گزر کر وہ ان تک پہنچی تھی۔ وہ اس کا سفر، اس کا راستہ، اس کی مجبوری سمجھے بغیر اس کی ہر بات کیسے رد کر سکتی تھیں؟ کیسے جھٹلا سکتی تھیں؟ کیسے؟

''میں نے برہان کے ساتھ پانچ سال گزارے ہیں بوا..... میں نے اس کے لیے اس کے گھر والوں کی ہر نفرت برداشت کی ہے۔ ہر طنز، ہر طعنہ۔ خود پر لگنے والے الزامات۔ سب کچھ۔ میں نے ''برداشت'' اور ''صبر'' سے اپنا گھر بسانا چاہا تھا۔ اور بدلے میں اس نے مجھے کیا دیا؟ طلاق؟'' اس نے رک کر ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''پانچ سالوں کا ساتھ تھا ہمارا۔ اس نے مجھے پانچ سیکنڈ میں آزاد کر دیا۔ میں اس کے گھر والوں کو ''برداشت'' کر رہی تھی۔ وہ بھی تو مجھے ''برداشت'' کر سکتا تھا؟ میں اس کی بے رخی پر صبر کر رہی تھی۔ وہ بھی تو مجھ پر ''صبر'' کر سکتا تھا؟ وہ جانتا تھا میرا کوئی نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا مجھے تو میری سگی ماں بھی قبولنے کو تیار نہیں۔ اس کے باوجود اس نے۔ اس نے مجھے طلاق دے دی۔ مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس نے میرے منہ پر جو تھپڑ مارا اس کی جلن مجھے آج تک محسوس ہوتی ہے۔'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے مکمل تر ہو چکا تھا۔

''اس نے رویہ بدلا، ترجیحات بدلیں، حقوق بدلے، میری جگہ کسی اور کو دی۔ میرا وقت کسی اور کو دیا۔ میرا حق کسی اور کو دیا اور میں خاموش رہی۔ آخر کس لیے؟'' اس کی آواز بھیگی۔ ''صرف اس لیے کہ میرا گھر بچا رہے۔ مجھے بتائیے میرا وہ گھر پھر کیوں نہیں بچا؟ کیوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میری آنکھوں کے سامنے بکھر گیا؟''

جنت کے آنسو، اس کی سسکیاں، اس کا درد، اس کے سوال انہیں تکلیف پہنچا رہے تھے۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے اسے دکھ سے سن رہی تھیں۔

''مجھے اب خود سے نفرت ہوتی ہے بوا، غصہ آتا ہے میں خاموش کیوں رہی۔ میں نے یہ سب کیوں ہونے دیا۔ میں نے خود کو اتنا کیوں جھکایا؟ اتنا کیوں گرایا؟ میں نے اپنے حق کے لیے آواز کیوں نہیں اٹھائی۔ اگر میں وقت سے پہلے خود کوئی اسٹیپ اٹھا لیتی۔ اگر میں خود برہان سے الگ ہو جاتی۔ تو امی..... امی کم از کم اس صدمے سے تو نہ مرتیں کہ ان کی بیٹی ایک قاتلہ ہے۔ یہ ڈرامہ۔ یہ ہنگامہ تو نہ ہوتا بوا! میری وجہ سے میری بہنیں امی سے جدا تو نہ ہوتیں۔ میری طرح وہ بھی یہ رشتہ تو نہ کھوتیں۔''

بوا نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ اسے مزید روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

''میں نے اپنے اور فارس کے رشتے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے بوا۔ آپ خود بتائیں۔ کون لڑکی چاہے گی اس کی دوسری شادی بھی ختم ہو جائے؟ اسے دوسری بار بھی طلاق ہو جائے؟؟'' آواز نے ساتھ چھوڑا تو اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ ''میں نے یہاں بھی صبر کیا ہے۔ بہت صبر کیا ہے لیکن..... یہ گھر بھی آپ کی جنہ کا نہیں ہے۔ آپ کی جنہ اس دوسرے مرد کی بھی نہیں ہے بوا۔''

ان کا دل کرچی کرچی ہوا۔ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ کون کہہ سکتا تھا، زندگی سے بھرپور ہنستی مسکراتی لڑکی کا نصیب ایسا ہوگا؟ اس کے راستے میں ایسے پہاڑ آئیں گے۔ ایسی آزمائشیں اور ایسے امتحان!

''نانا کہا کرتے تھے، صبر حالات پر کیا جاتا ہے۔ ظلم پر نہیں۔ ظلم انسان تب برداشت کرے۔ جب اس کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہ ہو۔''

ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کر کے۔ چہرے کے اطراف میں سیدھا گرتی لٹوں کو اس نے کان کے پیچھے کیا۔

اس کی ناک، گال، آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں لیکن وہ مکمل لگ رہی تھی۔ جیسے اس نے خود کو سنبھال لیا ہو۔

''میں نے جو غلطی پہلے کی۔ وہی غلطی دوبارہ

میں لیا ہوا فیصلہ ہے۔ جذبات میں ایسا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر لیتی۔ جہاں میری کوئی جگہ نہیں وہاں میں زبردستی جگہ نہیں بنانا چاہتی۔ اپنی اولاد کو استعمال کر کے تو..... بالکل بھی نہیں۔''

بات ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

اپنے اندر بہت سی خاموشیاں لیے صابرہ خاتون اپنی جگہ گم صم بیٹھی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

مسز شیرازی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد چائے کا کپ لیے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ ملازمہ نے لیپ ٹاپ ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ کمرے میں اب وہ اکیلی تھیں۔ منتظر نگاہوں سے اسکرین کو تکتی وہ فکروں میں گھری بیٹھی تھیں۔ گزشتہ شب فارس سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا مگر صبح اس نے اپنی خیریت کا میسج ارسال کر کے کہا تھا وہ دوپہر تک ضرور کال کرے گا۔

کچھ ہی دیر میں کال مل گئی۔ اسکرین پر کمرے کا منظر نمایاں ہوا۔

موبائل کو اسٹینڈ پوزیشن میں رکھے وہ سامنے کارپٹ پر بیٹھا تھا۔

شاور لے کر باہر نکلا تھا۔ سیاہ ٹینک ٹاپ میں کسرتی بازو نمایاں ہو رہے تھے۔ بال ابھی بھی گیلے تھے۔ عقب میں دیوار گیر کھڑکیاں، بیڈ اور وارڈ روب نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً ہوٹل کے کمرے میں تھا۔

میز پر کہنیاں ٹکائے اب وہ خیر خیریت پوچھ رہا تھا اور وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سرخ آنکھوں میں ہلکی سی سوجن تھی۔

''کیسی ہے میری بہو؟''

اس نے نظر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ پھر منرل واٹر کی بوتل اٹھالی۔ آدھی بوتل خالی کر کے فرنچ فرائز کی پلیٹ قریب کر لی۔

''اچھی ہے۔'' جواب مختصر تھا۔

''صرف اچھی ہے؟''

کے۔ اور اگر میں اسے چھوڑ سکتا ہوں تو اسے اپنانے والے بہت ہیں۔''

مسز شیرازی کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری جسے لب بھینچ کر انہوں نے دبا لیا۔ ''اور.....؟''

''مجھے دیکھ کر اسے بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔ ایک کپ چائے پلانے پر دس باتیں سنائی ہیں۔ اسے لگتا ہے یقیناً میں اسے کوئی سزا دینے آیا ہوں۔'' وہ بتاتے ہوئے فرنچ فرائز بھی کھا رہا تھا۔

''اچھا۔'' انہوں نے گود میں کشن رکھ لیا۔

''وہ چاہتی ہے وعدے کے مطابق اب میں اسے آزاد کر دوں۔ نہ کیا تو وہ خلع کے لیے کورٹ چلی جائے گی۔''

اور اس آخری بات پر مسز شیرازی فارس کو بغور دیکھنے لگیں۔

وہ جنت سے ملنے کے بعد کچھ حد تک پرسکون تھا مگر آنکھوں میں ابھی بھی فکر اور غم ٹھہرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''اور تم نے کچھ نہیں کہا؟''

رک کر، اس نے نظر اٹھائی۔ اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ بچوں کا سا اشتیاق لیے اب اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جز بز ہوا۔ ان کا بیٹا سب خاموشی سے سنتا رہا ہوگا، ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا۔

اس نے پلیٹ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ پانی کی بوتل خالی کر کے سائڈ پر رکھ دی۔

''میں اس سے کہنا چاہتا تھا وہ مجھے معاف کر دے۔ میرے ساتھ واپس آ جائے مگر نہیں کہہ سکا۔'' سر اٹھا کر ایک بار پھر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیوں نہیں کہہ سکے؟'' پہاڑ جتنی اذیتیں برداشت کرنے والے کے لیے چند لفظ بھاری، چند لفظ مشکل پڑ گئے تھے؟

''صرف ایک لفظ سے تو سب ٹھیک نہیں ہو سکتا ممی۔ پانچ مہینوں کی اذیت ہے۔ پانچ منٹ میں تو ختم نہیں ہو سکتی۔''

آنکھیں اور تاثرات۔ ان کا دل ڈوبا۔

''وہ میرے کہنے پر کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اور زبردستی میں نہیں کرنا چاہتا۔'' سر جھکائے اب وہ قالین کے ریشوں پر داہنے ہاتھ کی انگلی سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ عمل غیر ارادی تھا۔ کانٹے کا نشان۔ منفی اور جمع..... پھر جمع سے منفی کا نشان۔

''کوشش بھی نہیں کی۔ اور رد ہو جانے پر یقین کرلیا؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

''میں نے اسے بہت دکھ دیے ہیں ممی۔'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے ترچھی ہو کر سورج کی کرنیں سیدھا اس کے بالوں پر پڑ رہی تھیں۔ ہیزل آنکھوں کا رنگ بھی عیاں۔ حزن بھی عیاں۔ درد بھی عیاں تھا۔

''تم مداوا بھی تو کرنا چاہتے ہو۔''

''مداوا سے پہلے اعتبار اہم ہے ممی! وہ مجھ پر اعتبار کبھی نہیں کرے گی۔''

منفی جمع کا کھیل اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ سر جھکائے گم صم بیٹھا تھا۔ پچھتاووں میں گھرا ہوا۔ وقت، نصیب اور قسمت کے اس انوکھے کھیل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوا۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتی تھی جس سے اس کا نکاح ہوتا۔ جنت کمال ہی کیوں؟ ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی ہی کیوں؟ اس کی بلاوجہ کی نفرت اور عداوتوں کا سامنا جنت کمال کے حصے میں ہی کیوں آیا؟ اس کی تکلیف بڑھ گئی۔ ندامت بڑھ گئی۔ درد بڑھ گیا۔

مسز شیرازی اب کسی گہری سوچ میں گم بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ بھی چپ تھا۔ کہنے کو جیسے مزید کچھ رہا ہی نہ تھا۔ راستے مسدود۔ دیواریں مضبوط اور حصار پھر سے قائم ہونے لگا تھا۔

''میں خود کو قصوروار سمجھتی ہوں! یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرے محسن ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی ہے، میں نے اس کے لیے یہ مشکل راستہ چنا۔''

فارس وجدان اذیتوں میں گھر گیا۔

تمہیں مجبور کیا۔ میں نے غلط کیا۔ میں صرف اتنا چاہتی تھی تم ماضی کو بھلا کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرو۔ بیوی آئے گی۔ بچے ہوں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن..... شاید میں غلط تھی۔ شاید میں غلط ہوں۔ ظلم تو پھر ظلم ہے۔ اور چونکہ فیصلہ میرا تھا تو میں خود کو بری الذمہ نہیں سمجھتی۔''

''ممی.....!'' اس نے بے بسی سے کہنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی فارس! بالکل بھی نہیں تھی۔''

وہ سر جھکا گیا۔ بیوی کے ساتھ ساتھ ماں کا دل بھی بری طرح سے دکھا چکا تھا۔

''عدیل احمد کو ایڈریس بھیج دو۔ میں تمہاری طرف آنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے اتنے اچانک سے کہا کہ وہ حیرت زدہ سا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی ماں یہ کیا کہہ رہی تھیں؟

''آپ..... یہاں آئیں گی؟''

''میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی بہو سے ملنا ہے۔ تمہارے اس کے مسئلے اپنی جگہ..... مگر گھر اس نے میری وجہ سے چھوڑا ہے۔ کہ آنٹی کو وہ باتیں پتا چل گئیں جو پتا نہیں چلنی چاہیے۔ جو میرا رشتہ ہے وہ کسی صورت ختم نہیں ہو سکتا۔'' اسے شدید حیرت میں مبتلا کر کے انہوں نے اقصیٰ کو آواز دی۔ بیٹھے بیٹھے ملازمہ کو کپڑوں کا آرڈر جاری کیا۔ ضروری سامان کی پیکنگ۔ کھانے کا انتظام۔ آن کی آن میں سب طے پایا جانے لگا۔

''موسم کیسا ہے؟'' یہاں وہاں سارے حکم نامے جاری کر کے انہوں نے فارس سے پوچھا۔

''بارش کی وجہ سے کچھ ٹھنڈا ہے۔'' اس کے لب ہلے۔ وہ شاک میں نہیں تھا مگر شاک میں ہی لگ رہا تھا۔

''آپ بائے ایئر۔''

''نہیں میں بائے کار ہی آنا چاہوں گی۔'' انہوں نے واضح کیا۔ ''راستے میں ہم اقصیٰ کے

گاؤں سے ہی ہوتے آئیں گے۔ کیوں ممی؟''

''جی جی بالکل!'' اقصیٰ کی خوشی سے بھرپور آواز۔ جنت آبی آنے والی تھیں اس کی خوشی الگ۔ ماں سے ملنے کی خوشی الگ۔ اور مسز شیرازی کے ساتھ اتنی بڑی گاڑی میں سفر کرنے کی الگ۔

''سفر لمبا ہے ممی!''

''ایسے سفر لمبے ہی ہوتے ہیں!''

اگلے کئی لمحے وہ خود پر خاموشی طاری کیے بیٹھا رہا

''ایک ریکوئسٹ ہے ممی!''

''بولو!'' وہ فارس کی آنکھوں میں دکھ، فکرمندی، کچھ کھو دینے کا خوف واضح طور پر دیکھ سکتی تھیں۔ جو وہ کہہ رہا تھا اسے سنتے ہوئے ایک بار پھر ان کا دل ڈوبا تھا۔

بات ختم ہوئی تو انہوں نے چند لمحے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

کال ڈسکنیکٹ ہوئی۔ چہرہ غائب ہوا۔ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے میز پر ہیڈ ڈاؤن کرلیا۔

دیوار گیر کھڑکیوں کے اس پار۔ آسمان پر روئی کے گالوں جیسے بادل۔ سورج کی کرنوں سے دہکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

☆☆☆

سنو تم لوٹ آؤ نا
کہ دل ہے درد سے بوجھل
سکوں ایک پل نہیں ملتا
کہیں بھی دل نہیں لگتا
سنو!! سنسان ہوں تم بن
بہت ویران ہوں تم بن
مجھے سانسیں نہیں آتیں
کہ میں بے جان ہوں تم بن
سنو! بکھرا ہوا ہوں میں
سہارا چاہتا ہوں اب
تمہارے لوٹ آنے کا
اشارہ چاہتا ہوں اب
بھنور میں ہوں بہت دن سے
کنارہ چاہتا ہوں اب
سنو! تم لوٹ آؤ نا
کہ مجھ پر ہجر طاری ہے
عجب بے اختیاری ہے
نہیں طلب کسی شے کی
طلب اک بس تمہاری ہے
سنو!
تم بن نہیں رہنا
دکھوں کو اب نہیں سہنا
یہ خالی ہاتھ ہیں میرے
تم ان میں پیار بھر دو نا
میری تکمیل تم سے ہے
مجھے تکمیل کر دو نا
سنو تم لوٹ آؤ نا
سنو تم لوٹ آؤ نا

☆☆☆

اقصیٰ نے بھاگم بھاگ گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ہینڈ بیگ اندر پھینکا۔

عدیل احمد اپنی جگہ ذرا محتاط سا کھڑا تھا۔ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

اتنا بڑا سیاہ چشمہ زرد، سبز اور سرخ رنگوں کے امتزاج کے اس کپڑوں والی کی ناک سے بار بار پھسلا جارہا تھا۔ تیاری سے لگ رہا تھا کہیں شادی پر انوائیٹڈ ہے مگر انداز خاصے تباہ کن تھے۔ نہ ہیل کی پروا تھی، نہ چوڑیوں کی، نہ اتنے لمبے ایئر رنگز کی۔ اور چٹیلے دوپٹے کی چمک اور ستارے مرکزی دروازے سے یہاں تک بکھرے نظر آرہے تھے۔ اتنا کچھ تو وہ گاڑی کی ڈگی میں رکھ چکی تھی اور ابھی بھی اس کا سامان ختم نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ مسز شیرازی نے کہا تھا انہیں تو بس دوسرے شہر تک ہی جانا ہے۔ چند گھنٹوں کے لیے۔ اور پھر واپسی..... بس اتنا ہی! باس کی طرف سے بھی یہی آرڈر ملا تھا۔

اور اس نے پتا نہیں کتنے رسالے، میگزین، کتابیں، ہینڈ بیگز اور جانے کیا کچھ اندر رکھ ڈالا تھا۔

''آپ کی تعریف؟'' رنگوں کی فیکٹری اب کے سامنے سے گزری تو اس سے رہا نہیں گیا۔

کوئی تیسری بار گاڑی کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی چند ایک تصویریں لینے کے بعد اقصیٰ سیدھی ہوئی اور ناک پر پھسلتی عینک کو ذرا نیچے کر کے اس نے موصوف کو سرتاپیر دیکھا۔ سوٹڈ بوٹڈ نوجوان۔ بال خاصے گھنگریالے تھے۔ ناک ذرا سی لمبی تھی۔ قد کاٹھ بھی مناسب تھا۔ فرنچ کٹ داڑھی میں بلا کا سوبر اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرتا وہ اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔

''مستقبل قریب کی ڈاکٹر اقصیٰ! اور جنت آپی کی حالیہ مینیجر!'' اترا کر اپنا تعارف کرایا۔ کہ اگر وہ فارس وجدان کا خاص ملازم ہو سکتا ہے تو اس کی پوزیشن بھی شیرازی خاندان میں کم نہیں۔

''آپ کو اتنا سامان گاڑی میں رکھنے کی اجازت کس نے دی ہے؟''

''کیوں یہ گاڑی آپ کی ہے۔'' بڑی بڑی گول شیشوں والی عینک کو واپس آنکھوں پر جما کر پوچھا۔ وہ لاجواب ہوا۔ ہیل پر ڈولتی ہوئی وہ ایک بار پھر کوارٹر کا رخ کر چکی تھی۔ عبدالغفور مالی دروازے میں کھڑا تھا۔ سر پر ہاتھ رکھے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ بھی اثبات میں۔ اور بھی نفی میں سر ہلانے لگتی تھی۔

اب کے واپس آئی تو ہاتھ میں شاپر تھا۔ عدیل احمد کے سامنے ایک بار پھر سر جھٹک کر اپنی عینک درست کی اور مسز شیرازی کو بلانے اندر چلی گئی۔

رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتا وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تھا۔

گاڑی سے دروازے تک جگہ جگہ بکھرے رنگوں کی سورج کی روشنی میں چمک تھی۔ اور بے تحاشا چمک تھی۔

☆☆☆

سہ پہر کا سورج غروب ہو رہا تھا، اندھیرے بڑھ رہے تھے، روشنیاں مٹ رہی تھیں۔ سفر واپس ہو کر بے نام تھی اور راستے آسان ہو کر مشکل ہو رہے تھے۔ دل اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

مسز شیرازی کی آمد کے متعلق جاننے کے بعد سے وہ اپنی جگہ سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ دوپٹے پر گرفت جمائے، نگاہیں جھکی ہوئی۔

آنسو ابھرتے، پلکوں پر جھلکتے، پھر ٹھہر جاتے۔ رونے پر قابو پائے وہ خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ایک ہی منظر۔ ایک ہی لمحہ۔ ایک ہی ساعت بار بار گزر رہی تھی۔

امی کا گھر..... مرکزی دروازے سے عین سامنے..... نیم اندھیرے میں کھڑی نفیسہ اس پر نظر پڑتے ہی برف کے مجسمے میں ڈھلتیں، ٹوٹتیں پھر بکھر گرفتا ہوئی نفیسہ۔ ان کی خاموش آواز، ان کی ساکت نگاہیں۔

''امی۔ امی میں نے کچھ نہیں کیا! امی!! امی!!''

''دور ہٹو جنت۔'' ایمان نے چیختے ہوئے اسے پرے دھکیلا تھا۔

پلکیں جھپکا کر اس نے آنکھوں کو مسل ڈالا۔ پھر نظروں کا زاویہ بدلا۔ دوبارہ بدلا۔ پہلے وہ دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ اب الماری پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ پھر اس نے رخ بدل کر دروازے پر نظریں ٹھہرا لی تھیں۔ زاویہ بدلنے سے نظر نہیں بدل رہا تھا۔ ماضی نہیں بدل رہا تھا۔ کیفیت نہیں بدل رہی تھی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' ایک جنت بیڈ پر بیٹھی تھی تو دوسری جنت اسے روتی سسکتی، تڑپتی اپنی صفائی میں بمشکل لفظ ادا کرتی نظر آ رہی تھی۔ تب تک، جب تک نفیسہ کی میت گھر نہیں آئی تھی۔ تب تک، جب تک زندگی کا احساس باقی رہا تھا۔ اور جب تک اپنوں کا اعتبار مکمل ختم نہیں ہوا تھا۔

وہ بار بار [illegible] رکھ رہی تھی۔ بار بار سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرا سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں خاموش تھیں۔ دل رو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں بوا آ گئی تھیں۔

''وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں!''

دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ سر جھکا رہا۔

''جنہ!۔''

قریب آ کر انہوں نے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو اس نے بمشکل سر اٹھایا۔

''میں کیسے۔'' اس کے لب ہلے۔

''وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں!''

''بوا۔ میں ان کا سامنا کیسے۔''

''میری طرف دیکھ۔'' چہرہ ہاتھوں میں لے کر انہوں نے کہا۔ ''حق پر ہے نا تو؟ تو پھر اتنا ڈر کا ہے کو؟؟ اٹھ شاباش۔'' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی۔

''پریشان نہیں ہو، تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ تو جو فیصلہ کرے گی میں تیرے ساتھ کھڑی رہوں گی۔'' انہوں نے ایک بار پھر یقین دہانی کروائی تھی۔

کمرے سے باہر، پھر سیڑھیاں اتر کر ڈرائنگ روم تک جاتے اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ قدم بھاری ہونے لگے۔

بچے کمرے میں تھے۔ اقصیٰ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ صندل آپا چہرے پر پریشانی لیے کچن کے سامنے کھڑی تھیں۔

دروازہ کھل گیا۔ بوا وہیں کھڑی رہیں۔ ''جا!''

ہمت کر کے وہ اندر داخل ہو گئی مگر دروازے میں ہی جھکے سر کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

سامنے ہی صوفے کے پاس وہیل چیئر پر مسز شیرازی بیٹھی تھیں۔ اس کی نظر ان کے قدموں تک گئی اور پھر وہیں ٹھہر گئی۔

باہر اندھیرے پھیل رہے تھے۔ کھڑکیاں تاریک ہو رہی تھیں۔ وقت متحرک تھا۔ وہ منجمد ہو چکی تھی۔

مسز شیرازی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ مگر کن نظروں سے دیکھ رہی تھیں اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ لب باہم پیوست کیے مجرموں کی طرح سر جھکائے بالکل خاموش کھڑی رہی۔

''تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا، وہ وعدہ پورا کیے بنا تم نے گھر کیسے چھوڑ دیا؟ مجھے کیسے چھوڑ دیا؟''

دوپٹے کے اندر انگلیاں باہم پیوست ہو گئیں۔ سر جھکا رہا۔ لب بھنچے رہے۔ اور آنسو گرنے لگے۔ اندر ہی اندر۔ دل پر۔ خاموشی صرف لبوں پر تھی تو آنکھوں میں بھی اتر گئی۔ نظریں قدموں سے ہٹ کر فرش پر جم گئیں۔

اس کے پیچھے۔ ادھ کھلے دروازے کے بے حد قریب۔ دیوار سے پشت لگائے فارس وجدان کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے، سر جھکا ہوا تھا۔ کچن میں کھانے کا انتظام دیکھتی صندل کی نظر بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھی۔

اس کی موجودگی سے قطعی بے خبر۔ وہ ہنوز اپنی جگہ۔ اپنے خول میں بند۔ صامت کھڑی تھی۔

''یہاں آؤ۔'' مسز شیرازی نے اب کے ہاتھ بڑھایا۔

مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ آنکھ کے کنارے پھر سے نم ہونے لگے۔

مسز شیرازی نے گہرا سانس لے کر ہاتھ نیچے کر لیا۔

''میں صرف ساس تو نہیں ہوں۔ دوست بھی تو ہوں۔ تم نے کہا تھا ماں جیسی لگتی ہوں۔ اور اگر واقعی میں ایسا ہی ہے۔ تو کیا یہ ماں اتنا بھی حق نہیں رکھتی کہ جان سکے۔ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

دھڑکن تھم گئی۔ سانس رک گیا۔ اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ گال پر آنسوؤں کی لکیر نمایاں ہوئی۔ مسز شیرازی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ انہیں.....

وہ رات..... ایک بار پھر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ فائزہ

بچی کی باتیں، ان کے الزام، ان کا غصہ۔ ان کی نفرت۔ اس رات وہ اسے برباد کرنے آئی تھیں۔ اور اسے لگا وہ واقعی میں اسے برباد کر گئی تھیں۔ انہوں نے یقین چھین لیا تھا۔ اعتبار کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اب تک وہ یہی سوچتی رہی تھی۔ اب تک اسے گمان سے بھڑتی رہی تھی۔

مگر جو عورت سامنے بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں نہ تو نفرت تھی۔ نہ حقارت، نہ بے اعتباری..... کیا ایسا بھی ممکن تھا؟

وہ خاموشی جو مہینوں سے طاری تھی۔ جو طلاق، قتل کا الزام، اور بھائی کی وفات کا گھیراؤ کرتی تھی۔ جو ہر دلیل، ہر تاویل۔ اور ہر وضاحت کو دفنا دیتی تھی۔ وہی طاقت ور خاموشی۔ روح سے دل، اور پھر دل سے زبان کو جکڑ کر رکھنے والی..... زنجیر نما خاموشی ٹوٹنے لگی۔

''کیا ہوا تھا؟'' وہ پوچھ رہی تھیں۔ سوال جتنا مختصر تھا، جواب اتنا ہی طویل۔ اتنا ہی تکلیف دہ۔۔

''میں نے ماہین کا بچہ ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔'' اس اس کے لب ہلے۔ آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ ''مجھے کام والی نے بلایا تو میں اس کے کمرے میں۔ اسے دیکھنے گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور۔ اور اس نے سب توڑ دیا۔ خود کو زخمی کر لیا۔ میں نے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ میں نے اسے زخمی نہیں کیا تھا۔'' وہ کپکپاتے ہوئے، روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جیکٹ کی جیبوں میں فارس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

''وہ کہتی تھی میں بانجھ ہوں۔ کبھی ماں نہیں بن سکتی اور مجھے..... مجھے برہان کی زندگی سے نکل جانا چاہیے۔ میں نہیں نکلی تو پھر اس نے۔'' سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ ''گھر پر، میرے نمبر پر۔ رانگ کالز آتی تھیں۔ انہیں میرا نام۔ میری ہر معلومات پتا ہوتی تھی۔ میں نے برہان کے علاوہ کبھی بھی۔ کسی سے رابطہ نہیں رکھا۔ کبھی بھی نہیں۔ لیکن برہان مجھ پر شک کرنے لگا۔'' وہ اذیت کے عالم میں سب بھی جا رہی تھی۔

''میں نے حسنین کی جان نہیں لی تھی۔ وہ سب۔ وہ غلطی سے۔'' آواز ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ لفظ بمشکل ادا ہو رہے تھے۔ ''آنٹی وہ میری گڑیا چھین رہا تھا۔ وہ..... وہ.....'' منظر جیسے آنکھوں میں تھا۔ سیڑھیاں سے پھسلتا۔ فرش پر ڈھیر ہوتا حسنین۔ اطراف میں پھیلتا سرخ خون۔ منظر آنکھوں میں تھا۔ وہ پنجوں کے بل فرش پر بیٹھی۔ ''سب کہتے ہیں میں بدبخت ہوں، بدنصیب ہوں، میری وجہ سے میرا بھائی مارا گیا۔ مگر میرا یقین کریں آنٹی۔ میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں مارا۔ وہ سب۔'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ گلا بیٹھ گیا۔ لیکن وہ بول رہی تھی اور مسز شیرازی اسے بولنے دے رہی تھیں۔ جو کچھ ذہن میں تھا، دل میں تھا، روح میں تھا، وہ لبوں پر آ گیا تھا۔ ان کہے لفظ چنگاریوں کی طرح دہکتے تھے، روح کو گھائل کرتے تھے۔ خاموش لفظوں کا عذاب۔ جسم و جاں پر کتنا بھاری تھا۔ کوئی جنت کمال سے پوچھتا۔

''وہ غلطی سے گر گیا تھا۔ آنٹی میں نے جان بوجھ کر نہیں۔''

وہیل چیئر دھکیل کر وہ آگے ہوئیں۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

''کوئی کچھ بھی کہے جو تمہاری حقیقت ہے وہ نہیں بدل سکتی۔ مجھے تمہارے ایک ایک لفظ پر پورا یقین ہے۔'' انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے۔

''میں تو اتنا جانتی ہوں میری بہو کسی بچے کی جان لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ کسی کو جاننے کے لیے پانچ ماہ کم نہیں ہیں۔ اللہ گواہ ہے میں نے تمہارے کردار میں کوئی جھول نہیں دیکھا۔ اور رہی بات تمہارے بھائی کی۔ تم صرف پانچ سال کی تھیں جنت۔ وہ صرف ایک حادثہ تھا۔''

چھ سال پہلے تک وہ یہ لفظ اپنے نانا سے سنتی رہی تھی۔ صرف وہی تھے جو اس کے ذہن میں ابھرتے ہر منفی خیال کی تردید کر دیا کرتے تھے، ان کی

پر ختم ہو جاتی تھی۔

اتنے عرصے بعد۔ مسز شیرازی سے سن کر۔ اس کا دل بھرا گیا۔ اسے تو لگتا تھا کوئی بھی اس پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ مگر مسز شیرازی۔

اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیے وہ اس کی آنکھوں میں بہت نرمی سے دیکھ رہی تھیں۔

''تم نے گھر کیوں چھوڑ دیا۔''

''میں ڈر گئی تھی آپ مجھ سے نفرت کریں گی۔ مجھے گھر سے نکال دیں گی۔'' وہ روتے ہوئے کہے جا رہی تھی۔ ''مجھے لگا آپ میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گی۔''

''میں زیادہ سے زیادہ کیا کرتی جنت؟ یہی سوال پوچھ لیتی! تم جواب دے دیتیں۔ بات ختم ہو جاتی!''

بات ختم ہو جاتی۔ آنسو آنکھوں میں ٹھہر گئے۔ سر اٹھا کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ یہ بات اس کے اپنوں نے کبھی ختم نہیں کی تھی۔ سگی ماں نے۔ سگی بہنوں نے، سگے رشتوں نے حتیٰ کے برہان نے فارس وجدان نے بھی نہیں۔

''میں..... میں بہت پریشان تھی۔ مجھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اچھا بس اب رو نہیں۔'' انہوں نے ٹیبل سے گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''لو شاباش پانی پی لو۔'' چند گھونٹ لے کر اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ اتنی محبت اور اتنے پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے مل جانے کی خوشی آنکھوں میں لیے۔ چہرے پر امید بھرے تاثرات لیے۔

اب وہ ان کے سامنے، بے حد قریب صوفے پر بیٹھی تھی۔ ہاتھ ابھی بھی ان کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔

ستائیس دن کا سفر تھا، بے گھر ہو جانے کی حقیقت تھی۔ ماضی تھا، اور مستقبل کا خوف الگ۔ ہر

''گھر کے بڑے کس لیے ہوتے ہیں جنت؟ جو آپ کا رشتہ طے کرتے ہیں، یا آپ کی شادی کرتے ہیں کیا وہ اتنا بھی حق نہیں رکھتے کہ آپ کے معاملات کو جان کر انہیں سلجھانے کی کوشش کر سکیں؟ آپ کی مدد کر سکیں؟ تم دونوں نے مجھ سے اپنی ہر بات چھپا کر بالکل اچھا نہیں کیا۔'' وہ صحیح معنوں میں اب خفا لگ رہی تھیں۔ وہ کچھ حیرت سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے ابھی تک فارس کے رویے سے متعلق تو کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ کیا انہیں شک تھا؟ یا وہ جان گئی تھیں؟ اگر ہاں تو کیسے جان گئی تھیں؟ کیا فارس نے؟ دل نے دلیل دی۔ ذہن نے فوراً تردید کر دی۔

''میں نے۔'' اس نے کچھ ہمت مجتمع کی۔ لفظ ترتیب دیئے۔ ''میں نے..... ایک اور بات بھی آپ سے چھپالی۔'' آواز ایک بار پھر بھرائی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے بتائے۔ وہ ان کی مزید ناراضی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

''تم نہ بھی بتاؤ تو کوئی بات نہیں۔'' وہ سمجھ رہی تھیں، یقیناً یہ بھی خاندان سے متعلق کوئی بات ہو گی۔

''بتانا ضروری ہے۔'' اب کے گال رگڑ کر صاف کیے۔

''اچھا بتاؤ۔'' اتنا تو وہ رو رہی تھی۔ وہ ذرا پریشان ہوئیں کہ پتا نہیں کیا بات ہے۔ ذرا بوجھ ہلکا ہو اس کا۔

''آپ..... آپ..... دادی بننے والی ہیں۔''

باہر دروازے کے پاس کھڑا فارس وجدان اپنی جگہ پتھر ہوا۔ بے حس۔ ساکت۔ منجمد!

ہاسپٹل کے کاریڈور میں اسٹریچر کے پہیوں کی حرکت، لکوری فلیٹ کے لاؤنج میں کافی ٹیبل پر رکھا سفید کاغذ۔ ڈریسنگ ٹیبل سے ایک جھٹکے سے سب بکھیرتے دودھیا ہاتھ۔ ان گنت سوال لیے، شک و

سوالیہ نشان ہوتی اس کی ذات۔ مبہم ہوتا اس کا نام۔ مسخ ہوتی اس کی پہچان۔

اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ سرخ آنکھوں میں کناروں تک نمی پھیل گئی۔ سامنے ہی برآمدے کے اس پار روشن کھڑکیاں دھندلا گئیں۔ جس دیوار سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ دیوار فنا ہوئی۔ وہ سہارا کھو کر پنجوں کے بل جھک گیا۔ اس کا سانس اب بھاری ہو رہا تھا۔ اس کی کیفیت اب عجیب سی ہو رہی تھی۔ چہرے پر پل بھر کے لیے شاک تھا، پھر خوش گوار سی حیرت اور پھر اس حیرت میں کرب گھل گیا تھا۔ ان کی آن میں سوئے ہوئے کئی غم۔ کئی درد۔ کئی تکلیفیں۔ کئی محرومیاں جاگ اٹھی تھیں۔

وہ ماضی کی زنجیروں میں ایک بار پھر جکڑا گیا تھا، زندگی کی ڈور ہاتھوں میں لیے، یقین کی وادیوں میں اترتے، منفی خیالات کی گرفت سے اپنے ذہن کو چھڑاتے وہ ایک بار پھر اپنے اندر بھٹک گیا تھا، اپنے آپ سے بچھڑ گیا تھا۔

''میرے اللہ! کیا واقعی؟ جنت آر یو رئیلی۔'' مسز شیرازی لمحے بھر کے لیے جیسے بے یقین ہوئی تھیں۔

سر ہلاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ابھر آئے۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے اسے خود سے لگایا۔ ''مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' اس کا ماتھا چوم کر اب وہ شکوہ کر رہی تھیں۔ وہ اتنا خوش تھیں۔ جیسے سارے غم، سارے درد مٹ گئے ہوں۔

''میں دادی بننے والی ہوں! میرے اللہ! شکر الحمدللہ۔'' شال کے پلو سے آنسو صاف کیے۔ ایک بار پھر سر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ ایک بار پھر رونے کو تیار بیٹھی تھی۔

''اب کیا ہوا؟'' انہوں نے اتنے پیار سے دونوں ہاتھ تھام کر پوچھا تو ضبط ختم ہو گیا۔

''مجھے فارس کے ساتھ نہیں رہنا! مجھے طلاق

بوجھ لیے فارس اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

''وہ جہاں شادی کرنا چاہتا ہے آپ اس کی وہیں کر دیں۔''

''جنت بیٹا!''

''میں اس کے ساتھ اب کبھی نہیں رہوں گی آنٹی! کبھی نہیں۔'' فیصلہ حتمی تھا۔ ردوبدل کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' انہوں نے مسکراہٹ دبا کر اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔ ''تم دونوں کے اختلاف اپنی جگہ۔ لیکن کیا تمہارا نہیں خیال جب تک ڈلیوری نہیں ہو جاتی، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیے؟''

''آنٹی! وہ فارس.....''

''کیا یہ مناسب نہیں رہے گا کہ تم اپنے بچے سے پوچھو اس کی ممی کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟''

جنت نے چونک کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے ہنس دیں۔

''کافی عرصے بعد ہمارے گھر میں خوشی آئی ہے جنت۔ میں اپنی بہو کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم یہاں رہو گی تو مجھے فکر ہوتی رہے گی۔ اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ نئے فیملی ممبر کو آنے دو۔ پھر جیسا تم چاہو گی۔ ویسا ہی ہو گا!۔ جو فیصلہ تم کرو گی میں تمہیں مکمل سپورٹ کروں گی۔ ابھی گھر چلو۔ میری خاطر!؟''

اسے ایک بار پھر رونا آیا۔

''اب نہیں رونا۔'' پیار سے کہا تو آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مسز شیرازی اسے خود سے لگائے کہہ رہی تھیں۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

''ہاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''چلو شاباش اپنی تیاری کرو۔'' انہوں نے کہا۔

دروازہ کھول کر وہ باہر آئی اور اس کی موجودگی سے قطعی بے خبر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

کپڑے بدل کر بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا بنائے وہ دوپٹے کے ساتھ شال اوڑھ کر نیچے آئی تو پہلی نظر ہی فارس وجدان پر پڑی۔

وہ نیم تاریکی میں دروازے میں کھڑا نظر آرہا تھا۔ لمحے بھر کے لیے نظر ملی۔ دل جانے کیوں عجیب لے پر دھڑکا۔ مسز شیرازی نے یقیناً اب تک اسے بتا دیا ہوگا۔ جانے اس کے تاثرات کیسے رہے ہوں گے۔ جانے اس نے کیا کہا ہوگا!؟ رخ بدل کر وہ برآمدے کی طرف چلی گئی۔ اقصیٰ باقاعدہ چیخ کر اس سے لپٹ گئی۔

''جنت آپی! آپ کو نہیں پتا میں نے آپ کو کتنا یاد کیا۔''

علی کی گھوریاں اقصیٰ کے لیے ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ صندل آپا سے ملی۔ پھر بچیوں سے جو اس کا جانے کا سن کر ہی اداس ہوگئی تھیں۔ علی کے تاثرات عجیب سے تھے۔ جیسے ابھی رو پڑے گا۔ اور صابرہ بوا۔

وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اسے خود سے لپٹائے جانے کتنی ہی دیر تک دعائیں دیتی رہیں۔

''تیری ساس بہت اچھی عورت ہے! بہت نیک اور بڑے ظرف والی۔ مجھے زبان دی ہے۔ بیٹی بنا کر لے جارہی ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''رابطے میں رہنا، اپنا بہت خیال رکھنا۔'' نم آنکھوں کے ساتھ اس نے سر ہلایا۔

''آپ اسلام آباد کب تک آئیں گی؟''

بعد ہی سلیم کے پاس جا سکوں گی۔ لیکن تو فکر نہ کر۔ جلد ملنے آؤں گی۔''

سب اسے چھوڑنے دروازے تک آئے۔ مسز شیرازی کو فارس پہلے ہی گاڑی میں بٹھا آیا تھا۔ اب اس کے انتظار میں وہیں کھڑا تھا۔ اقصیٰ عجلت میں قدم اٹھاتی اس سے پہلے ہی نکل گئی تھی۔ گلی کا راستہ بارش کی وجہ سے کافی خراب تھا۔

وہ باہر نکلی اور دیوار کے ساتھ اسے مکمل نظر انداز کیے گاڑیوں کی طرف بڑھ گئی۔

فارس نے قدم اٹھائے اور پھر رک کر مڑا۔ صابرہ بوا اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''آپ نے جو کچھ کیا۔ اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔ میری طرف سے جنت کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''اللہ خوش رکھے تم دونوں کو۔'' انہوں نے دل سے دعا دی۔ وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

جنت آہستگی سے قدم اٹھا رہی تھی۔ اندھیرے میں گاڑی کی روشنیاں بکھری تھیں۔ سفید گاڑی فارس کی تھی۔ اتنا تو جنت کو پتا تھا۔ دوسری گاڑی میں ڈرائیور تھا۔ عدیل احمد جو باہر کھڑا تھا۔ عقبی نشست پر مسز شیرازی براجمان تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دروازہ کھول کر جھٹ سے اقصیٰ بیٹھی۔ دروازہ بند کرتے، لاک لگا کر شیشہ نیچے کیا۔ جنت کے قریب پہنچنے تک سرگوشی میں کچھ نہ کچھ طے پا گیا تھا۔

''تم فارس کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ جنت! ہماری گاڑی میں تو بہت کم جگہ ہے۔'' مسز شیرازی نے کہا۔

''ہاں ہاں ہماری گاڑی میں تو بالکل بھی جگہ نہیں ہے۔'' اقصیٰ مزید پھیل گئی۔ ''ہم خود اتنی مشکل سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیوں مسٹر عدیل؟'' لگے ہاتھوں عدیل احمد سے بھی مشورہ لیا۔ اس بونگے کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی بڑی گاڑی میں جنت کمال کی جگہ کیوں نہیں ہو سکتی تھی، لیکن جب اقصیٰ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی ایک ہزار اشارے دیے تو.....

آپ اس طرف آ جائیں۔'' ساتھ ہی ادب سے ہاتھ دراز کر کے فارس کی گاڑی کا راستہ دکھایا۔

کی لاک سے گاڑی کا لاک کھولتا فارس وجدان اس سچویشن سے قطعی لاعلم رک کر انہیں دیکھنے لگا کہ ہو کیا رہا ہے۔ جنت ابھی تک باہر کیوں کھڑی ہے؟

''آنٹی۔'' اس نے روہانسی ہو کر مسز شیرازی کو دیکھا۔

''جاؤ بیٹا۔'' انہوں نے پیار سے اصرار کیا۔

''چند گھنٹوں کا تو سفر ہے۔''

فارس وہیں آ گیا۔ ''اپنی پرابلم؟'' وہ عدیل احمد سے پوچھ رہا تھا۔ اقصیٰ کی باچھیں کھل گئیں۔

''یہاں تو پرابلم ہی پرابلم تھے۔'' فارس نے اسے گھوری دی تو سٹپٹا کر سر جھکا گئی۔

اس سے پہلے کہ مسز شیرازی فارس سے کہتیں کہ وہ جنت کو اپنے ساتھ لے جائے، جنت خود ہی قدم اٹھاتی رینج روور کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کر پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی دھڑام سے بند کیا۔ سینے پر بازو باندھے چہرے کا رخ خفگی سے شیشے کی طرف موڑ لیا۔ فارس کی کوئی بھی بات۔ اس نے کبھی نہیں ماننی تھی۔ ابھی بھی یہ تاثر قائم کرنا تھا وہ مسز شیرازی کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھی ہے۔ اس کے کہنے پر یا اس کی وجہ سے تو بالکل بھی نہیں۔

اور اس تمام صورت حال کو سمجھتے ہی فارس کے لبوں پر ادا سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''تھینکس ممی۔'' مسز شیرازی کی طرف کا دروازہ کھول کر وہ اندر کو جھکا۔

''سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ تم بھی کچھ کرو۔'' انہوں نے دبی آواز میں ذرا سا جھاڑ دیا۔

''ایکسکیوز کرو اس سے، معافی مانگو، بات کرو۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تم دونوں کی لڑائیوں کا اثر میرے گرینڈ چائلڈ پر پڑے!''

انداز میں محبت بھری خفگی تھی۔ اصرار تھا، تنبیہ تھی اس نے کس قدر کوشش سے اثبات میں سر ہلایا۔

لائی تھی فارس! اب تم خود لاؤ گے۔'' انہوں نے ہاتھ دبا کر کہا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر بوسہ لیا، ایک بار پھر انہیں ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ پھر دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گیا۔

اقصیٰ جو اس تمام عرصے میں فارس کی دہشت سے کھڑکی کی طرف مؤدب ہو کر بت بنی بیٹھی تھی اس کے جاتے ہی سکھ بھری سانس لی، جھٹ سے اپنا تھیلے نما کالج بیگ سے نمکو پیکٹ نکالا۔

عدیل احمد نے اس کی طرف کے شیشے پر دستک دی۔ اس نے کچھ چونک کر سر اٹھایا پھر شیشہ نیچے کیا۔

''آپ کے پاس آئینہ ہے؟؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہاں ہے..... تو؟'' اترائی۔

''دیکھ لیجیے۔''

وہ کہہ کر سیٹ پر براجمان ہوا۔ اقصیٰ نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا پھر بیگ کھنگال کر آئینہ نکالا۔ گاڑی میں زرکار مدھم روشنی تھی۔ پھر بھی موبائل نکال فلیش لائٹ آن کر کے اپنی شکل دیکھی۔

کاجل دونوں آنکھوں کے گرد اچھا خاصا پھیلا ہوا تھا۔ نیلا شیڈ بھنوؤں کے نیچے۔ اطراف میں۔ ہر طرف۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے باقاعدہ دو گھونسے آنکھوں پر جڑ دیے ہوں۔

ایک لمبی سی چیخ اس کے حلق سے نکلتے نکلتے دم توڑ گئی۔

کسی نے اسے بتایا کیوں نہیں؟ ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس عرصے میں سب اس کی یہی شکل دیکھتے رہے تھے؟ شرم سے پانی پانی ہونے لگی۔

جھٹ سے ٹشو نکالا اور رونے پر قابو پاتے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔ میک اپ، کاجل، مسکارا اور لائنر لگا کر تو وہ بھول گئی تھی اور صابرہ خاتون کے گھر داخل ہوتے ہی چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے دے مارے تھے۔ تو بچے اس لیے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے؟ مارے خفت کے آنکھیں میچ لیں۔

سیٹ پر براجمان عدیل احمد بیک ویو مرر سے اس

کے تاثرات ملاحظہ کرتا اپنی ہنسی حد تک دبا چکا تھا۔

☆☆☆

دروازے لاک ہو چکے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ تھی تقریباً۔ مگر ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی۔ اندر باہر سناٹا سا چھایا تھا۔ ایک مکمل خاموشی دونوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

وہ فکروں میں گھری شیشے کا رخ کیے بیٹھی تھی۔ ناخن انگلی تلے دبائے۔ شال کے اندر تھی سختی سے بند کیے۔

"کیا حال ہے؟" برابر میں بیٹھے فارس وجدان نے خاموشی توڑی۔

"مجھ سے کوئی بات مت کرو۔"

"یہ سوال میں نے۔ کسی اور سے بھی پوچھا ہے۔"

جنت کا چہرہ سرخ پڑا۔ "ہم سے کوئی بات مت کرو۔"

اور جس استحقاق سے اس نے "ہم" کہا، وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اپنی قسمت، اپنا نصیب اسے آج سے پہلے کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"لیکن میں کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

عدیل احمد کی گاڑی برابر سے گزر کر آگے ہوئی تو اس نے اسٹیرنگ وہیل پر گرفت جمائے ایک بار پھر رخ موڑ کر جنت کو دیکھا۔ سینے پر بازو باندھے وہ کھڑکی کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی۔ چہرہ اوجھل تھا۔ خفا آنکھیں باہر کہیں تاریکیوں سے الجھ رہی تھیں۔

"تم نے مجھ سے پوچھا نہیں وہ سرپرائز کیا تھا جو میں کراچی سے واپسی پر تمہیں دینا چاہتا تھا؟" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ جب وہ سرپرائز خود چل کر میرے سامنے آ گئی تھی۔" جل کر جواب دیتے ہوئے اب کے اس نے اپنا رخ فارس کی طرف موڑا۔ "ہائے دادے مسٹر شیرازی! میں صرف آنٹی کی وجہ سے گھر جا رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ جو میری ڈیل ہوئی تھی وہ ابھی بھی قائم ہے۔ میں نے تو آنٹی سے کہہ دیا ہے، بھلے سے تمہاری دوسری شادی ہو، تیسری شادی ہو، چوتھی شادی ہو۔ آئی ریئلی ڈونٹ کیئر!!! مجھے صرف اپنی طلاق سے غرض ہے!"

خاموشی سے اس کی پوری بات سن لینے کے بعد وہ تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر چکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا پرسکون رویہ جنت کو اندر تک سلگا گیا۔

"اور گاڑی میں بھی اس لیے بیٹھی ہوں کیونکہ انہوں نے مجھ سے کہا۔ اس لیے نہیں کہ میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ تمہارا تو مجھے پتا ہے۔ تم تو یہی سوچو گے۔ تمہاری ساری پلاننگز کا بیڑہ غرق جو ہو چکا ہے۔" وہ شروع ہو چکی تھی۔

"کچھ لو گی؟" فارس نے عقبی نشست کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ پیچھے کھانے کے پیک کیے لوازمات رکھے تھے جو مسز شیرازی گھر سے لائی تھیں۔ اپنی بات قطع ہو جانے پر اس نے سرد نظروں سے اسے دیکھا پھر غصے سے رخ موڑ گئی۔

"ڈونٹ ٹاک ٹو می۔"

وہ دکھ سے مسکرایا۔ جانتا تھا بات کرنا چاہے گا تو وہ الجھ پڑے گی، یا کانوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگ جائے گی۔ اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ ان آنکھوں نے بہت رولیا تھا۔ اب اور نہیں۔

ان کے مابین ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ جنت نشست کے ساتھ پشت ٹکائے ایزی ہو کر سامنے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی مین روڈ پر سرعت پکڑے ہوئے تھی۔ آس پاس اندھیرے میں روشنیاں بکھیرتی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ ہر تھوڑی دیر بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے تسلی کر لیتا تھا۔ حقیقت کو خواب ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ اس کا خوف، اس کا خدشہ، اس کی تمام تر اذیتیں اپنی جگہ قائم تھیں۔ شیشے کے ساتھ پیشانی ٹکائے۔ کسی گہری سوچ۔ کسی گہرے خیال میں گم جنت نے آنکھیں موند لی تھیں۔ زندگی نے ایک بار پھر راستوں کا تعین کر لیا تھا۔ منزل ابھی بھی دھندلی تھی۔ بے نام اور غیر واضح سی تھی۔ انجام ابھی بھی نہیں بدلا تھا۔ فرق

حالات پر پڑا تھا۔ نفسیات پر بھی۔ اعصاب پر بھی۔

اس کے کندھے کسی بوجھ سے جھکے نہیں جا رہے تھے۔ دل سے جیسے کوئی ثقیل شے ہٹ گئی تھی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ ماضی ہنوز جڑا ہوا تھا مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس کی تکلیف اسے اپنے حال کا احاطہ کرتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہ خوشی چند لمحوں کی ہی سہی۔ یہ سکون کچھ پل کا ہی سہی۔ لیکن ملا تو سہی۔ وہ مسز شیرازی کو ایک بار پھر سوچنے لگی تھی۔

غموں کے بادل پوری طرح سے نہیں چھٹے تھے مگر اسے آسمان ابھی سے۔ بہت اجلا۔ بہت نیلا نظر آنے لگا تھا۔ وہ کچھ ادھورے خوابوں کو آنکھوں میں سجائے آنے والے کل کو سوچ رہی تھی۔ ادھوری تصویر کا ایک حصہ مکمل ہونے والا تھا۔

پرسکون خاموشی میں اس کی آنکھیں آہستگی سے بند ہونے لگیں۔ سختی سے بند انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ شال کا ایک سرا کندھے سے سرک کر پہلو میں آن گرا۔ باہر ہلکی ہلکی سی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

فارس کے ساتھ واپسی کا ہر سفر ایسے ہی بادلوں سے اور بارشوں سے گھرا رہتا تھا۔ اور کیے علم تھا۔ واپسی کے اس سفر میں وہ دو نہیں تین ہوں گے؟ وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ اور فارس وجدان اپنی نگاہیں روڈ پر جمائے یکسوئی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

☆☆☆

جانے کتنا وقت بیتا تھا لیکن اسے یقین تھا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا یا اس سے بھی کم۔

بارش تھم چکی تھی۔ ونڈ اسکرین پر کہیں کہیں قطرے نظر آ رہے تھے۔ اس کی طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔ متلی کا احساس شدید ہونے لگا۔ پہلے پہل تو آنکھیں موندے بیٹھی رہی کہ ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر جب ابکائی کا احساس ہوا تو اس نے بے ساختہ فارس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''گاڑی روکو فارس!''

''کیا ہوا؟'' گاڑی کی رفتار یکایک سست پڑی اور اگلے ہی لمحے سڑک سے ذرا نیچے ہو کر رک گئی۔

وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلی۔ اندھیرے میں سڑک کنارے گھاس اور اونچے لمبے درختوں کے سامنے وہ پنجوں کے بل جھک گئی تھی۔ پانی کی بوتل اٹھائے فارس اس کے پیچھے باہر آ گیا۔

کھانستے ہوئے قے کرتی وہ اذیت میں لگی۔ وہ کچھ فکرمندی سے پیچھے کھڑا رہا۔

وہ اٹھ کر سیدھی ہوئی تو اس نے پانی کی بوتل بڑھائی۔ اس نے بوتل لے کر منہ ہاتھ دھویا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ سانس بھاری تھا۔

ہمت کر کے قدم اٹھانے لگی تو فارس نے ہاتھ آگے کیا۔ جو کہ بغیر کسی تردد کے اس نے تھام لیا۔ شاید اسے ڈر تھا وہ گر نہ جائے۔ کپکپاتا ہوا سرد ہاتھ فارس کے ہاتھ میں دیے وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھی۔

''آر یو آل رائٹ؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

بھاری سانسوں کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وجود پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔

وہ اپنی سیٹ سنبھالے اب اس کی طرف پوری طرح سے متوجہ تھا۔ آنکھوں میں فکر تھی۔ موبائل ہولڈر میں ایستادہ اس کے موبائل کی اسکرین یکایک روشن ہوئی تھی۔ اے۔ آر کے نام سے کال آ رہی تھی۔ چند ایک میسجز کا نوٹیفکیشن بھی۔ فارس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ پیچھے کہیں دور۔ اور بہت دور کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تاریک ہو گئی تھیں۔

اب کی بار اس نے اجازت نہیں چاہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر عقبی نشست سے ڈنر باکس کھولا۔

''پلاؤ، قیمہ مٹر، فرائیڈ چکن۔ میٹھے میں کھیر ہے، فروٹ ٹرائفل بھی۔'' اس نے کھانے گنوائے کہ شاید اب وہ کچھ کھا لے۔

''تم گھر سے اتنا کچھ لائے ہو۔'' ذرا حیران ہو کر اس کی طرف مڑی۔ نیند سے بھری ہوئی بے آرام آنکھیں۔ بے تحاشہ رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''ممی لائی ہیں۔''

''ہاں وہی لا سکتی ہیں۔ تم سے مجھے ایسی کوئی

فارس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

وہ جو کچھ دیر پہلے تک اس کے آفر کرنے پر بھی انکار میں سر ہلائے ناراضی کی دیوار قائم کیے بیٹھی تھی تو اب خود اٹھ کر پیچھے چلی گئی تھی۔

دروازہ بند ہوا تو فارس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

گاڑی کی زرکار ڈوم لائٹس آن کیے اب وہ باکس وغیرہ دیکھ رہی تھی۔ بوا کے گھر سے آتے وقت ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی۔

اپنے لیے پلیٹ میں پلاؤ نکالا۔ ساتھ ہی چکن کا لیگ پیس رکھا۔ گاڑی اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو سے بھر گئی۔

''لاؤ یہ میں کھول دیتا ہوں۔'' رائتے کا ننھا سا باکس اس سے نہیں کھل رہا تھا۔

''کھول لوں گی میں خود ہی۔'' اس نے کہا مگر یاد آیا اگر ایک خراش برداشت نہ کرنے والے کی گاڑی کے اندر رائتے کا کوئی ایک قطرہ بھی گرا تو وہ کتنا ہنگامہ کرے گا؟ کیونکہ جس طرح سے وہ کھولنا چاہ رہی تھی۔ تو یہی ہونا تھا۔

نمیز سے باکس اسے دیا۔ جسے کھول کر اس نے واپس کر دیا۔

''ایک پلیٹ میرے لیے بھی۔'' پلاؤ کا تیسرا چمچ منہ تک لے جاتے اس نے رک کر فارس کو دیکھا۔ ناگواری سے بھنویں سکیڑ کر اپنی پلیٹ ایک طرف رکھی۔

دوسری پلیٹ میں پلاؤ نکالا۔ ساتھ ہی لیگ پیس، رائتہ، سلاد وغیرہ ڈال کر فارغ ہوئی تو پتا چلا وہ کب کا اس کی پلیٹ اٹھائے کھانا شروع بھی کر چکا تھا۔

''تم.....'' لب بھینچ کر اسے کچھ سخت سست کہنا چاہا مگر رک گئی۔ سمجھتا کیا تھا یہ خود کو؟

''پانی چاہیے؟'' فارس نے اپنی بوتل سے آدھا پانی پی کر بقیہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے گھورتی ہوئی اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔ ''تمہارا بجا ہوا نہیں چاہیے!''

''اوکے۔ ویسے بھی یہ آخری ہے۔'' اس نے ''ادھر دو مجھے۔'' غصے سے جھڑک کر بوتل کھینچی۔ مرچیں بھی تو لگ رہی تھیں۔ شاید راستے میں زیادہ تھیں۔

مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے وہ رخ بدل گیا۔

عقبی نشست پر آلتی پالتی مارے اب وہ کھانا کھا رہی تھی۔ بہت آرام اور تسلی سے۔ چہرہ کرب سے عاری۔ آنکھیں درد سے خالی۔ لاپرواہ سا انداز۔ جیسے گاڑی میں اس کے ساتھ اور کوئی تھا ہی نہیں۔ اپنے آپ میں مگن۔ اپنے رزق سے انصاف کرتی۔ بیک ویو مرر اس پر ایڈجسٹ کیے وہ اس پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہ گیا تھا۔

پندرہ سال پہلے اپنی ساری خفگیاں ناراضگیاں بھلائے وہ اسے بہت خوش اخلاقی سے ویلکم کیا کرتی تھی۔ کیا وہ آج بھی ایسا کر پائے گی؟؟

نہیں!! تبسم مٹ گیا۔

شاید نہیں! حزن ٹھہر گیا۔

اور درد بڑھ گیا۔

☆☆☆

اوصاف منزل میں کام کرتے یہ اس کا دوسرا مہینہ تھا۔ اور اس مختصر عرصے میں اس گھر کا نقشہ کس حد تک بدل چکا تھا۔ مزدور مستری آج بھی کام پر لگے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر سامنے والے دو کمروں کو روغن کیا جا رہا تھا۔ اوپر والا پورشن نیا تعمیر ہوا تھا۔ اب دروازوں اور کھڑکیوں کا کام باقی رہ گیا تھا۔ پلاٹ کی قسطیں ادا ہو چکی تھیں۔ اسٹور کھل گیا تھا، گاڑی خرید لی گئی تھی۔ فرنیچر نیا ہو چکا تھا، صوفے بدل چکے تھے۔ ہر کمرے میں مہنگے نفیس ٹائلز بھی لگوائے جا رہے تھے۔ مہینے کے آخر تک طارق صاحب کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔

وہ اس گھر کی ملازمہ تھی تو جہیز کی تیاری خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ثمرین نے اپنے لیے مہنگا ترین فرنیچر پسند کیا تھا۔

روز شاپنگ کے لیے بازاروں کے چکر لگتے

تھے۔ مہنگے مہنگے برانڈڈ کپڑے، جیولری، میک اپ وغیرہ خریدے جاتے تھے۔

برآمدے سے آگے شیشے لگی دیواروں کے آس پاس نفیس صوفوں پر بیٹھ کر، کپڑے پھیلا پھیلا کر جائزہ لیا جاتا تھا، پسند ناپسند کو جانچا جاتا۔

آئے روز مہمانوں کی آمد و رفت۔ اور وہ سارا سارا دن میں کھانا پکانے اور صفائی میں ہلکان ہوئی رہتی۔ مجال ہے جو گھر کا کوئی ایک فرد بھی اسے سانس بحال کرنے دیتا ہو۔ ذرا دیر کو جو کہیں آرام کی غرض سے بیٹھتی تو ڈانٹ پھٹکار شروع ہو جاتی۔ وہ اس کی ماں کو اس کے کام کی اچھی خاصی تنخواہ دے رہے تھے۔ دو مہینے تو اس نے جیسے تیسے گزار لیے تھے مگر اس کی اماں چاہتی تھیں وہ سال ڈیڑھ سال تک یہیں رہے تاکہ باپ کا اچھے سے علاج بھی ہو جائے اور جو قرض انہوں نے لے رکھا ہے وہ بھی اتر جائے۔ ان کی دوست کے توسط سے یہ کام اسے ملا تھا مگر گھر کے مکین اسے انسان کم۔ کام والی مشین زیادہ سمجھتے تھے۔ اوپر سے سال بھر کے بچے کی ذمہ داری بھی اسے سونپ رکھی تھی۔ جو گھر سے منسلک الگ تھلگ اسٹور روم نما کمرے میں اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

اور ہمیشہ کی طرح کچن میں۔ انتہا کی گرمی برداشت کرتے۔ گھر آئے مہمانوں کے لیے مینگو شیک بناتے وہ بھول چکی تھی بجلی پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے غائب ہے اور بچہ کمرے میں اکیلا ہے۔

گھر کے مکینوں کے پاس تو انتظام تھا مگر اس کا اسٹور نما کمرہ اس آسائش سے مکمل محروم تھا۔

وہ عجلت میں ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں گئی۔ سب کو جوس سرو کیا۔ اور اس سے قبل کہ پھر سے کوئی حکم نامہ جاری ہوتا وہ عجلت میں قدم اٹھاتی کچن کے عقبی دروازے سے اپنے اسٹور روم نما کمرے میں آ گئی۔

پسینے سے شرابور، گرمی سے نڈھال بچہ رو رو کر ہلکان ہو چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہاتھ اٹھائے اس کی طرف لپکنے لگا۔ روبی کے دل کو کچھ ہوا۔ اسے بازوؤں میں بھرے کچن میں لے آئی۔

''معاف کر دو یار!! میں تو بھول ہی گئی۔''

گلاس میں ٹھنڈا پانی ڈال کر اس کے لبوں سے لگایا تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ ٹھنڈے گلاس پر جمائے یوں پانی پینے لگا جیسے صدیوں کا پیاسا ہو۔

بال ماتھے سے چپکے ہوئے تھے۔ چہرہ، ناک آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

وہ اتنا پیارا تھا کہ دل چاہتا دیکھتے جاؤ۔ مگر اس پیارے سے بچے کی قسمت کتنی خراب تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ ماں اسے بھائیوں کے در پر چھوڑ کر گئی تو پھر پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔

رشیداں سے اس نے سنا تھا۔ وہ صرف اپنی ماں کی فوتگی پر آئی تھی اور اس کے بعد اس نے بھولے سے بھی اس گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

''یہ اتنی وڈی گاڑی میں بیٹھ کے آئی تھی۔ تدفین کے بس کچھ دیر بعد ہی نکل گئی۔''

وہ کاؤنٹر ٹیبل کے پاس اسے لیے کھڑی تھی۔

ثمرین اپنے کمرے کی صفائی کا حکم دینے آئی تو بچے کو اس کے ہمراہ کچن میں دیکھ کر سیخ پا ہو گئی۔

''کتنی بار کہا ہے اسے گھر میں مت لایا کرو۔''

''بی بی جی! بجلی کب کی گئی ہوئی ہے تو کمرے میں بڑی گرمی ہے۔''

وہ ناگواری سے ایک نظر بچے کو دیکھتی اسے اپنے کمرے کی صفائی کا آرڈر دے کے چلی گئی۔ وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے ثمرین کے کمرے میں آ گئی بچے کو ایک جگہ پر بٹھایا۔ ''اب یہاں سے مت ہلیو۔ میرے کو کام کرنے دو۔'' بچے نے اسے معصوم آنکھوں سے دیکھا۔ اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ٹوٹی ہوئی کھلونا کار جو اس کی گود میں رکھی تھی۔ اسے جھنجھوڑتا۔ ہلاتا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت خاموش اور بہت پرسکون تھا۔

اوصاف منزل میں جب وہ نئی نئی آئی تھی اور اس کے لیے مکمل انجان تھی تو تب بھی جب اس نے اٹھایا تھا تو وہ بہت آرام سے اپنے بازو خود سے اٹھائے اس کی گود میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو سوتے میں بھی بالکل تنگ نہیں کرتا تھا۔ اکثر رات میں آنکھ

اور اس کے دوپٹے کا سرا منہ میں۔

"بڑا امیر چچا ہے بچے کا۔ مہینے کے مہینے پیسے بھیجتا ہے۔" رشیداں نے یہ بھی بتایا تھا۔ "لاکھ تو دیتا ہوگا وہ تیرے طارق صاحب کو۔"

وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ سگا چچا بچے کو اپنے پاس بھی تو رکھ سکتا تھا۔

"یہاں آتا ہے کیا وہ؟"

"ارے نہیں۔ کبھی نہیں آیا۔ تجھ سے پہلے جو سلیمہ مائی تھی۔ اس نے بتایا تھا۔ بینک میں پیسے بھیجتا ہے۔ ڈھیر سارے ہوتے ہیں۔ تو نے دیکھا نہیں کیسے امیر ہو گئے یہ سب۔ پلاٹ بھی لیا ہے۔ کہہ رہے ہیں ثمرین کی شادی وڈے شادی ہال میں کریں گے۔"

بیڈ شیٹ بدلتے، کتابیں سمیٹ کر ریک میں رکھتے اور پھر کپڑے سے فرنیچر، ڈریسنگ ٹیبل اور آئینہ رگڑ کر صاف کرتے وہ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی کر لیتی تھی۔

سرمئی نیکر اور ملگجی رنگ کی پرانی شرٹ میں وہ بچہ وہیں بیٹھا تھا جہاں وہ اسے بٹھا کر آئی تھی۔

کبھی اسے لگتا وہ اس کی بولی سمجھتا ہے۔ اس کا کہا مانتا ہے۔ بھلا اتنے چھوٹے سے بچے میں اتنی سمجھ کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ کسی عام سی روبی کی بات مانے؟ جس کی سگی ماں اسے یہاں کام پہ لگائے گھر کے خرچے پورے کر رہی تھی؟

وہ سونے سے پہلے پتا نہیں کتنی باتیں اس سے کرتی جاتی۔ گال چھو کر ٹھوڑی ہلا کر ہنساتی تو وہ ہنس پڑتا۔ نیچے کے دو کھانے کے ننھے موتی جیسے دانت نمایاں ہوتے۔ وہ اسے سارا سارا دن اسی کمرے میں چھوڑ کر گھر بھر کے کام نمٹاتی رہتی اور بھاگم بھاگ اسے بھی دیکھنے آجاتی۔

کبھی وہ رو رو کر نڈھال ہو چکا ہوتا اور کبھی اس کی دی گئی اشیا سے کھیلتا مکمل پرسکون۔

چیزوں کو پکڑ کر اٹھ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم بھی اٹھا لیتا۔ کمرے میں نقصان دہ کوئی شے نہ تھی۔ صرف ایک چارپائی اور بند مسل الماری۔ بوسیدہ سا قالین۔ اور بس..... اس لیے اسے مکمل اطمینان رہتا کہ وہ ٹھیک ہوگا۔

پنکھا چلائے وہ صفائی میں مگن تھی۔

بڑی بی بی نے کمرے میں اسے اور بچے کو دیکھا تو سیخ پا ہو گئیں۔ اچھی خاصی جھاڑ پلانے کے بعد ایک عدد تھپڑ بھی جڑ دیا۔ آخر اس کی جرات کیسے ہوئی تھی کہ اس نے ثمرین کے کمرے کا پنکھا چلا دیا تھا اور بچے کو بھی لے آئی تھی۔ وہ بچہ جس کے پیسوں سے پورا گھر چل رہا تھا۔

گال رہ رہ کر دہکتا رہا۔ بجلی آئی تو اسے ایک بار پھر کمرے میں تنہا چھوڑ آئی۔

وہ کھیلتے کھیلتے کارپٹ پر بھوکا سو گیا۔ شام میں فیڈر بنا کر آئی، جگا کر منہ سے لگایا تو سکون سے دودھ پیتے وہ اس کے پرانے سے پھٹے ہوئے دوپٹے کا کونا اپنی ننھی منی انگلیوں میں ں دبانے لگا اور وہ رونے لگی۔

"پتا نہیں تیرا چچا کیسا انسان ہے۔ اس جہنم میں جھونک کے پیسے بھیجے جا رہا ہے۔"

باہر کا حبس شدید تھا۔ بجلی پھر سے غائب تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے تمام کھڑکیاں کھولے وہ اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

بچہ خالی فیڈر منہ سے لگائے آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اور وہ کھڑکی کی جیل جیسی سلاخوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔

ہو سکتا ہے بچے کے چچا کو گھر کے مکینوں کے رویے کی بالکل بھی خبر نہ ہو؟ ہو سکتا ہے اسے لگتا ہو وہ پیسے بھیج رہا ہے تو اس کے سگے ماموں اس کا بہت خیال رکھتے ہوں گے؟

ننھے ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی انگشت شہادت دیے وہ اس کی بند آنکھوں کو دیکھتے کچھ سوچ رہی تھی۔ اور اپنی اس سوچ پر عمل کرنے کا حتمی فیصلہ بھی کر چکی تھی۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

تم پہ قربان

"گلی میں جتنے بھی گھر تھے تقریباً سب کے ہاں قربانی کے جانور آ گئے تھے۔ ابو، چاچو بھی آج جانور لینے گئے تھے۔"

"پتا نہیں یہ لڑکے کہاں رہ گئے..... صبح نکلے تھے بکرا منڈی کے لیے ابھی تک نہیں لوٹے۔" دادی نے خود کلامی کے انداز میں کہا تو پاس قالین پر بیٹھی ان کی پوتیوں نے پہلے تو آنکھیں سٹپٹا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ایک ساتھ قہقہہ بلند کیا۔

"ل، ڑ، ک، ے..... دادی!"

"اے لو بھئی، میرے لیے تو وہ ابھی تک لڑکے ہی ہیں نا!"

"تم لوگ یہ دماغ کیوں کھپا رہی ہو؟" وہ آن لائن شاپنگ کے لیے کپ سے موبائل پر مختلف ڈیزائنرز کے ڈریسز دیکھ رہی تھیں۔ مشکل سے اگر کوئی کلر یا پرنٹ پسند آ جاتا تو اس کی قیمت بجٹ میں نہ آتی۔

ناولٹ

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، محض دماغ ہی کھپا رہے ہیں ہم۔ کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو آرڈر کرسکیں۔'' تحریم واقعی بیزار ہوگئی تھی۔ اس نے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

''لگتا ہے لڑکے آگئے ہیں۔'' گیٹ پر شور سن کر عدن نے بالکل دادی کے انداز میں کہا تو دادی سمیت تینوں ہنستے ہوئے باہر کو لپکیں۔ ابو اور چاچو بے اندر کی طرف کھینچ رہے تھے لیکن وہ بے چارے رسی تڑوانے کی ناکام سی سعی کررہے تھے۔

''احمد .....! حسن ! کہاں ہو بھئی تم لوگ۔'' انہوں نے گیٹ سے ہی بچوں کو آوازیں دینا شروع کردیں اگلے ہی پل سب وہاں جمع ہوگئے۔ حسن اور احمد تو خوشی سے اچھل رہے تھے۔ دادی اللہ کا شکر ادا کررہی تھیں۔ ردا، تحریم اور عدن کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ امی اور چاچی باہر آگئی تھیں۔

''یہ نہدیہ کہاں ہے وہ آج کیوں کمرے سے نہیں نکل رہی۔'' ردا کو تعجب ہوا۔

''جب میں دادی کے کمرے میں آئی تھی، تب تو وہ سو رہی تھی۔'' تحریم نے کندھے اچکائے۔

''چلیں اماں! آپ کے بھی گلے ختم ہوئے کہ سب لوگ جانور لے آئے ہیں صرف ہمارا ہی رہ گیا۔'' چاچو نے کھونٹے کے ساتھ دنبہ باندھتے ہوئے کہا تو امی نے ناک بھوں چڑھا کر دادی کو دیکھا۔

''تم لوگ چھوٹی بچیاں نہیں جو اب سارا دن دنبوں کے ساتھ کھیلتی رہوگی۔ چلو اپنے اپنے کام کرو۔'' چاچو کا دادی سے ہنس کر بات کرنا انہیں برا لگا تھا اور زہر لڑکیوں پر نکالا تھا۔ دادی سمجھ تو گئی تھیں مگر یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دنبوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

☆☆☆

''ملکہ عالیہ اب تم بھی اپنے حجرے سے باہر نکل آؤ۔'' جب وہ ظہر کے وقت بھی کمرے سے نہ نکلی تو امی کو غصہ چڑھ گیا۔ انہوں نے غصے سے پاس آکر اس کا بازو جھنجھوڑا۔

''اف میرے اللہ! اتنا تیز بخار۔'' بے ساختہ ہی ان کے منہ سے نکلا۔ ماتھا چھو کر دیکھا۔

''نہدیہ..... نہدیہ بیٹا!'' تیسری آواز پر اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا۔ اتنا تیز بخار ہے تمہیں، بتایا کیوں نہیں ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے۔'' امی نے پاس بیٹھ کر فکرمندی سے کہا اور وہ جواباً چپ ہی رہی۔

''تمہارے ابو اور چاچو آگئے ہیں دنبے لے کر۔'' امی نے خوشی سے بتایا تو وہ بدقت مسکرائی۔ چلو تم جلدی سے ہاتھ منہ دھولو میں چائے بناتی ہوں چائے کے ساتھ دوا لے لینا۔'' وہ تاکید بھی کرتی گئیں۔

''تمہیں سچ میں بخار ہے یا ڈرامہ کررہی ہو؟'' تحریم نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے کہا تو اس نے سنی ان سنی کرکے کپ لبوں سے لگالیا۔

''نہدی! بخار کیسے ہوگیا تمہیں؟'' ردا بھی بھاگی آئی اور دھپ سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''نہدیہ آپی! قربانی کے جانور آگئے ہیں۔ پتا ہے ہمارے دنبے کا منہ کالا ہے۔ آپ والے کا براؤن اور دادی کے دنبے کا سفید۔'' عدن بولی۔

''یار آن لائن تو کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ملا۔ ابو اور تایا جی سے اجازت لے کر بازار چلتے ہیں کسی دن۔'' وہ اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کررہی تھیں مگر اسے کسی کی کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے میری بچی کو؟'' دادی جھکتے ہوئے اندر آرہی تھیں۔ تحریم نے پیچھے کھسک کر انہیں بیٹھنے کی جگہ دی۔

''کل تک کتنا چمک رہا تھا چہرہ اور آج دیکھو کیسا زرد پڑگیا ہے۔'' دادی نے پہلے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا پھر پیار سے اس کا گال تھپکی۔

''ہاں، آپ ہی کی نظر لگی ہے اس کو.....'' دوا لے کر آئی امی تلملا کر بولیں۔

''یہ کلرتم پہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آج تمہارا رنگ کتنا چمک رہا ہے۔ نظر ہی کھا گئی ہے میری بچی کو۔''

انہوں نے گولیاں اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دادی کو بے نقط سنائیں۔

''امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، پلیز چپ ہو جائیں۔'' نہدیہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ دادی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

باقی تینوں بھی باری باری باہر کھسک گئیں۔ اور وہ جو پہلے ہی اتنی پریشان تھی مایوس ہو کر اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے اپنا مستقبل، اپنی خوشیاں اور ارمان سب اپنی ماں کے اسی رویے کی وجہ سے بکھرتے نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

دادی نے دونوں بیٹوں کو ایک ہی گھر میں بیاہنے کی جو غلطی کی تھی اس کا خمیازہ ساری زندگی بھگتنا پڑا کیونکہ دونوں بہنیں ایک جیسی سوچ اور ذہنیت کی تھیں۔ آپس میں ان کی مثال یک جان دو قالب کی سی تھی۔ مجال ہے جو کبھی آپس میں ناراض ہوئی ہوں۔ شوہروں کا کاروبار بھی مشترکہ تھا اور گھر میں بھی کھانا پینا سب مشترکہ۔ دور دور تک علیحدہ ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔''

وہ خود تو ساتھ جڑی ہوئی تھیں لیکن ساس کو اتنا دور کر دیا تھا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بات کیے بغیر مہینوں گزر جاتے۔ ان کے شوہروں نے تو تمام گھریلو معاملات بیویوں کے سپرد کیے ہوئے تھے۔ ان کی ماں کے ساتھ بیویوں کا سلوک کیسا ہے ان کی بلا سے۔ ''جب اپنی اولاد ہی ماں سے اتنی غافل ہے تو بہوؤں سے کیا شکوہ، وہ تو پھر پرائی ہیں۔'' وہ سوچ کر صبر کر لیتیں۔

''کاش یہ دونوں الگ الگ گھروں سے ہوتیں تو شاید ایک دوسری سے مقابلہ بازی کے چکر میں ہی مجھ بڑھیا کا بھی خیال کر لیتیں۔''

☆☆☆

آج خاصا مصروف دن تھا۔ عید کے لیے گھر کی تفصیلی صفائی ہو رہی تھی۔

''آدھا کام آج کر لیتے ہیں۔ آدھا کل کر لیں گے۔'' ردا نے مشورہ دیا تھا۔

''اتنی لڑکیاں ہیں سب کے حصے میں بمشکل ایک، ایک کام ہی آئے گا اس لیے آج ہی ختم کرو۔ کوئی دودھ کی نہر نہیں نکالنی کہ ایک دن میں ممکن نہیں۔'' امی نے اسے جھڑک دیا۔

تمام کمروں کے پردے، کور، چادریں، دھونی تھیں اور لڑکیاں یہ دیکھ دیکھ کر ہلکان ہو رہی تھیں۔

''نہدی! تمہاری طبیعت اگر ٹھیک نہیں تو رہنے دو یہ سب، ہم لوگ خود ہی کر لیں گے۔'' وہ کچن کیبنٹ سے تمام برتن اور دیگر مسالا جات کے ڈبے نکال کر دھو رہی تھی تو خالہ چچی نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ وہ بہت مضمحل سی لگ رہی تھی رنگ بھی کتنا پیلا ہو رہا تھا اور چہرہ بھی ستا ہوا لگ رہا تھا۔

''نہیں چچی! میں بالکل ٹھیک ہوں میں کر لوں گی یہ سب۔'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا تو چچی چپ ہو گئیں۔

کافی دیر بعد کچن کا پھیلاوا سمیٹ کر وہ باہر آئی۔ دنیے چارا کھا رہے تھے اور دادی ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔

''آپ یہاں اتنی گرمی میں کیوں بیٹھی ہیں دادی؟'' اس نے پاس آ کر کہا۔

''بچے! میں ان کو چارہ کھلا رہی ہوں۔'' انہوں نے ایک دنبے کے آگے پانی کا ٹب رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو خود ہی کھا رہے ہیں، آپ کیوں گرمی میں خود کو ہلکان کر رہی ہیں۔'' وہ ایک دنبے کے قریب ہوئی تھی مگر وہ دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

''بچے! تم نے غور کیا کہ یہ تینوں دنبے میرے ہاتھ سے چارا بھی کھا رہے ہیں اور پانی بھی پی رہے ہیں، جبکہ تمہارے قریب ہونے سے یہ بدک کر پیچھے ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجھ سے مانوس ہو چکے ہیں۔''

اگر میں چلتے پھرتے ان کے آگے محض چارا پانی رکھ جاؤں تو یقین مانو یہ مجھ سے بھی کبھی مانوس نہ ہوں۔ انہیں کیسے پتا چلے گا کہ کسی اجنبی کے دل میں ان کے لیے کیا جذبہ ہے۔''

وہ بڑے غور سے دادی کی باتیں سن رہی تھی۔

''اگر میں خود پاس بیٹھ کر انہیں چارہ پانی دوں گی۔ پیار سے انہیں تھپکوں گی تو یہ جان جائیں گے کہ میرے اندر ان کے لیے اچھے جذبات ہیں۔ پھر یہ مجھ سے خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بیٹا! آپ کے رویے آپ کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔''

دادی نے شفقت سے اسے سمجھایا۔

''اگر جانوروں کو رویوں کی اتنی پہچان ہے تو پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کسی کے دل میں موجود جذبے کو اس کے رویے سے نہ جان سکے۔''

اتنے دنوں سے ایک خیال، ایک گمان اور ایک وہم کا نٹا بن کر اس کے دل میں چبھ رہا تھا۔ اب دادی کی باتیں سننے کے بعد ایک پل میں ہی اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے دل میں اٹکا وہ کانٹا نکل گیا ہو۔ ایک مثبت سوچ نے ساری اداسی اور پریشانی پل بھر میں مسرت و شادمانی میں بدل دی تھی۔

''دادی! ہم دنبے باہر لے کر جا رہے ہیں۔'' احمد اور حسن نے ہلہ بول دیا تھا اور وہ ہنستی کھلکھلاتی ان کے ساتھ دنبوں کی رسیاں کھول رہی تھی۔''

☆☆☆

کل سارا دن گھر کی صفائی کرتے جو لڑکیوں کی حالت ہوئی تو ابھی تک نڈھال پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے کچن میں جا کر تمام برتن دھوئے کچن سیٹ کیا پھر احمد اور حسن کو ہوم ورم کروایا۔ آج انہوں نے فوراً ہی ہوم ورک کر لیا اور اپنے اپنے دنبے کے پاس جا پہنچے تو وہ بھی اٹھ کر دادی کی طرف آ گئی۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔'' اس نے دادی کو الماری صاف کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''بھئی، مجھے بھی تو عید منانی ہے نا..... تو میں بھی اپنے کمرے کو صاف کر رہی ہوں۔'' دادی نے کہا۔ تو وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

جو میری ماں کا رویہ ان کے ساتھ ہے اور جس طرح کل انہوں نے ان کی توہین کی اگر یہ منتقم مزاج ہوتیں تو ویسے ہی بے عزتی کر کے مجھے اپنے کمرے سے چلتا کرتیں لیکن یہ تو ایسی بے ضرر ہستی ہیں جن کے ہاتھ یا زبان سے ممکن نہیں کہ کسی کو کوئی ایذا پہنچی ہو۔

اس نے پیار بھری ایک نظر اپنی شفیق سی دادی کے پرنور چہرے پر ڈالی اور ان کے ہاتھ سے کپڑا لے کر خود الماری صاف کرنے لگی۔

''بچے! بس کرو اب۔ تم تھک جاؤ گی میں خود کر لیتی ہوں۔'' انہوں نے شفقت سے کہا۔

''دادی ابھی میں نے کیا ہی کیا ہے جو میں تھک جاؤں گی۔'' وہ چیزیں دوبارہ الماری میں سیٹ کرتے بولی۔

''بیٹا! اگر تمہاری ماں کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ تم یہاں کام کر رہی ہو تو وہ حشر کر دے گی۔'' وہ اپنی بہوؤں کی تنگ نظری سے واقف تھیں۔

''یہ تو مجھے بھی پتا ہے لیکن ابھی وہ سو رہی ہیں۔

ان کو کیا پتا چلے گا۔'' وہ جلدی سے بولی اور دادی مسکرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔

''دادی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' وہ فارغ ہو کے دادی کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''پوچھو!'' دادی نے حسب عادت مسکرا کے کہا۔ ایسا لگتا تھا مسکراہٹ ان کے چہرے کا حصہ تھی۔ نور برستا تھا۔ نہد یہ کو اپنی دادی پہ رشک آتا تھا۔

''آپ اتنی مضبوط کیسے ہیں؟'' دادی کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ بچپن سے دیکھ رہی تھی، بچپن میں تو حسن اور احمد کی طرح یہ سب لڑکیاں بھی دادی کے قریب تک نہ پھٹکتی تھیں کیونکہ ان کی ماؤں نے دادی کی برائیاں کر کر کے ان کا ذہن خراب کر دیا تھا لیکن جیسے جیسے شعور پختہ ہوا، اچھے برے کی پہچان ہونے لگی تو ان کو دادی کی محبت کی قدر ہوئی۔

گھر میں کل دس اور ''ایک''۔ گیارہ افراد تھے اور وہ ''ایک'' دادی تھیں جن سے باقی دس کوئی سروکار نہ تھا۔ انہوں نے کچھ کھایا یا نہیں، بیمار ہیں یا تندرست، کسی کے لیے قابل اعتنا نہیں تھیں۔ وہ ''ایک'' ہی تو گھر کی اصل مالکن تھیں لیکن ''دس'' نے انہیں ان ہی کے گھر میں پرایا کر دیا تھا۔

کافی عرصہ تو وہ بہوؤں کے رحم و کرم پر رہی تھیں سارے گھر والے آرام سے ناشتہ کر لیتے۔ کسی کو ان کا خیال ہی نہ آتا۔ تسبیح کے دانے گراتے وہ آس بھری نظروں سے کچن میں آتی جاتی بہوؤں کو دیکھتیں کہ شاید انہیں ان کا بھی خیال آ جائے۔ اگر کبھی بھوک سے نڈھال ہو کر وہ کچن کا رخ کر لیتیں تو بہوئیں تھانیدارنیوں کی طرح سر پر آ کھڑی ہوتیں۔ دادی ایسے نادم ہو جاتیں جیسے کوئی چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہوں۔

دوپہر اور رات کا کھانا بھی بچا کھچا اس وقت ملتا جب سب کھا لیتے لیکن وہ اتنی صابر و شاکر تھیں، نہ کبھی بہوؤں سے انہیں نہ بیٹوں کے سامنے شکوہ کیا۔ اپنے ساتھ جو ہو رہا تھا وہ چپ چاپ سہہ جاتی تھیں لیکن یہی سلوک جب میکے آئی بیٹی کے ساتھ ہوتا تو ان کا کلیجہ کٹ کے رہ جاتا۔

''اماں! دیکھا اپنی اولاد کا حال۔ عرصے بعد گھر آئی بہن اور اس کے بچوں کے ساتھ محض چلتے پھرتے رسمی سلام دعا۔'' نگہت پھوپھو ہمیشہ یہی گلہ کرتیں۔

''بہن کو خالی ہاتھ رخصت کر دیا۔ میرے جیتے جی یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہوگا۔'' ایک بار دادی نے بیٹوں کے سامنے کہہ ہی دیا۔

''اپنا گھر پتا نہیں کیسے چلاتے ہیں ہم اسے آئے روز کہاں سے دیں۔''

''آئے روز؟ وہ تو مہینوں نہیں آتی کبھی غلطی سے آ جائے تو تم لوگوں کو اس سے بات کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔''

''تو کیا کریں اماں! جب وہ آئے تو کام کاج چھوڑ کر اس کے سرہانے بیٹھے رہا کریں۔'' ابو نے بے زار ہو کر کہا اور ہاتھ جھاڑ کے اٹھ گئے۔

☆☆☆

دو دن بعد دادی نے اپنا کھانا پینا الگ کر لیا۔ بازار جا کے سودا سلف لے آئیں۔ برتن تو جو کچن میں استعمال ہو رہے تھے وہ دادی کے ہی تھے۔ سو اپنی ضرورت کے مطابق تمام برتن بھی نکال کر الگ کر لیے۔ بہوویں ویسے تو خوش تھیں اوپر سے شوہروں کے کان بھرے کہ اب اماں زمانے میں ہماری ناک کٹوائیں گی۔

انہوں نے ماں سے بات کی سمجھایا بجھایا لیکن اماں کا فیصلہ اٹل تھا۔ اب بہوویں کچن پر قبضہ جمائے رکھتیں۔ ساس کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ دادی کے مسالا جات استعمال کرتیں۔ وہ فریج میں فروٹ لا کر رکھتیں تو بچے ماؤں کے کہنے پہ کبھی کھا لیتے۔ کبھی ضائع کر دیتے۔ انہیں یہ بھی دکھ تھا کہ سسر مرحوم کی پنشن بھی ہاتھ سے گئی۔ اس لیے انہوں نے دادی کا ناک میں دم کر دیا تھا مگر دادی نے اس مسئلے کا بھی حل نکال لیا تھا۔

کچن سے اپنا فریج اٹھوا کر کمرے میں رکھوایا۔

ایک ٹوکری میں برتن ڈال کر کمرے میں ہی رکھ لیے اور باقی دیگچے وغیرہ اور دیگر کئی برتن ایک کچن کیبنٹ میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ واشنگ مشین بھی اپنے کمرے کے آگے رکھوالی۔ کمرے کی الماری صاف کر کے اس میں تمام مسالا جات کے ڈبے رکھ دیے اور ایک چولہا بھی لے آئیں۔ سردی میں کمرے میں ہی کھانا بنا لیتیں، ہیٹر لگانے کی بھی ضرورت نہ رہتی اور گرمی میں صحن میں چولہا گھسیٹ لیتیں۔ بہوویں جل کر رہ گئیں وہ تو سوچتی تھیں اب بڑی بی کو ساری زندگی یونہی خوار کریں گی۔

دادی کو دادا مرحوم کی پنشن بیس ہزار روپے ملتی تھی، سودا سلف لانے کے بعد مہینے بھر فروٹ بھی چلتا، جب دل چاہتا دادی گوشت پکا کر کھاتیں، مکھن، بریڈ، جام اور کئی کھانے کی چیزیں ہمہ وقت فریج میں موجود رہتیں۔ نگہت پھوپھو آتیں تو اپنی مرضی اور پسند کی چیزیں پکا کر بچوں کو کھلاتیں۔ دادی ان کے لیے کئی تحائف بھی لے لیتیں پھر۔

نگہت پھوپھو کے کہنے پر انہوں نے کمیٹی ڈالی۔ اس طرح جب اکٹھی رقم ہاتھ آئی تو وہ کچھ نہ کچھ لے لیتیں۔ دادی نے اپنا کمرہ بڑی نفاست سے سجا لیا تھا۔ ڈبل بیڈ خریدا اے سی بھی لگوالیا تھا۔ پورے کمرے میں انتہائی نفیس قالین ڈالا تھا، انہوں نے ایل سی ڈی بھی لگوالی اب کیبل پر بھی نعتیں سنتیں۔ کبھی اسلامک پروگرام دیکھتیں تو کبھی موسیقی اور ڈرامے۔ بہوویں یہ دیکھ کر جلتی کڑھتی رہتیں۔ لیکن دادی اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں کہ اس نے انہیں دوسروں کی محتاجی سے نجات دلائی۔

''دادی! کیا آپ کا دل نہیں دکھتا اپنی اولاد کے رویے سے؟'' وہ دادی سے پوچھتی۔

''شروع شروع میں میرا دل بہت دکھتا تھا تو میں ان لوگوں کی ہدایت کے لیے رب سے دعا کرتی تھی۔'' انہوں نے لمحہ بھر کو توقف کیا۔ چند تھمے کھانے کے لیے جب میں سارا سارا دن انتظار کرتی رہتی تھی تو پھر میں نے اپنے اللہ سے التجا کی کہ تو مجھے ان لوگوں کی محتاجی سے نجات دلا دے۔ اس نے مجھے صحیح فیصلہ کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی صلاحیت دے دی۔

کیا فرق رہ جاتا ہے؟ جو لوگ دوسروں کی دی گئی تکلیفوں پر کڑھتے رہتے ہیں یا واویلا کرتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا جب اللہ نے مجھے ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔ صحت و تندرستی دی ہے۔ ہر مہینے بیٹھے بٹھائے میرے رزق کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ تو میں دوسروں کی محتاج کیوں بنوں۔ پھر میں نے نہ دنیا کی پروا کی نہ کم ظرف اولاد کی اور دیکھ لو، میرے پاس اللہ کی کون سی نعمت نہیں ہے۔''

وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔

''دادی! میں نے اتنی فیسیں بھر کے اتنی کتابیں پڑھ کے کالج یونیورسٹی سے بھی وہ کچھ نہیں سیکھا جو کچھ آپ نے مجھے سکھایا ہے۔'' اس نے ان کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگایا تو دادی کے دل سے ایک ساتھ کئی دعائیں نکلیں۔

☆☆☆

وہ سب بہت پرجوش تھیں۔ انہیں بازار جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ پہلے تو امی چچی ہی ان کے لیے خرید و فروخت کرتی تھیں مگر جب بڑی ہوئیں تو خود ساتھ جانے کی ضد کرنے لگیں۔ لیکن امی کہاں ماننے والوں میں سے تھیں۔

''بیٹا جب تم لوگوں کو ہر چیز گھر بیٹھے مل جاتی ہے تو بازار جا کے کیا کرو گی۔'' ابو، چاچو اتنی سی بات کہہ کے قصہ تمام کر دیتے۔

''امی آج کے دور میں بھی سب سے زیادہ بورنگ لائف ہماری ہے۔ ہماری فرینڈز تو فیملی کے ساتھ بڑے بڑے مالز میں شاپنگ کرنے جاتی ہیں آپ ہمارے لیے اتوار بازار اور ٹھیلوں سے کپڑے لاتی ہیں۔''

''مگر میں ٹی وی موجود ہے اس سے بڑی تفریح کیا ہوگی دنیا جہان کی ہر نعمت موجود ہے۔ کھانے پینے سونے جاگنے میں آزاد ہو اور کیا چاہیے تم

تو لوں تو۔" امی کے پاس ہزار دلیلیں تھیں۔

"اسکول کالج اور یونی سے گھر بس یہی ان کی زندگی تھی نہ کسی دوست کی طرف جانے کی اجازت تھی نہ کسی کو گھر بلانے کی بلکہ جس دن اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس پر مزید پابندیاں لگ گئیں۔

"یہ عبایا لو تم یہی پہن کر جایا کرو گی۔" امی نے اس کے آگے رکھا۔

اچھے اچھے کپڑے پہن کر نت نئے ہیئر اسٹائل بنا کر روز یونیورسٹی جانے کے ننھے ننھے ارمان جو دل میں تھے وہ سب خس و خاشاک ہو گئے۔

"امی یہ ویمن یونیورسٹی ہے، مطلب صرف لڑکیوں کی، یہاں عبایا کی کیا ضرورت ہے۔" آخری کوشش۔

"ہاں تو ویمن یونیورسٹی میں عبایا پہننا گناہ ہے؟ اور ہاں ایک بات یاد رکھنا بھول کر بھی کسی لڑکی کے موبائل میں تصویر نہ بنوانا ورنہ صرف تمہارا یونیورسٹی جانا بند نہیں ہوگا بلکہ باقی تینوں لڑکیوں کو بھی اسکول کالج سے چھٹی کروا دی جائے گی۔"

"یار! تمہارے پاس موبائل نہیں ہے۔" اس کی کلاس فیلوز حیرت سے پوچھتیں تو وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ گھر میں ایک ہی موبائل تھا جو ہمہ وقت امی کے پاس رہتا تھا۔ ہاں اب اتنی اجازت مل گئی تھی کہ اسے نیٹ سے کچھ سرچ کرنا ہوتا تو دیکھ لیتی بلکہ باقی تینوں کو بھی نیٹ سے کچھ کام کے لیے موبائل مل جاتا تھا۔

"چلو چھوڑ دو آئینے کی جان اب، دیر ہو رہی ہے ہمیں۔"

تحریم نے اسے بازو سے کھینچ کر باہر گھسیٹا اور وہ ایک ہاتھ سے اسکارف کی پن دباتے باہر نکل گئی۔ وہ سب بہت خوش تھیں۔ آج کا دن تو ان کے لیے بہت مختلف تھا۔ ایک تو بازار جانے کی اجازت مل گئی تھی دوسرا دادی کے ساتھ جا رہی تھیں۔ کیونکہ امی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ ایک دکان سے دوسری دکان گھوم رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے بازار کا چپہ چپہ دیکھ لیا۔ ان کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے جن میں ان کی پسند کے کپڑے تھے۔ دادی نے بھی اپنا عید کا جوڑا لے لیا تھا ہر عید پہ بازار جا کر اپنا من پسند جوڑا ضرور لاتی تھیں حالانکہ نگہت پھوپھو بھی انہیں ہر تہوار پر کپڑے بھیجنا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ ان سب نے اپنی اپنی پسند کی چوڑیاں اور میچنگ جیولری بھی لے لی۔

دادی کے ساتھ بازار آ کر انہوں نے بہت انجوائے کیا تھا، یہ نہیں تھا کہ وہ پہلی بار آئی تھیں۔ بچپن میں تو مائیں اکثر کسی نہ کسی بچی کو ساتھ لے آتیں۔ پابندیاں تو تب لگیں جب وہ بڑی ہوئیں لیکن پھر بھی وہ جب کبھی امی چچی کہیں کسی رشتہ دار کے ہاں گئی ہوتیں تو دادی کے سر ہو جاتیں اور دادی خود بھی گھومنے پھرنے کی شوقین جھٹ تیار ہو کر رکشہ منگواتیں اور ان کی واپسی تک وہ آئس کریم، برگر کھا کر واپسی آ جاتیں مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔

دادی! بہت بھوک لگ رہی ہے، چلیں اب کچھ کھا لیں۔" تحریم نے پیٹ پہ ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔ تو وہ قریبی فوڈ پوائنٹ پر آ گئیں۔

دادی اس سے کہیں، زنگر برگر اور ایک بڑی کولڈ ڈرنک لے آئے۔" ردا نے ویٹر کی طرف دیکھ کر دادی سے کہا۔

"بھئی میرا تو پہلے گول گپے کھانے کا موڈ ہے۔" دادی بولیں۔

"دادی! اس عمر میں آپ گول گپے کھائیں گی؟" تحریم نے آس پاس بیٹھے لوگوں کا سوچتے ہوئے کہا۔

"بیٹا یہ کہاں لکھا ہے کہ یہ چیز صرف جوان کھائیں گے یا صرف بوڑھے؟ ہاں کوئی بیماری یا پرہیز ہو تو الگ بات ہے۔" انہوں نے رسان سے کہا۔ "اور ویسے بھی کیا بوڑھوں کے دل نہیں ہوتے؟ انہیں بھی کھانے پینے کا، لوگوں سے ملنے کا شوق ہوتا ہے۔"

"دادی! آپ کی بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" نہدیہ نے داد دینے والے انداز میں کہا۔

ویسے دادی! آپ ہمارے لیے دعا کریں۔ ہم بھی اپنا بڑھاپا آپ کی طرح گزاریں گی۔" ردا نے کہہ کر باقی سب کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا اور سب نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

☆☆☆

عدن اور تحریم صبح سے سر کھا رہی تھیں کہ ہمارے کپڑے سی دیں کیونکہ عید میں صرف سات دن رہ گئے تھے۔

بالآخر امی جلدی جلدی کاموں سے فارغ ہو کر آ گئیں۔

خالہ چچی کو تو سلائی نہیں آتی تھی اور درزن سے سلائی کروانے کا کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ بقول امی بھئی خواہ مخواہ درزنوں کو پیسے کیوں دیں۔

اب انہیں عید سے پہلے پہلے چاروں کے کپڑے سلائی کرنے تھے۔

"امی! ایک بات کہوں۔" نہدیہ نے ڈرتے ڈرتے امی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کہو۔" امی نے کپڑا کاٹتے، بنا دیکھے ہی جواب دیا۔

"آپ دادی کا عید کا جوڑا بھی سی دیں نا۔"

"دادی کوئی بچی نہیں ہیں جو عید پہ نیا جوڑا ضرور پہنیں گی۔" امی کو تو موقع چاہیے تھا دادی کے خلاف بولنے کا اور وہ اب ہونق بنی سوچ رہی تھی کہ اسے امی سے یہ بات کہنی ہی نہیں چاہیے تھی کیونکہ اگر امی نے دادی کے سامنے بھی کچھ ایسا کہہ دیا تو دادی کو کتنا برا لگے گا۔

"غضب خدا کا قبر میں ٹانگیں لٹک رہی ہیں اور شوق دیکھو ساس صاحبہ کے۔" امی کی شعلہ بیانیاں جاری تھیں اور وہ خاموشی سے پاس بیٹھی لب کاٹ رہی تھی۔

"آپ کا یہ رویہ میری خوشیوں کی راہ میں حائل ہوگا۔" وہ روہانسی ہوتی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ کمرے میں آئی تو ردا نے اس

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے والدین دادی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں۔" جھنجھلاہٹ سے کہتی وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو ان لوگوں کے اتنے برے رویوں کے برعکس دادی ہم سے کتنا پیار کرتی ہیں۔"

"مجھے تو ان کے سامنے ندامت ہونے لگتی ہے۔" ردا نے بھی لب کچلے۔

"ویسے ابھی کچھ ہوا ہے کیا؟" اس نے عام سے انداز میں استفسار کیا۔

"کچھ نہیں! بس میں نے غلطی کی امی سے یہ کہہ کر دادی کا جوڑا بھی سی دیں تو انہوں نے دادی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ انتہائی بے حس لوگ ہیں۔" نہدیہ کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"چلو ایک کام کرتے ہیں۔ خالہ تائی سے کپڑے سینا سیکھ لیتے ہیں اور پھر ہم خود ہی اپنی دادی کے کپڑے سلائی کر دیا کریں گے۔" ردا نے منٹوں میں حل نکالا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"یار! ویسے کل ہم سے ایک غلطی ہوئی ہے۔" ردا نے بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر کہا۔

"کیا غلطی؟"

"ہمیں کل دادی کے لیے کوئی گفٹ لینا چاہیے تھا۔ وہ ہم سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ ہم اگر انہیں کوئی گفٹ دیں گے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔"

"ہم انہیں ابھی بھی گفٹ دے سکتے ہیں۔ پاکٹ منی تو ہے ہمارے پاس۔ چلو میں، عدن اور تحریم کو بلاتی ہوں پھر پلان بناتے ہیں۔"

وہ چاروں گھنٹے سے سر جوڑے بیٹھی یہ سوچ رہی تھیں کہ دادی کے لیے گفٹ میں کون سی چیز لی جائے۔"

"آئیڈیا.....!" تحریم نے چٹکی بجائی۔

آئیڈیا سن کے وہ تینوں بھی متفق ہوئی تھیں لیکن اب ایک اور مسئلہ تھا کہ بازار کیسے جائیں؟ چاروں

نے پھر ذہن دوڑانا شروع کردیے۔ اس بار پھپھی ردا نے بجائی تھی یعنی اس کے دماغ میں کوئی ترکیب آ گئی تھی۔

''ہمم۔'' گڈ آئیڈیا۔'' نہدیہ نے آنکھیں گھما کر کہا۔

پلان تیار تھا بس اب جلد از جلد تکمیل ضروری تھی۔

☆☆☆

''امی! آج میرا جوڑا سی دیں۔'' تحریم نے یہ بات چوتھی بار کہی تھی۔ پہلے دو بار تو امی نے دانستہ سنی ان سنی کی تیسری بار گھورا اور اب چوتھی بار ادھر ادھر نظریں گھما کر چپل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ تحریم کی قسمت اچھی تھی کہ چپل امی کی دسترس سے کافی دور تھی سو ایک زوردار چپت تحریم کے سر پر لگی۔

''عدن کے یونہی ادھورے چھوڑ دوں؟ اور تمہارے سلائی کرنا شروع کردوں۔''

''امی..... امی میں نے تو یونہی کہا تھا۔'' تحریم اپنا دفاع کررہی تھی کیونکہ امی کا ہاتھ دوبارہ لہرایا تھا۔ نہدیہ اور ردا کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

''تائی خالہ! مجھے بھی کپڑے سینا سکھا دیں۔'' تھوڑی دیر بعد ردا نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

''تم سیکھنے والی بنو..... میرا تو فائدہ ہی ہے۔ تھوڑا بوجھ بٹ جائے گا۔'' انہوں نے سوئی میں دھاگہ ڈالتے کہا۔

''سچ؟ پھر کب سے سکھائیں گی آپ؟'' ردا کافی پرجوش تھی۔

''آج ابھی سے۔'' انہوں نے مشین چلاتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر بتائیں میں کیا کروں ابھی۔'' وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی تھی۔

''میری چندا ابھی تم پاس بیٹھ کر غور سے دیکھتی رہو۔ ابھی تمہیں یہی کرنا ہے۔'' انہوں نے اس کی دلچسپی دیکھ کر بتایا اور اس نے بھی خوشی خوشی ہامی بھرلی۔ اور پھر سارا دن وہ ان کے پاس ہی بیٹھی رہی۔

☆☆☆

''چاچو مجھے آپ سے ایک کام ہے۔'' اس نے ذہن میں ترتیب دیے جملے دہرانا شروع کردیے۔

''ہاں بولو کیا کام ہے؟''

چاچو صبح کام پر جانے سے پہلے دنبوں کے آگے گھاس وغیرہ ڈالتے تھے۔

''وہ چاچو مجھے آپ تھوڑی دیر کے لیے بازار لے جائیں گے؟'' اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے بڑی معصومیت سے دھیمی آواز میں کہا۔

''با، ز، ا، ر.....'' چاچو کی آواز ذرا بلند ہوئی۔

''ابھی کل ہی تو تم لوگ گئی تھیں بازار پھر آج کیا ضرورت پڑ گئی۔'' انہوں نے جھنجھلا کر کہا، شاید انہیں جانے کے لیے دیر ہورہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ نکل جاتے اس نے ہمت کرکے بات کہہ ڈالی۔

''افوہ!'' بھئی کوئی جواب نہیں تم لوگوں کا..... خیر چلو اب جلدی سے پھر میں تمہیں چھوڑ بھی دوں گا اور ہاں ساتھ ردا کو لے لو میں کہاں تمہیں لے کر دکانوں میں گھوموں گا۔''

اگلی بات کہہ کے چاچو نے ان کا مسئلہ ہی حل کردیا تھا۔ اس نے ردا کو اشارہ کیا تو وہ سب کی نظروں سے بچتی بچاتی فوراً آ گئی۔ مزے کی بات یہ ہوئی امی لوگوں کو ان کے بازار جانے کی بھنک بھی نہ پڑی تھی۔

☆☆☆

ردا سلائی سیکھنے کے شوق میں امی کے پہلو سے چپکی رہتی۔ تحریم کا آج جوڑا سلنا تھا۔ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ پل بھر کو بھی ادھر ادھر ہوتی تو جہاں تحریم یقیناً عدن نے بھی وہیں ہونا تھا سو وہ حسب عادت کاموں سے فارغ ہوکر دادی کے پاس آ گئی۔

دادی ٹی وی پر کوئی اسلامک پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی بولیں۔

''نہدیہ بچے! مجھے ذرا فریج سے پانی نکال کے دو۔'' پانی کا گلاس تھما کر وہ ان کے برابر ہی بیٹھ گئی۔

''پھوپھو کالنگ۔'' تکیے کے نیچے وائبریشن ہوئی تو اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔

''پھوپھو کا فون۔'' وہ زیرلب بڑبڑائی اور دادی کو موبائل تھما دیا۔

''ہاں نگہت! کیسی ہو میری بچی؟'' پھوپھو کے لیے محبت دادی کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

''امی جان میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس دو تین دن سے ایسی الجھی ہوئی تھی کہ آپ کی خبر بھی نہیں لے سکی۔'' اسپیکر آن تھا اور پھپھو کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

''ہائیں خیر ہے نا؟ کہاں الجھی ہوئی تھیں۔'' دادی کو فکر ہوئی۔

''ہاں امی! خیر ہی سمجھیں، ایک تو آپ کے کپڑے سلائی کر رہی تھی۔ سوچا عید سے پہلے پہلے آپ کو بھجوادوں اور دوسرا۔ پھپھو نے ذرا توقف کیا۔

''دوسرا کیا بچی؟'' دادی نے فکرمندی سے پوچھا۔

''بس امی کیا بتاؤں یہ آپ کے نواسے نے آج کل بہت پریشان کیا ہوا ہے۔''

''کس کی بات کر رہی ہو تم، زین کی؟'' دادی نے قیاس آرائی کی۔

''ارے نہیں امی ارحم کی بات کر رہی ہوں۔ اس نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔''

اس کی تمام تر حسیات کان بن کر پھپھو کی بات سن رہی تھیں اور دل کا عالم ناقابل بیاں تھا۔

''ارے سیدھی بات کرو کیوں، پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔'' دادی نے جھنجھلا کر کہا۔

''امی صاحبزادے کے لیے بہت اچھے اچھے رشتے ہیں مگر.....'' اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''مگر.....مگر کیا؟'' اس کا تمام وجود سماعت بن گیا۔ ''مگر وہ ہے کہ ہاں کے نہیں دے رہا۔''

اس کے سینے سے آسودہ سانس خارج ہوئی۔ لیکن کان ابھی بھی اسی طرف تھے۔

''بہت پوچھا ہے کہ وجہ کیا ہے لیکن کچھ بتاتا ہی نہیں بس اتنا کہتا ہے ابھی نہیں کرنی شادی۔'' پھپھو کے لہجے سے لگ رہا تھا اسے سمجھا سمجھا کے تھک گئی ہیں۔

''تو بیٹا نہ کرو اتنی جلدی۔'' دادی نے رسان سے کہہ دیا۔

''امی بات جلدی کی نہیں بلکہ اچھے رشتوں کی ہے لڑکیاں دیکھی بھالی ہیں ہر لحاظ سے ارحم کا جوڑ بنتا ہے لیکن نجانے کیوں اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔'' پھپھو کے لہجے میں اکتاہٹ در آئی۔

''بیٹا کیا پتا اس کی کوئی پسند ہو۔'' اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں تو خجل سی ہوتی وہاں سے اٹھ گئی۔

''آپ کی طرف بھیجوں گی کل اسے آپ ہی یہ راز اگلوایئے گا۔'' کمرے سے نکلتے ہوئے یہ آخری بات اس نے سنی تھی۔

پھر وہ رات سہانے سپنے دیکھتے گزر گئی۔ رنگوں سے سجے، پھولوں سے مہکتے سپنے وہ ارحم کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔

☆☆☆

آف وائٹ اور لائٹ پے پنک کنٹراس کے کڑھائی والے سوٹ میں اس کی رنگت بھی گلابی ہوگئی تھی اس نے بڑی دل جمعی سے ہیئر اسٹائل بھی بنایا تھا۔

''ارے واہ تم تو آج باربی ڈول لگ رہی ہو۔'' ردا نے اسے دیکھتے ہی تعریف کی۔ ''کپڑوں کے رنگ کا عکس بھی دیکھو چہرے پر پڑ رہا ہے۔''

چاچی نے اس کے گلابی ہوتے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر شفق پھوٹ رہی تھی اور وہ لوگ اسے کپڑوں کا رنگ سمجھ رہی تھیں۔

جیسے ہی وہ سب مصروف ہوئیں وہ اٹھ کر اپنی من پسند جگہ یعنی دادی کے کمرے میں آ گئی لیکن آج یہ کمرہ اسے کچھ زیادہ ہی اپنا لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پار گیٹ پر نظریں جمادی تھیں۔

''تم بیٹھو، میں ذرا دیکھ لوں ایک نظر۔''

گیٹ پر دستک اسے محسوس ضرور ہوئی تھی۔ لیکن اس نے سوچا کوئی بچہ ہوگا۔ دادی کے ساتھ ساتھ چلتا وہ اندر آیا۔ ڈارک براؤن شلوار قمیص، سرخ وسفید رنگت جو گرمی کی وجہ سے مزید سرخ ہوگئی تھی۔ اس نے چونک کر جو دیکھا تو پھر نظریں ہٹانا بھول گئی۔

''آہم، آہم!'' ارحم نے دانستہ گلا کھنکارا تو وہ ہوش میں آئی۔

''السلام علیکم!'' ہوش تو ارحم کے بھی اڑ گئے تھے۔ اس نے سنبھل کر سلام کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' شاید اپنی آواز اسے خود بھی نہیں سنائی دی تھی۔

''یہ لو بیٹا!'' دادی نے حال احوال پوچھنے کے بعد فریج سے کولڈ ڈرنک نکال کر گلاس میں انڈیلی اور پھر ٹرے میں رکھ کر اسے پیش کی۔

''ارے نن..... نہیں نانو میں کولڈ ڈرنک نہیں پیتا۔'' دادی نے کولڈ ڈرنک کا گلاس سائیڈ پہ رکھ دیا۔

''اچھا میں پھر تمہارے لیے کوئی جوس وغیرہ لے آتی ہوں۔'' وہ باہر جانے لگیں۔

''دادی آپ بیٹھیں میں لے آتی ہوں۔'' وہ باہر جانے لگی۔

''نہیں نہیں رہنے دیں مجھے بس سادہ پانی دے دیں۔''

''ارے نہیں بیٹا! سادہ پانی کیوں؟ میں لے کر آتی ہوں۔'' وہ سنی اَن سنی کرتے باہر نکل گئیں۔

دادی کے جانے کے بعد وہاں مکمل خاموشی چھا گئی۔ وہ جو سوچ رہی تھی کہ وہ اس موقع کو غنیمت جان کر ضرور اپنا حال دل کہہ ڈالے گا اور اس کا حال دل بھی جان لے گا مگر اس کے مسلسل خاموش رہنے پر زچ ہو رہی تھی۔ ایک بار خیال آیا کہ خود پوچھ لوں لیکن پھر سوچا کہ پہل تو اسے کرنی چاہیے۔

''رویے انسان کے جذبوں کی بڑی سچی اور کھری عکاسی کرتے ہیں۔'' دادی نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''میرے جذبے صادق ہیں اور وہ یقیناً اس سے بے خبر نہیں۔'' اس کے دل نے گواہی دی تھی۔ جن آنکھوں کے حصار میں وہ ابھی تھی ان ہی آنکھوں نے اسے کئی بار پیغام محبت دیا ہے۔ اس کی نظریں بے ساختہ دیوار پر لگے کلاک کی طرف اٹھ گئیں شاید وہ دادی کے آنے جانے کا حساب کر رہی تھی۔ اگر یہ آج بھی کچھ نہ بولا تو؟ اف اس کا دل بند ہونے لگا۔

''جذبوں کے اظہار کے لیے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے مجھے اس بات پر مکمل یقین تھا اور آج تم نے میرے یقین کو بالکل سچ ثابت کر دیا ہے۔'' اتنی گھمبیر اور روح میں اترتی ہوئی آواز۔'' اسے لگا اس کی سانس سانس میں امرت گھول دیا گیا ہے۔

''بہرحال پھر بھی ایک بار زبان سے اظہار کر کے میری اُلجھن کو سلجھا دو۔''

ارحم کی نگاہیں تو اس پر ٹھہری گئی تھیں اور وہ شرمائی لجائی سی اپنے آپ میں سمٹ رہی تھی۔

''ہمارے والدین کے آپس کے تعلقات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مجھے اجازت دو کہ میں امی کو تمہارے بارے میں بتا دوں۔ دھڑکنوں کا رقص شروع ہو گیا تھا۔

''وہاں جا کے یاد آیا کہ تازہ پھل اور دودھ فریج میں پڑا تھا اس بازاری جوس سے اچھا تھا میں ملک شیک بنا دیتی۔'' دادی کی آواز نے طلسم توڑا۔ وہ سیدھا فریج کی طرف گئی تھیں ورنہ اس کی یہ حالت دیکھ لیتیں تو نجانے کیا سوچتیں۔ اس نے کن انکھیوں سے دادی کی طرف دیکھا جوان دونوں کی طرف پشت کر کے کھڑی تھیں۔

ارحم جواب کا منتظر مضطرب و بے قرار تھا۔ وہ اس کی کیفیت دیکھ چکی تھی تب ہی ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''تم نے مجھ سے کیوں چھپایا؟'' دادی نے اسے اپنے ساتھ لگا کے پوچھا۔

اس نے عام سے انداز میں کہا۔
"وہی جو کل مجھے ارحم بتا کے گیا ہے۔"
دھک دھک دھک۔ دل میں جیسے ڈھول بجنے لگے۔ وہ جھینپ کے مزید دادی کے ساتھ ہوگئی۔
"تمہاری پھپھو کا فون آیا تھا تھوڑی دیر پہلے۔" دادی نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا؟" اس نے نظر اٹھا کے دادی کی طرف دیکھا۔
"میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔"
"پھر کیا کہا انہوں نے؟" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
"خفا ہو رہی تھی کہ اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا اور دوسرا۔" انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی تھی۔
"کیا دادی؟" وہ بے قرار ہوئی۔
"تمہارے والدین کا جو رویہ میرے اور تمہاری پھپھو کے ساتھ رہا ہے۔ بس اس کی وجہ سے وہ شش و پنج میں پڑی ہوئی تھی۔"
نہدیہ کی گلاب رنگت ایک پل میں پھیکی پڑ گئی تھی۔
"میں جانتی تھی دادی! کہ میرے والدین کا رویہ ہی میری خوشیوں میں حائل ہو کر رکاوٹ بن جائے گا۔" اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی "اور شاید ارحم کی خاموشی کی وجہ بھی یہی تھی وہ جانتا تھا کہ میرے ماں باپ کے سلوک کے پیش نظر پھپھو مجھے کبھی قبول نہیں کریں گی۔"
پلکیں آنسوؤں کا بوجھ نہیں سہار پائی تھیں اور وہ گالوں تک پھسل آئے تھے، دادی نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔
"لیکن میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے اور اسے بتا دیا ہے کہ نہدیہ میری بیٹی ہے، بہت معصوم اور صاف دل۔"
"پھر دادی؟" اس نے بے کل ہو کر پوچھا۔
"پھر یہ کہ اب تم اپنے ماں باپ کو منانے کی پیار سے اس کا گال تھپک کر کہا۔

☆☆☆

"امی، امی میرا دنبہ صبح سے چارا نہیں کھا رہا اور پانی بھی نہیں پی رہا۔" حسن کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"جاؤ عاصمہ! جا کے دیکھو تو ذرا۔" امی نے مشین پہ جھکے جھکے ہی چچی کو جانے کا کہا اور ساری لڑکیاں بھی ان کے ساتھ ہی باہر کو ہو لیں۔ تحریم نے دادی کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔
"دنبہ تو واقعی بیمار لگ رہا ہے۔" چاچی نے غور سے دیکھ کر کہا تو حسن رونے لگ گیا۔
"کچھ نہیں ہوتا، ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ سب اسے پچکارنے لگیں۔
دوپہر تک جب دنبے نے کچھ نہ کھایا تو حسن نے شور مچا دیا کہ "ابو کو فون کریں۔"
"واقعی پریشان کن بات ہے۔" ابو نے سن کر کہا اور دنبے کو دوا پلاتے رہے۔ ڈاکٹر کے کہنے پر اسپرائٹ بھی پلا دی مگر وہ ابھی تک کچھ کھا نہیں رہا تھا۔ دادی بار بار قرآنی سورتیں پڑھ کر دم کرتیں۔
شام سے پہلے دنبے نے ٹب سے پانی پینا شروع کر دیا تو سب نے سکھ کا سانس لیا پھر رات بھی سب باری باری اٹھ کر اسے دیکھنے جاتے رہے۔ لیکن صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔
حسن دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ ابو نے کتنا بہلایا مگر وہ کسی کی بات نہیں سمجھ رہا تھا۔
"ہمارے اٹھائیس ہزار بھی ضائع ہو گئے۔" امی کی آنکھیں بھر آئیں اور ہانی سب بھی اداس تھے۔
حسن نے ناشتہ نہیں کیا تھا وہ بار بار ضد کر رہا تھا کہ میرا دنبہ واپس لائیں۔ ابو نے بہت سمجھایا کہ دوسرا دنبہ بھی تمہارا ہے لیکن وہ دونوں بچے چونکہ پہلے دن ہی دنبوں کو اپنے اپنے نام کر چکے تھے اسی لیے وہ یہی کہہ رہا تھا کہ دوسرا دنبہ احمد کا ہے۔

یہ نہ ہو بچہ رو رو کے بیمار ہی ہو جائے۔'' چاچو نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔

''اور دنبہ کہاں سے لائیں گے اتنے پیسے بھی تو نہیں ہیں پاس۔'' ابو نے حساب کتاب لگا کے بتایا۔

''یہ لو حسن!'' دادی اپنے دنبے کو رسی سے کھینچ کر حسن تک لائیں۔ اور رسی حسن کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ امی، ابو اور چاچو چاچی سب نے نادم ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا شاید دادی سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ حسن ایک دم کھلکھلا اٹھا اور دادی سے لپٹ گیا تھا۔

☆☆☆

صبح عید تھی اور رات ہی انہیں کئی کام نپٹانے تھے، خوشی خوشی وہ ادھر سے ادھر گھومتی پھر رہی تھیں۔ امی اور خالہ چاچی ہرا مسالا اور لہسن لے کر بیٹھ گئی تھیں کہ ایک ہی دفعہ تیار کر کے رکھ لیں پھر صبح آسانی رہے گی۔''

نادیہ اور ردا مختلف میوے کاٹ رہی تھیں تاکہ کھیر بنا کے فریج میں رکھ دیں، تحریم اور عدن تو کپڑے جوتے، چوڑیاں، جیولری پھیلائے بیٹھی تھیں امی ان کا شوق دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

''بس کرو دو آپ لوگ کیا سارے زمانے کے لیے کھیر بناؤ گی۔'' جب وہ کافی دیر کچن سے نہ نکلیں تو تحریم کو خود آنا پڑا۔

''محترمہ آج تین قسم کی کھیر بنا رہی ہے تو ٹائم تو لگنا تھا نا۔'' ردا نے نہدیہ کی طرف اشارہ کیا جو جواباً مسکرا دی۔

ابو چاچو تو سو چکے تھے اور امی چاچی بھی کام سمیٹ کر چلی گئی تھیں۔ ان دونوں نے بھی کھیر کے پیالے فریج میں رکھے اور باہر آ گئیں۔ عدن اور تحریم نے سارے کپڑے استری کر کے الماری میں لٹکا دیے تھے۔

''چلو، یہ کام بھی ہوا۔'' نہدیہ نے شکر یہ ادا کیا۔

''چلو، اب مجھے مہندی لگا دو۔'' تحریم نے ردا کو یاد دلایا۔ ''اچھا بابا لگاتی ہوں۔''

اس نے دل کھول کر سنگھار کیا تھا۔ دادی نے چپکے سے کل ہی اسے آج کا پروگرام بتا دیا تھا۔ وہ سب دادی کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھ گئیں اور سب سے خوش کن بات یہ ہوئی کہ ابو چاچو، چاچی اور امی بھی دادی کے کمرے میں آ کر ان سے لپٹ گئے تھے۔ دادی کی آنکھوں میں اترتی نمی اس بات کی شاہد تھی کہ کوئی انسان چاہے کتنا بھی مضبوط ہو لیکن اولاد کی محبت کے آگے کمزور پڑ جاتا ہے۔

''آپ ہمارے سلوک کے بدلے میں جو پیار ہماری اولاد سے کرتی ہیں یہی ایک ماں کی خالص محبت کا ثبوت ہے۔'' چاچی خالہ نے صاف گوئی کا

پکاؤں گی۔"

"ارے واہ اماں! آپ نے تو میرے دل کی بات کی ہے۔" ابو بھی دور بیٹھے داد دینے لگے۔

گوشت کی تقسیم کا مرحلہ بھی انجام کو پہنچ چکا تھا اور نہدیہ کی منتظر نگاہیں گیٹ پر جا ٹھہری تھیں۔ وہ بار بار کلاک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو نائم دادی نے بتایا تھا اس کے مطابق تو اب تک انہیں آ جانا چاہیے تھا۔

عین اسی لمحے پھوپھو سامان سے لدی پھندی گیٹ سے داخل ہوئی تھیں۔

"پھوپھو؟" سب لڑکیاں حیرت و مسرت سے پھوپھو کو چمٹ گئی تھیں پیچھے پھوپھا زین۔ دعا "اور" اس نے باہر تک دیکھا تھا۔

"باہر ہی گاڑی پارک کر دو ارحم! صحن میں ابھی بہت دھوپ ہے۔" پھوپھا کی بات سن کر اس کے مضطرب دل کو قرار آیا تھا۔

پھوپھو گھر کے ماحول میں اتنا بدلاؤ دیکھ کر سیر ہو رہی تھیں پھوپھو نے سب لڑکیوں کو گفٹ دیے تھے جس پر ابو نے انہیں اچھا خاصا ڈانٹا تھا۔

"بھئی ہم تمہیں دیتے ہی کیا ہیں جو تم یہ سب اٹھا لائی ہو۔"

"ارے بھئی پریشانی کیا ہے آج اگلے پچھلے حساب چکا دیں۔" امی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

سب خواتین نے مل کر جلدی جلدی کھانے کا انتظام کیا۔

☆☆☆

"نگہت کی آمد نے تو اس عید کی خوشیوں کو مزید دوبالا کر دیا ہے۔ کتنے عرصے بعد اکٹھے بیٹھ کر بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے۔"

بڑے کمرے میں محفل کشت و زعفران جمی تھی۔

"مجھے آپ لوگوں سے ایک بہت ہی ضروری بات بھی کرنی ہے۔" کافی دیر بعد جب بچے ادھر ادھر کھسکے تو پھپھو مدعا پر آ گئیں۔

"بھئی آج عید کا دن ہے خوشیوں بھری میٹھی میٹھی باتیں کرو۔ ایسی جذباتی باتیں کر کے ماحول کو نمکین مت کرو۔"

ابو کی بات پر سب ہنس پڑے تھے لیکن نمکین ماحول والی بات پلے نہیں پڑی تھی۔ ابو اور چاچو نے اپنے اپنے والٹ نکالے تھے۔ ردا اور عدن نے نہدیہ کے اشارے پر باہر کو دوڑ لگا دی تھی۔

"رہنے دو بیٹا جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لوگوں کا ہی ہے۔" دادی بیٹوں سے عیدی لینے سے جھجک رہی تھیں لیکن سب نے اتنا اصرار کیا کہ انہیں پکڑتے ہی بنی لیکن ہکا بکا تو سب تب ہوئے جب چاروں پوتیوں نے بڑے فریم سے اتاری جہاں ایک تصویر نمایاں تھی۔ اتارا۔

دادی اور دادا کی غالباً شادی کی تصویر تھی۔ دادی نے اتنے پیارے گفٹ پر پوتیوں کا شکریہ ادا کیا۔

"ویسے یہ تصویر آئی کہاں سے میرا مطلب ہے یہ بنوائی کب؟" امی کے اندر کی تھانیدارنی عادت سے مجبور تفتیش پر اتر آئی۔

"وہ اس دن اپنی پاسپورٹ سائز تصویر بنوانے کے بہانے میں چاچو کے ساتھ گئی تھی۔"

نہدیہ نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو چاچو نے پیار سے ایک چپت اسے لگائی۔ اسی لمحے قصائیوں نے آ کر دھڑا دھڑ گیٹ پیٹنا شروع کر دیا تو سب ہی باہر کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

قربانی اور اس کے بعد گوشت کی تقسیم کا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ صد شکر کہ حسن اور احمد نے دنبے قربان ہوتے دیکھ کر رونا پیٹنا نہیں ڈالا تھا۔

"اماں! آپ آئیں اور گوشت تقسیم کریں۔"

امی نے یہ کہہ کر گویا دادی کا مان بڑھا دیا تھا۔

"چلو بھئی عاصمہ تم جلدی سے کلیجی پکاؤ تب تک میٹھی کھیر کھا کھا کے اب تو سر چکرانا شروع ہو گیا ہے۔" چاچو کی بات پر سب ہنس پڑے۔

ہاں ہاں ہو۔" ابو امی کے تاثر سے اک دوسرے کو دیکھا۔

جب سے ارحم کی نوکری لگی ہے خاندان اور دور پار سے بہت ہی اچھے ایک سے بڑھ کر ایک رشتے آ رہے ہیں۔ لیکن میری مرضی اور اماں کی خواہش ہے کہ..... میں نہدیہ کو اپنی بہو بناؤں۔"

پھوپھو نے بہت سیدھے سادے اندازے میں رشتہ ڈال دیا تھا۔

"آپ لوگ آپس میں صلاح مشورہ کرلیں تو پھر بتا دیجیے گا۔" پھوپھا نے بڑے مدبر انداز میں کہا۔

"لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیے گا کہ اس میں ہمارے بچوں کی مرضی بھی شامل ہے۔" پھوپھو نے صاف بات کی۔

امی ابو تو جیسے کسی شادی مرگ کی سی کیفیت میں تھے۔ ارحم جیسا خوب صورت اور پڑھا لکھا لڑکا ان کا داماد بن جائے تو انہیں اور کیا چاہیے تھا۔

وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑی تھی اس کا تمام تر وجود سماعت بن چکا تھا۔

آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس کی قسمت کی ڈور اس کے ماں باپ کے ہاتھ میں تھی جو نجانے پھپھو کو کوئی جواب کیوں نہیں دے رہے تھے۔

دل میں گھبراہٹ تھی اور لبوں پر دعا۔

"چور۔" کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ وہ بری طرح چونک کر پیچھے ہٹی تھی۔ ارحم اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ بھی اندر کمرے میں ہوگا۔

"کک..... کیا چوری کی میں نے؟" اس کی نگاہوں کی حدت سے شرمائی گھبرائی نہدیہ کی آواز بمشکل ارحم کو سنائی دی تھی۔

"دوسروں کی باتیں چپکے چپکے سننا کتنی بڑی چوری ہے؟" اس کی حالت سے محظوظ ہوتا وہ اس کے اور قریب ہوا تھا اور وہ وہاں سے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی جو کہ بہت مشکل تھا کیونکہ ارحم نے ایک ہاتھ دیوار پر اور دوسرا دروازے پر رکھ کر گویا اس کے گرد حصار بنا لیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرا رہی تھی کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔

"چور۔" ارحم نے پھر سرگوشی کر کے اسے چھیڑا۔

"جو چوری آپ نے کی وہ؟" اس نے عالم بے خودی میں کہا۔

"کون سی چوری؟" گمبھیر آواز نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"دل چرانے کی۔" اس نے جھکی نظروں سے ہی کہا۔ ارحم نے اس کے چہرے پر کئی رنگ دیکھے تھے شرم و حیا کے۔ گھبراہٹ کے، مسرت و شادمانی کے۔

"وہ تو ہم دونوں نے کی تھی۔" اس نے زیر لب مسکرا کر کہتے ہوئے اپنا ہاتھ دروازے سے ہٹا کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اٹھتی گرتی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

کمرے سے مبارک باد کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس نے اپنا مہندی لگا خوب صورت ہاتھ ارحم کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

☆

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

تنزیلہ ریاض

نورُالقلوب

نور القلوب ایک ایسا ادارہ جہاں صندل بی لوگوں کے لیے دعا کرتی تھیں، لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ وہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔

بٹ گرام میں بنی ہری حویلی میں وہ اپنے باپ اور گلے جو اس کی سوتیلی ماں تھی سے ملنے چھٹیوں میں آتا ہے۔ گلے اس کی خالہ تھی جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد انتہائی کم عمری میں اس کے باپ سے بیاہی گئی تھی۔

خوشل اپنے باپ کی نسبت گلے سے زیادہ قریب تھا۔

داؤد بروکن فیملی کا بچہ تھا جو انتہائی موٹا تھا اس کے وزن کی وجہ سے سب اسے تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروالیا تھا وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں۔

گلے کی اداسی دیکھ کر اسے لگا اس کا باپ شادی کر رہا ہے۔ وہ ان سے سخت ناراض تھا۔

اس کا دوست اسے بتاتا ہے کہ لاریب نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔

آدھی رات کو ہری حویلی میں کھٹر پٹر سن کر وہ باہر نکلتا ہے تو اپنے باپ کے ساتھ لاریب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

خوشل لاریب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ارباب کو فون کرتا ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کرتا۔

رفیق کے صاحب اس سے کہتے ہیں کہ لاریب کی تمام تصاویر ان کے گھر سے ہٹا دی جائیں ان کے گھر میں لاریب کا چیپٹر بند ہو جاتا ہے۔

مہر افروز ان کے گروپ میں شامل ہوجاتی ہے داؤد کو لگتا ہے کہ وہ ان کے گروپ کی لڑکیوں میں سب سے خوب صورت ہے۔ فرمان کی اس سے نہیں بنتی۔

خوشل گلے سے کہتا ہے کہ لاریب کو فوراً واپس بھیجو، اسے لگتا ہے کہ وہ اسی چوٹی پر بیٹھا ہے جہاں سے لاریب نے اسے دھکا دیا تھا۔

خان بابا خوشل خان کو بتاتے ہیں کہ اس کا نکاح لاریب سے ہورہا ہے۔

خوشل کو یاد آتا ہے کہ لاریب ڈر گزلیتی ہے، وہ غصے میں جب لاریب کے پاس آتا ہے تو منہ دکھائی میں سگریٹ دیتا ہے جسے دیکھ کر لاریب کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔

خوشل ہاسپٹل پہنچا تو ارباب اس کا رویہ دیکھ کر اسے تنگ کرتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے کہ جب تک خوشل اسے بتائے گا نہیں اسے کیسے پتا چلے گا۔ خوشل رونے لگتا ہے اور پھر لاریب سے نکاح کا بتاتا ہے۔

مہر افروز، داؤد پر حاوی ہوجاتی ہے۔ داؤد کی ممی اس سے چڑنے لگتی ہے۔ وہ اس کے کہنے پر لندن چلا جاتا ہے۔ ممی اسے جرمنی بھیجنا چاہتی ہیں۔

مہر اس سلسلے میں داؤد کو مطمئن کردیتی ہے اور اس کی ممی کو بھی قائل کرلیتی ہے۔

ناشتے پر گلے احتجاج نہیں آتی ہیں۔ خان بابا بیوی کا مزاج سمجھتے ہیں، وہ اسے مناتے ہیں۔

زہرہ کو ہری حویلی والوں میں دلچسپی ہے۔ تائی شاہدہ اسے سمجھاتی ہیں۔

خان بابا لاریب کے خاندان سے اپنے تعلق کے بارے میں گلے کو بتاتے ہیں کہ کس طرح خان بابا یعنی حبیب اللہ اس گھر میں پہنچتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ آج وہ جو کچھ ہیں ان کی ہی وجہ سے ہے۔

شیریں اور داؤد کی شادی طے ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی شادی کو لے کر بہت پرجوش ہے۔ داؤد کی امی چڑتی ہیں۔ داؤد اس سے اسکائپ پر بات کررہا تھا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر جاتا ہے۔

حبیب اللہ اور شیریں گاڑی ٹھونکنے کے جرم میں خلیق صاحب کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں پر جامہ عائد کرتے ہیں۔ شیریں اس کے باوجود باز نہیں آتی اور حبیب اللہ کو بھی ساتھ شامل کرتی ہے بالآخر وہ گاڑی کچھ کچھ چلانا سیکھ ہی جاتی ہے۔ دونوں اب اس کو انجوائے کرتے ہیں۔ حبیب اللہ گلے کو ساری کہانی سناتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ اسے پہلے ہی پتا تھا کہ خان کے دل میں اس کی جگہ دوسرے نمبر پر ہے لیکن وہ پہلے نمبر پر اپنی مرحومہ بہن کو سمجھتی تھی لیکن وہ سیریس بھی۔ خان انکار کرنا چاہتے ہیں۔

زہرہ کی آنکھوں میں ہری حویلی سے آنے والا بسا ہوا تھا۔ صندل بھی کہتی ہیں کہ بہت دن ہوگئے ہری حویلی سے کوئی نہیں آیا۔ میرا فون لاؤ، میں فون کرکے خیریت معلوم کروں۔

مہر داؤد کے پاس لندن پہنچ جاتی ہے۔ داؤد اپنی ممی کو فون کرتا ہے اور مہر سے بات کرواتا ہے، وہ اسے ڈانٹ دیتی ہیں اور داؤد سے کہتی ہیں کہ وہ واپس آجائے۔ مہر سے بچے اور مہر کے اس کے پاس ہونے پر داؤد سے بھی ناراض ہوجاتی ہیں۔ داؤد فون بند کردیتا ہے۔ وہ اسے پکارتی رہ جاتی ہیں۔

وہ مہر کو منانے آتا ہے اور ممی کو منانے کا کہتا ہے۔

داؤد اپنی فیملی کو فون کرتا ہے۔ وہ اسے اپنی قربانیاں بتاتی ہیں۔ مہر کہتی ہے کہ وہ دونوں مل کر انہیں منالیں گے۔

داؤد روتا ہے، اسے اپنی ممی کی قربانیاں خود پر ظلم لگتی ہیں۔ وہ مہر سے کہتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرلے، کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ مان جاتی ہے۔

کورٹ میں فارم فل کرتے ہوئے داؤد کو پتا چلتا کہ میرا افروز کا اصل نام شیریں خلیق ہے۔

ہے۔

مہر داؤد سے اس شادی کو سب سے چھپانے کا کہتی ہے اور ماڈلنگ کے لیے دبئی چلی جاتی ہے۔ داؤد اسے روک نہیں پاتا۔

مہر اپنے ٹارگٹ کے بارے میں داؤد کو بتاتی ہے کہ وہ تیس سال کی عمر سے پہلے بہت کامیاب عورت بننا چاہتی ہے، سب کچھ حاصل کرنا چاہتی ہے۔

مہر کے والدین داؤد کی ممی سے مل کر تعلقات بحال کراتے ہیں۔

مہر پریگنٹ ہو جاتی ہے۔ داؤد کی ممی بہت خوش ہوتی ہیں۔ مہر کو لگتا ہے یہ داؤد کی ممی کے تعویذ کی وجہ سے ہوا ہے۔

خان گلے کو مہر کی کہانی سناتے ہیں۔ ارباب، خوشل سے کہتا ہے کہ وہ کتنا سوگ منائے گا۔ خوشل سوچتا ہے کہ صندل بی اس کی مدد کر سکتی ہیں۔

لاریب کمرے میں نہیں۔ گلے پریشان ہوتی ہے۔ لاریب خان کے پالتو کتوں کے پاس ہوتی ہے۔ گلے سوچتی ہے یہ حویلی کی بہو نہیں بن سکتی۔

آٹھویں قسط

''ان کے قریب مت جائیں۔ یہ خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔'' وراثت نے اس کا اشتیاق دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

وہ بہت پُرجوش ہو کر کتوں کی جانب بڑھی تھی لیکن وہ ان کے لیے انجان تھی اس لیے وہ ناک پھلا کر بھونکنے کی تیاری کرنے لگے تھے۔ وہ ڈری نہ گھبرائی تھی بلکہ اطمینان سے انہیں پچکارتے ہوئے وہ ان کے قریب ہونے لگی۔

''کم آن۔ وی کین بی فرینڈز۔''

وہ ان میں سے ایک ایک کو چھو کر دیکھنا چاہتی تھی لیکن کتے تعاون پر تیار نہیں تھے اور ان کے بھونکنے کی شدت دھیرے دھیرے بڑھنے لگی تھی۔ حویلی ان کی آوازوں سے گونج اٹھی تھی۔ وراثت اسی کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ اب مدد کے لیے اس کی جانب دیکھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وراثت کو حیرت ہوئی، وہ کتوں سے خوف زدہ نہیں تھی اور نہ ہی ان سے خار کھا رہی تھی بلکہ مسلسل انہیں انگریزی میں مخاطب کر کے پچکارتی چلی جا رہی تھی۔ کتے بھی اس کو اس درجہ مائل بہ کرم دیکھ کر دھیرے دھیرے نرم پڑنے لگے۔ ان کی بھونکنے کی شدت کم ہونے لگی تھی۔ وراثت ذرا سا آگے بڑھا اور ایک کتے کے قریب بیٹھ کر اس کی گردن سہلانے لگا۔

''آپ کو کتوں سے بہت محبت ہے؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

اس نے بہت احتیاط سے جملہ ترتیب دیا تھا کہ کہیں خان کی مہمان کو بُرا نہ لگ جائے۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر اسی کی طرح بیٹھ کر ایک کتے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر سہلایا تھا۔ وراثت پھر ذرا سا مسکرایا کیونکہ وہ جانتا تھا، یہ کسی بھی کتے کو رام کرنے کا پہلا طریقہ ہے۔ خان کی مہمان یقیناً کتوں کے ساتھ ساتھ اس کو بھی بغور دیکھ رہی تھی۔

''بہت زیادہ۔ میں نے ان سے زیادہ کسی کو مہربان نہیں دیکھا۔'' وہ بولی تھی۔

وراثت نے ایک نظر حویلی کے کمروں کی کھڑکیوں سے جھانکتی روشنی کو دیکھا۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا پھر اس نے دوبارہ مہمان کی جانب دیکھا۔

''وہ کیسے؟''

''یہ آپ کا پردہ رکھتے ہیں۔ آپ کے راز فاش نہیں کرتے۔ آپ ان کو جو مرضی کہہ لیں، یہ پلٹ کر جواب

نہیں دیتے۔اور.....'' وہ لمحہ بھر کو رکی پھر اس کے ذرا سا قریب ہو کر بولی۔
''یہ آپ کی بات کا بُرا بھی نہیں مانتے۔آپ سے ناراض نہیں ہوتے۔'' وراثت اب کی بار کھل کر مسکرایا
''وہ کیسے؟'' وہ پھر وہی سوال پوچھ رہا تھا جو پہلے پوچھا تھا۔لاریب نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر نہایت سخت لہجے میں گالی دینے والے انداز میں بولی۔
''وراثت! تم کتے ہو۔'' وراثت کو خفیف سا جھٹکا لگا۔اس نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا، اس کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے۔
''بُرا لگا نا؟'' وہ اس سے پوچھ رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، کہنے لگی۔
''اب ذرا اس کتے کو کتا کہہ کر دیکھتے ہیں۔مجال ہے اسے بُرا لگے۔'' وراثت کی اب سمجھ میں آیا کہ اس نے اسے گالی دے کر کیا سمجھانا چاہا تھا۔
''بس اسی لیے اچھے لگتے ہیں مجھے..... کتے..... فضول قسم کے نخرے نہیں کرتے۔خواہ مخواہ کی بے تکلفی بھی نہیں دکھاتے۔اور کتا کہہ لو تو ناراض بھی نہیں ہوتے۔''
وراثت کو بالکل اندازہ نہیں ہوا، وہ یہ باتیں ذو معنی انداز میں کہہ رہی ہے یا اسے اسی طرح بات کرنے کی عادت ہے۔
''ہو سکتا ہے ان کی زبان میں لفظ ''انسان'' گالی کے طور پر رائج ہو۔یہ ایک دوسرے کو۔یہی کہہ کر غصہ دلاتے ہوں۔اور ''انسان'' کہے جانے پر انہیں برا لگتا ہو۔ذرا انہیں بھی انسان کہہ کر دیکھیں۔'' وہ سادہ سے انداز میں بولا تھا لیکن لاریب ہنس پڑی۔
''ہاں۔یہ بھی ہو سکتا ہے۔لیکن ہم ابھی یہ سوشل ایکسپیریمنٹ نہیں کریں گے۔تب تک مجھے اپنی اسی تیموری کے ساتھ خوش رہنے دو کہ کتے اس لیے اچھے ہوتے ہیں کہ وہ بُرا نہیں مانتے، وہ ناراض نہیں ہوتے۔''
وراثت کو پہلی بار اس کے چہرے پر عجیب سی سختی نظر آئی تھی۔وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش رہا کہ بہر حال ملازم تھا جبکہ لاریب اسی کتے کی گردن پھر سہلانے لگی تھی جس کی پہلے بھی سہلا چکی تھی۔وہ کتا اب اس کے اردگرد دوستانہ سے انداز میں گھوم رہا تھا۔وہ بھی لاپروا انداز میں گھاس پر اطمینان سے بیٹھ کر اس ساری صورت حال کا لطف اٹھانے لگی تھی۔

☆☆☆

رات گئے اپنے بستر پر لیٹ کر بھی وراثت اس لڑکی کے چہرے کو ذہن سے محو نہیں کر پا رہا تھا۔یہ اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا کہ حویلی میں اس سے اتنی بات کرنے والی کوئی خاتون مہمان آئی تھی۔گلے بھی اس سے بات کر لیا کرتی تھی لیکن ان کے درمیان زیادہ تر گفتگو ایسے ہی ہوتی تھی جیسے مالک اور ملازم کے درمیان ہوتی ہے۔اتنی بے تکلفی سے صرف خوشل خان ان سے باتیں کرتا تھا۔گھر کے ملازمین میں مالک کے متعلق معلومات رکھنے میں ڈرائیورز سب سے پہلے نمبر پر آتے ہیں۔
وراثت کو بھی خان اور اس کے خاندان کے متعلق کافی کچھ پتا تھا۔بہت سے رشتہ داروں کے گھروں اور ان کے فون نمبرز بھی اسے پتا تھے۔وہ خواتین کو مخاطب نہیں کرتا تھا لیکن اسے ان کے ناموں سے واقفیت تھی۔وہ پہلے سے جانتا تھا، لاریب کون تھی۔وہ اس کے باپ کے نام سے بھی واقف تھا۔اسے اس بات کی بھی سن گن تھی کہ یہ لڑکی کسی غلط قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔اس نے حبیب اللہ خان کو اس لڑکی کی وجہ سے کئی بار پریشان بھی دیکھا تھا لیکن پھر بھی وہ ایک پہیلی تھی اور وراثت کا دل شدت سے چاہنے لگا تھا کہ وہ اس پہیلی کو سلجھائے۔
اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے اس نے اپنے چھوٹے بھائی کے بستر کی جانب دیکھا۔رحمت سویا ہوا نہیں

پر بھروسا کرتی تھی۔ اسے کام کے تحت حویلی کے اندر آنے جانے کی اجازت بھی مل جاتی تھی۔

''رحمت خان۔ اور حمت خان۔'' اس نے اسے مخاطب کیا تھا۔

''رحمت خاناں۔ یہ جو حویلی میں نئی مہمان آئی ہے۔ یہ کون ہے؟'' اس کے بھائی نے ادھ کھلی آنکھوں سے حیرانی اور استفہام میں گھر کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ لوگ حویلی اور اس کی خواتین مکین کے متعلق کم ہی بات کرتے تھے۔ وراثت رعب قائم رکھنے کو رحمت کے ساتھ نا صرف کافی دبدبے سے بات کرتا تھا بلکہ بات ہی کم کرتا تھا۔ اسی لیے رحمت کے چہرے پر اچنبھے کی کیفیت چمکنے لگی تھی جسے وراثت نے فوراً بھانپ لیا تھا۔

''وہ تمہیں زیادہ ڈانٹتی تو نہیں۔ وہ کافی سخت مزاج لگتی ہے۔ اگر تمہیں ڈانٹے یا سختی سے بات کرے تو مجھے بتانا۔ میں خان سے بات کروں گا۔ حویلی کے ملازم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہم عورتوں کی ڈانٹ بھی برداشت کریں۔''

اس نے فوراً بات بنائی تھی۔ رحمت نے سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں۔ وہ تو مجھ سے بات ہی نہیں کرتی۔ چپ رہتی ہے۔'' وراثت نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ رحمت بھی خاموش لیٹا رہا۔ وراثت کو پھر لیٹے لیٹے کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس نے رحمت کی جانب دیکھا۔ اب کی بار وہ گہری نیند میں محسوس ہوتا تھا۔ وراثت دھیرے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دروزے کے پیچھے لگے کیل پر لٹکے اپنے کپڑوں میں سے کچھ لینے لگا۔ چند لمحوں بعد اس کا والٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اس کو کھول کر اس کے اندر سے ایک تڑا مڑا سا کاغذ نکالا تھا۔ وہ کسی عورت کے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تھی۔ خان نے چند دن پہلے کہیں جاتے ہوئے یہ کاپی اسی سے کروائی تھی۔ وراثت سیاہی مائل تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔ اپنے حلیے سے ماڈرن سی نظر آنے والی اس خاتون کے چہرے میں حویلی کی مہمان کی شباہت تھی۔ وراثت نے اس کاغذ کے ٹکڑے کو پلٹا تھا اور پھر اس پر لکھا نام پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

''شیریں خلیق محمد۔'' وہ خان کے رشتہ داروں میں ایسے کسی نام کی خاتون سے واقف نہیں تھا۔

☆☆☆

''اَنا تحبک'' یہ دو الفاظ نہیں تھے یہ کسی کی پوری زندگی تھی جو اس وقت ایک گولڈ پینڈینٹ کی صورت میں شیریں خلیق محمد عرف مہر افروز کی ہتھیلی پر پڑی جگمگا رہی تھی۔ داؤد نے اس کے لیے کسٹمائزڈ گولڈ پینڈینٹ بنوایا تھا۔ ان دو الفاظ میں موجود تینوں نقطوں کی جگہ ہیرے جڑے تھے۔ یہ آرٹیکل خوبصورت اور قیمتی تھا لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے ڈیزائن داؤد نے خود کیا تھا۔ دبئی کی ایک جیولری آرٹسٹ ایسے کسٹمائزڈ آرٹیکلز تیار کرتی تھی جن کے ڈیزائن بنوانے والے خود لکھ کر دیتے تھے۔ شیریں بالکل نہیں جانتی تھی کہ داؤد اس کو منہ دکھائی میں کیا دینے والا ہے۔ وہ اگرچہ اسے تحفے تحائف دیتا رہتا تھا لیکن یہ باقاعدہ ''منہ دکھائی'' پینڈنگ تھی جس کے لیے داؤد کافی عرصہ سے سوچ بچار کر رہا تھا جبکہ وہ بھی بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ اسے صرف اندازہ تھا کہ وہ جیولری یا گھڑی وغیرہ جیسی کوئی چیز خریدے گا۔

وہ بارہا اس سے کہہ چکا تھا کہ اسے خواتین کے لیے گفٹس خریدنے کا تجربہ نہیں رہا اور وہ ڈرتا ہے کہ اس کی خریدی ہوئی کوئی چیز شیریں کے شایانِ شان نہیں ہوگی۔ وہ پہلے بھی شیریں کو تمام اہم ایونٹس پر ساتھ لے جا کر اسی کی پسند کی ہوئی چیز دلوا دینے کا عادی تھا۔ اسی لیے ہاتھ سے کی گئی سادہ سی کیلی گرافی والا یہ کسٹمائزڈ پینڈینٹ اسے بے حد خوب صورت لگا اگرچہ کیلی گرافی کے حساب سے وہ کام بالکل بھی عمدہ نہیں تھا لیکن وہ الفاظ داؤد نے خود لکھے تھے۔ یہ بات بہت اہم تھی۔ اسے اردو یا عربی رسم الخط لکھنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اردو کا کوئی ایک لفظ بھی لکھتے ہوئے کئی مرتبہ سوچتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیریں کے لیے یہ کسٹمائزڈ پینڈینٹ بہت قیمتی اور اہم تھا۔

ان کی شادی کا وہ ریسیپشن جس کی تیاریاں وہ دن رات کر رہی تھی بالکل سادگی سے دے دیا گیا تھا۔ موسیقی، پھول، رنگ، خوشبو، انسانوں اور ان کی نمود و نمائش سے عاری اس ریسیپشن میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس کی منصوبہ بندی وہ اتنے دنوں سے کر رہی تھی لیکن اسے جیسے پروا بھی نہ رہی تھی۔ وہ سادہ ترین لباس میں اپنے گھر سے داؤد کے گھر منتقل ہوگئی تھی لیکن داؤد نے اس کے استقبال میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ واقعی اسے کسی ملکہ سے کم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے الفاظ ہی نہیں انداز بھی اس کے سرشار دل کی مسرور کیفیت خوب عیاں کر رہے تھے۔

''مائی گاڈ۔ ترس گیا تھا یہ مسکراہٹ دیکھنے کو۔ اگر مجھے پتا ہوتا یہ تمہیں مسکرانے پر مجبور کردے گا تو میں یہ پہلے ہی تمہیں دے دیتا۔'' وہ بولا تھا۔ وہ مزید مسکرائی اور ہتھیلی پر پڑے پینڈنٹ کو مزید ستائشی انداز میں دیکھا۔

''یہ بہت خوب صورت ہے داؤد۔'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن داؤد نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''اس زمین پر فی الوقت اس مسکراہٹ سے خوب صورت کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے، تم کتنی صدیوں کے بعد مسکرائی ہو؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

شیریں نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی مسکراہٹ تھی مگر اب کی بار اس مسکراہٹ میں عجیب سی لاچاری تھی جیسے گزشتہ دو ہفتوں میں ہونے والے واقعات کو بھول جانا چاہتی ہو۔ چشم تصور میں گلاب کے سرخ پھولوں سے سجا، خوشبوؤں میں بسا اس کا کمرہ یکدم اسپتال کے کمرے میں بدلنے لگا تھا۔

''دو سو صدیاں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں واقعی دو سو صدیوں بعد اس مسکراہٹ کو دیکھ سکتا ہوں۔ محسوس کر سکتا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے۔ میں آج زندہ ہو گیا ہوں۔''

داؤد نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ خاموش رہی لیکن اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہونے لگی تھی۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ داؤد اس سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کر رہا تھا یا اسے سراہ رہا تھا۔ شیریں اس کے منہ سے ایسی باتیں سنتے رہنے کی عادی تھی لیکن اسے ایسی باتیں بہت متاثر نہیں کرتی تھیں۔ وہ اپنی ذات کے متعلق اس قدر پُراعتماد تھی کہ اسے ہمیشہ لگتا تھا وہ چاہے جانے کے لیے ہی پیدا کی گئی ہے تو اگر داؤد اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا ہے تو اسے ملانے ہی چاہئیں۔ شیریں علیق محمد یہ سب ڈیزرو کرتی تھی مگر چند دن کی بیماری نے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ انسان کو جب پانی کے بلبلے سے مشابہت دی جاتی ہے تو اس کا حقیقی مطلب کیا ہوتا ہے۔

گزشتہ دو ہفتے اس کی زندگی کے بے حد تکلیف دہ دن تھے۔ ان دو ہفتوں نے اسے اس کی اوقات بہت اچھی طرح سے سمجھا دی تھی۔ دو ہفتوں میں اس کے وجود میں ہی نہیں اس کے رویے میں بھی بے پناہ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ڈاکٹرز کہتے تھے جو پیراسائٹ اس کے دماغ میں پل رہا ہے، اس کی جسامت کافی چھوٹی ہے۔ وہ اسے ایک انسانی بال کے دسویں حصے سے مشابہہ قرار دیتے تھے لیکن اس چھوٹی سی چیز نے اس کے اتنے بڑے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ زلزلہ آ جانے سے جیسے زمین اتھل پتھل ہو جایا کرتی ہے، اس کی پوری زندگی ایسے ہی اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کا علاج شروع ہو چکا تھا۔ اسٹیرائیڈز کی ہائی ڈوز اسے استعمال کروائی جا رہی تھیں جس کے الگ سے کافی مضر اثرات تھے۔ شیریں نے کئی سال لگا کر جس حسن کو اس درجہ سنوارا نکھارا تھا وہ دو ہفتوں میں ڈھل گیا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے چمکنے لگے تھے۔ اس کی کلائیوں پر انجیکشنز لگتے رہنے کی وجہ سے نیلے نیلے دھبے نظر آنے لگے تھے۔ وہ پہچانی نہیں جاتی تھی لیکن پھر بھی اس کے سامنے بیٹھا اس کا

تھا، جیسے اس کے دماغ میں کوئی ننھا سا پیراسائٹ نہیں ہے بلکہ ایک دیو ہیکل عفریت ہے جو یک دم دوبارہ سے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ وہ اس خوف سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ داؤد کے الفاظ اس کی سماعتوں میں جذب ہو جانے کے بجائے اِدھر اُدھر پنگ پانگ کی طرح اُچھلنے لگے تھے۔ وہ اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی لیکن اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے ہمت کر کے اس کے الفاظ کی جانب توجہ دی تھی۔

''تمہیں کھو دینے کا تصور جان لیوا تھا مہر! میں ڈر گیا تھا مہر۔ بے حد ڈر گیا تھا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ شیریں کہنا چاہتی تھی۔

''میں ابھی بھی ڈری ہوئی ہوں داؤد! میرے لیے بھی یہ تصور جان لیوا ہے۔ میں بھی خود کو کھونا نہیں چاہتی۔ میں جو خود کو بہت بہادر سمجھتی تھی۔ موت کی ذرا سی آہٹ محسوس کرتے ہی ادھ موئی ہو گئی ہوں۔'' لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔ اس نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں داؤد کے کندھے سے سر ٹکا لیا تھا۔

☆☆☆

''مہر کیسی ہے اب؟'' وہ سرہانے میں منہ دیے سوئی جاگی کیفیت میں لیٹی تھی جب داؤد کی ممی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ داؤد نے جواب میں کچھ کہا تھا لیکن اس کی آواز مدھم تھی اس لیے وہ سمجھ نہ پائی تھی۔

''ایسا کب تک چلے گا داؤد۔ تم کب تک اس کی خاطر اس کمرے میں محدود رہو گے۔ تمہاری اپنی کوئی زندگی ہے یا نہیں۔ تمہارا آفس۔ تمہارے دوست احباب۔ تمہاری ماں۔ تمہیں اس عورت کے علاوہ کسی اور کا احساس ہے؟'' وہ اونچی آواز میں شکوہ کر رہی تھیں۔

داؤد نے پھر منمنا کر کوئی جواب دیا تھا جو اسے پھر سمجھ نہ آ سکا۔ اس کے بال اس کے چہرے پر بکھرے تھے اس لیے اس کی آنکھیں ان میں چھپی ہوئی تھیں۔ آنٹی کو احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ وہ چند لمحے اپنے بالوں کی آڑ سے ان ماں بیٹے کی جانب دیکھتی رہی پھر اس نے اکتا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن آنٹی مسلسل با آواز بلند بڑبڑا رہی تھیں۔

''مجھے بتاؤ، میں کیا کیا کروں۔ سب سے زیادہ تو میں مشکل میں آ گئی ہوں جسے نا صرف سارا گھر سنبھالنا پڑ رہا ہے بلکہ وہ بچی بھی دیکھنا پڑ رہی ہے جسے تم نے خود بھی طریقے سے نہیں دیکھا کیونکہ تمہیں اس عورت نے اتنی فرصت ہی نہیں دی۔'' داؤد نے انہیں دھیمی آواز میں پھر ٹوک دیا تھا۔

''ہم سب بھی ڈپریسڈ ہیں داؤد! ہم سب۔ ہماری زندگیاں بدل کر رہ گئی ہیں۔ لیکن ہم سب بھی تو خود کو کمپوز کر کے چل رہے ہیں نا۔ اسے بھی کہو، اٹھے بستر سے نکلے اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرے۔ یا پھر اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھاؤ۔ اس کے دماغ کا علاج کرواؤ۔ اس کا دماغ پہلے ہی قابو میں نہیں تھا۔ اب تو انفیکٹڈ ہو چکا ہے۔ اب تو دماغی کیفیت مزید آسمان پر ہو گی۔ لے جاؤ اسے کسی پاگلوں کے ڈاکٹر کے پاس۔ ورنہ یہ تمہیں بھی پاگل کر دے گی۔ تمہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی داؤد۔''

وہ چبا چبا کر بول رہی تھیں۔ شیریں سنتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا ایک بار بھی دل نہ چاہا تھا کہ بستر سے اٹھ کر انہیں کوئی جواب ہی دے دے۔ اس کی ان خاتون سے کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ جانتی تھی، وہ اسے پسند نہیں کرتیں اور دوسری طرف اس کے دل میں بھی ان کے لیے کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو برداشت کرتی آئی تھیں لیکن یہ پہلی بار ہوا تھا کہ شیریں کو ان پر ترس آیا تھا۔ وہ اسے حق بجانب لگی تھیں۔

داؤد انہیں کمرے سے باہر لے گیا تھا مگر ان کے الفاظ کمرے میں ہی رہ گئے تھے۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ ان کی ذمہ داریاں کافی بڑھ گئی تھیں۔ وہ ایک عرصہ سے اکیلی رہ رہی تھیں لیکن اب نا صرف داؤد ان کے ساتھ تھا بلکہ شیریں اور لاریب بھی آ گئی تھیں۔ ان کے شکوے پہلی بار شیریں کو درست لگے۔

''میں آپ کے لیے کیا کروں آنٹی! میں تو خود عجیب لاچاری میں گھری ہوں۔ میں نے خود بھی کب ایسی

زندگی کے بارے میں سوچا تھا۔ اس نے بے بسی میں گھر کر گروٹ بدلنا چاہی تھی۔ اسے ہر وقت بے پناہ ضرورت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ بستر سے نکل کر کرسی پر ہی بیٹھ جائے کجا کہ کمرے سے باہر نکل کر دنیا کا سامنا کرنا۔ اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھلکتے ترحم اور ہمدردی سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔

''میں تو زندگی کو ایک کامیاب عورت کی طرح گزارنا چاہتی تھی۔'' اپنے بستر پر چت لیٹے اس نے سوچا تھا۔

اس کے سارے سنہرے خواب اور اونچے عزائم ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور یہ سب اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تیسری بار شدید پینک اٹیک کی وجہ سے اسپتال لے جائی جا چکی تھی۔ اس کے خیالات پہلے عفریت کا روپ دھارے اس کے اردگرد رقص کرتے رہتے تھے لیکن آنٹی کی باتیں مزید الجھا دیتی تھیں۔

بستر پر چت لیٹے اس نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں کھول کر کمرے کی چھت کو دیکھا۔ ساری سوچیں ایک نقطے کی شکل میں ڈھل کر ایک چہرے میں بدل گئی تھیں۔ وہ چہرہ دھرے دھیرے نمایاں ہوا تھا۔ وہ اسی کا چہرہ تھا لیکن اسے لگا وہ اس کا چہرہ نہیں ہے۔

وہ چہرہ واقعی اس کا چہرہ نہیں تھا۔ وہ ایک تھکی ہوئی ناکام عورت کا چہرہ تھا اور اسے ناکام چہروں سے نفرت تھی۔ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ وہ خود سے بھاگ رہی تھی۔ وہ دنیا سے بھاگ رہی تھی۔

''میں زندگی کو ایک کامیاب عورت کی طرح گزارنا چاہتی ہوں۔ ایک ایسی کامیاب عورت جس کی زمانہ مثال دے۔''

یہ صرف ایک جملہ نہیں تھا، یہ اس کا مقصدِ حیات تھا اور اس مقصدِ حیات کو پانے کے لیے اس نے ہمیشہ سر توڑ کوشش کی تھی۔ اپنے عزائم کو پانے اور اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے ایک تیز رفتار ہوا کے بگولے کی طرح وہ ہمیشہ بھاگتی رہی تھی۔ اپنے من پسند کھانے کو چھوڑنے سے لے کر اپنی پیدا کی ہوئی اولاد سے دور رہنے تک اس نے کئی ایک چھوٹی بڑی قربانیاں دی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ایک بہترین فیشن ماڈل تھی۔ ریمپ پر اس کی واک کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے کریڈٹ پر کئی ایک بڑے برانڈز کے نام تھے جن کی نشہیر وہ کرتی تھی۔ زیورات و ملبوسات سے لے کر میک اپ اور پرفیومری تک وہ بے شمار انٹرنیشنل ناموں کے ساتھ کام کر چکی تھی۔ وہ روپے یا ڈالرز نہیں کماتی تھی۔ وہ درہم و دینار کما رہی تھی۔ دبئی میں اس کی ذاتی جائیداد تھی۔ بینک بیلنس تھا، بہترین گاڑی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کے پاس ابھی بھی بے شمار آفرز تھیں۔ اس کے تعلقات تین براعظموں تک پھیلے تھے۔

وہ کیا تھا جس کی حاجت شیریں خلیق محمد کرتی اور اسے نہ ملتی۔ وہ تیس سال کی نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے وہ سب حاصل کرلیا تھا جس کو اس عمر تک پہنچنے سے پہلے سے پہلے حاصل کرلینے کی دھن اس پر سوار رہا کرتی تھی۔ اسی لیے اس نے شادی اور اپنی بیٹی کو دنیا کے سامنے لانے کا ارادہ کیا تھا۔

داؤد گزشتہ دو سال سے کسی سعودی آڈٹ فرم کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ شادی ڈیکلیئر کرنے سے پہلے باہمی رضامندی سے اس نے دبئی میں جاب ڈھونڈی تھی کیونکہ شیریں چاہتی تھی کہ وہ سنگاپور یا دبئی میں ہی باقاعدہ رہائش اختیار کریں۔ اسی لیے داؤد نے اپنی ساری سیونگ سے ایک اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ دن رات ایک کر کے اسے ڈیکوریٹ کیا تھا۔ اسے آفس کی طرف سے گاڑی اور رہائش کی سہولت ملی ہوئی تھی لیکن اس کی خاطر وہ یہ سب کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ شادی کے بعد اپنی گاڑی بھی خرید لے گا۔

وہ چاہتا تھا شیریں کو کسی مرحلے پر یہ محسوس نہ ہو کہ وہ کامیاب نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا تھا یہ امر اس کی محبوب بیوی کو کس قدر عزیز تھا۔ دنیاوی طور پر خوش ہونے کے جتنے لوازمات دنیا میں دستیاب تھے وہ اپنے بل بوتے پر حاصل کرلینا کس قدر مسرور کن تھا مگر ایک ٹھیسے سے پیراسائٹ نے سب کچھ تلپٹ کر دیا تھا۔ سب کچھ ختم کر دیا تھا۔

میں زندگی تو ایک کامیاب عورت کی طرح گزارنا چاہتی ہے۔
آنسوؤں کی ایک لڑی اس کی آنکھوں سے پھسل کر نیچے گرتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟''

حبیب اللہ خان لاریب کی انگلی پکڑے اندر کی جانب جا رہا تھا جب پورچ سے گزرتے ہوئے اس نے شیریں کو لان میں بیٹھے دیکھا۔ وہ یک دم مڑا تھا اور پھر جیسے اُڑ کر اس تک پہنچا تھا۔ اسے اس پر ترس آیا۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جسے وہ سب جانتے تھے۔ وہ سرتا پا بدل چکی تھی۔ لان چیئر پر ٹانگیں سمیٹے وہ کرسی کی پشت سے کمر ٹکائے بظاہر آرام دہ حالت میں بیٹھی تھی لیکن چہرے پر ویرانی کا راج تھا۔ ایک ہلکی سی شال ٹانگوں پر پھیلا رکھی تھی۔ موسم اگرچہ بالکل بھی خنک نہیں تھا لیکن اسے ٹھنڈ لگتی رہتی تھی۔ وہ اکثر یہ شکایت کرتی پائی جاتی تھی کہ اس کا بدن ٹھٹھر رہا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے ہیں۔ اب تو اس پر دوائیاں بھی اثر کرنا چھوڑ چکی تھیں۔ ڈاکٹرز کہتے تھے وہ بالکل ٹھیک ہے، اسے کوئی عارضہ نہیں ہے۔ اس نے کاؤنسلنگ سیشنز بھی لینے شروع کیے تھے اور اینٹی ڈیپریسنٹ بھی لے رہی تھی مگر افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔

داؤد سمیت اس کے اپنے والدین بھی اس کی حالت کی وجہ سے بے حد پریشان رہنے لگے تھے۔ داؤد اپنی ملازمت کی وجہ سے مجبور تھا اس لیے واپس دبئی چلا گیا تھا لیکن اس کے اصرار کے باوجود شیریں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا مگر وہ داؤد کی ممی کے ساتھ بھی نہیں رہ رہی تھی۔ وہ لاریب کو لے کر واپس اپنے والدین کے گھر آ گئی تھی لیکن یہاں بھی وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔ لاریب کی ساری ذمہ داری حبیب خان اور اس کی ممی کے سر تھی۔ لان میں بیٹھی وہ گھاس کو دیکھنے میں مگن تھی۔ حبیب خان نے لاریب کی انگلی چھوڑ دی لیکن وہ ایک قدم بھی ماں کی جانب نہیں بڑھی تھی۔ اسے اس سے ذرا سی بھی رغبت نہیں تھی۔ شیریں نے نگاہیں گھما کر ان دونوں کی جانب دیکھا پھر اس کی نگاہیں لاریب پر ٹک سی گئی تھیں۔

''میں انہیں چاکلیٹ دلوانے لے جا رہا تھا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟'' اس نے نظریں جھکا کر مؤدب سے انداز میں سوال کیا تھا۔ شیریں نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ صرف لاریب کو دیکھ رہی تھی جبکہ لاریب کے چہرے پر بیزاری تھی جیسے اسے یہاں کھڑے ہونا اچھا نہ لگ رہا ہو۔

''آج موسم اچھا ہے۔ آپ ساتھ چلیں گی تو ہمیں اچھا لگے گا۔ ہے نا لاریب۔ ممی ہمارے ساتھ چلیں؟''

حبیب خان صرف اس سے بات کرنے کی غرض سے گفتگو کو طول دے رہا تھا۔ لاریب نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' شیریں نے کسی بات میں دلچسپی نہ لی تھی۔ اسے جیسے اندازہ تھا کہ لاریب اسے پسند نہیں کرتی۔

''آپ اسے چاکلیٹ دلوا لائیے حبیب صاحب۔'' وہ اس سے نگاہیں ہٹا کر سامنے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ حبیب اللہ خان چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا پھر اس نے دوبارہ سے لاریب کی انگلی تھام لی تھی۔

''حبیب صاحب!'' وہ دو قدم بھی نہ چلا تھا جب اس نے پکارا۔ وہ فوراً مڑا تھا

''اسے مجھ سے بات کرنے کے لیے مجبور نہ کیا کریں۔ مجھے پتا ہے، یہ مجھے پسند نہیں کرتی۔'' حبیب اللہ خان کے دل کو اس کے جملے سے صدمہ پہنچا۔

''یہ بات نہیں ہے بی بی! وہ ابھی بچی ہیں۔ بچے اس عمر میں ہر اس شخص کو پسند کرتے ہیں جو انہیں وقت دے۔ ان کے ساتھ کھیلے۔ ان کی فرمائشیں پوری کرے۔ آپ ان کے ساتھ کھیلا کریں۔ ان سے باتیں کیا

کریں۔ ان کے لاڈ اٹھائیں۔ آپ کے دل کو سکون ملے گا۔"

"اس دل کو سکون نہیں مل سکتا حبیب صاحب۔ اس دل نے بڑے دل دکھائے ہیں۔ اس دل میں اس قدر سیاہی بھر چکی ہے کہ یہ ننھی بچی جل کر بھسم ہو جائے گی۔ آپ اس کو کیوں مشکل میں ڈالنا چاہتے ہیں۔" وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی تھی۔ حبیب اللہ خان نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔ وہ ایسی باتیں کثرت سے کرنے لگی تھی۔

"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ آپ نے کسی کا دل نہیں دکھایا۔" وہ ابھی اتنا ہی بولا تھا کہ شیریں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دل نہ دکھایا ہوتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا؟ میرے ساتھ جو ہو رہا ہے، یہ ہوا ہوتا۔" وہ ایک جملہ بول کر ہی تھک جاتی تھی۔ حبیب اللہ تڑپ کر اس کے قریب آیا تھا

"یہ بیماری ہے۔ اور بیماری حسب نسب، رتبہ، مزاج یا حسن دیکھ کر لاحق نہیں ہوتی۔ اللہ صرف گناہ گار کو بیماری کی اذیت دیتا ہوتا تو کیا نبی بیمار پڑتے۔ اللہ کے برگزیدہ لوگ ہمیشہ صحت مند رہتے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس لیے بی بی! ایسا مت سوچا کریں۔ یہ آپ کی منفی سوچیں ہیں جو آپ کو کھائے چلے جا رہی ہیں۔" وہ اسے مزید سمجھانا چاہتا تھا لیکن وہ ناگواری سے بولی

"جائیں۔ حبیب صاحب! بچی انتظار کر رہی ہے۔ اسے چاکلیٹ دلوالائیں۔ ورنہ یہ بھی مجھے بددعائیں نہ دینے لگے اپنی کریتی کی طرح۔"

حبیب اللہ خان ہونٹ بھینچ کر چپ چاپ واپس گیٹ کی جانب چل دیا تھا۔ لیکن اس کا دماغ مسلسل مصروف تھا۔

☆☆☆

"روحانی علاج؟" خلیق صاحب نے سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"جی ہاں۔ ہمارے یہاں پہاڑوں میں یہ یقین بہت پختہ ہے کہ اس قسم کی بیماریاں روحانی علاج سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

اس نے جان بوجھ کر دماغی بیماریاں نہیں کہا تھا۔ خلیق صاحب نے اپنی عینک کے عقب سے اس کا چہرہ دیکھا جس سے اسے حوصلہ ملا تھا کہ وہ اس کی بات دلچسپی سے سن رہے ہیں۔ اس نے مزید کہنا شروع کیا۔

"میں ایک بہت اچھی خاتون کو جانتا ہوں۔ وہ بہت نیکوکار ہیں۔ ہمارے علاقے میں بہت چرچا ہے ان کا۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی ہے۔ میں اور میرے خاندان کے لوگ کئی سالوں سے ان کے پاس جاتے رہے ہیں۔ آپ اگر کہیں تو..... میں....." پھر وہ جھجک کر رکا۔

"میرا مطلب..... ہم..... انہیں وہاں لے جاتے ہیں۔ وہ دم کر دیں گی تو بی بی کے دل کو سکون ملے گا۔ آپ ایک بار چلیں تو سہی۔" آخر میں وہ منت پر اتر آیا تھا۔ خلیق صاحب نے نفی میں سر ہلایا

"حبیب صاحب! وہ نہیں مانے گی۔"

"ہم انہیں سمجھا سکتے ہیں۔ انہیں بہلا کر وہاں لے جا سکتے ہیں۔" حبیب اللہ خان نے اصرار کیا تھا لیکن خلیق صاحب کے چہرے پر رضامندی نہ چمکی تھی۔

"آپ جانتے ہیں، وہ بہت ضدی ہے۔ وہ نہیں مانے گی۔ اور پھر آج کل وہ جس کیفیت سے گزر رہی ہے۔ وہ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں، یہ ڈپریشن کی وہ قسم ہے جو خودکشی تک بھی لے جاتی ہے۔ اس صورت حال میں اگر ہم اصرار کریں گے تو وہ مزید ضد پر اتر آئے گی۔ اور اگر خدانخواستہ اس نے کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا لیا تو میرے پاس کیا بچے گا۔ ایک ہی تو بیٹی ہے میری۔"

چھم چھم بڑی تھیں۔ وہی اولاد جوان کے لیے باعث فخر رہی تھی، اب باعث آزار ہوئی جارہی تھی۔ وہ صحت مند تھی، مکمل تھی اور بیماری سے نجات پاس کی تھی مگر وہ سمجھتی تھی وہ ابھی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹرز سے اور اپنے گھر والوں سے رتی برابر تعاون کرنے کو تیار نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر اس کام اور سرگرمی کو کرنے سے انکار کردیتی تھی جو اسے صحت مندی کی طرف لے جاتا۔

ان کے حلقے میں یہ بات مشہور ہوچکی تھی کہ شیریں دماغی طور پر ناکارہ ہوچکی ہے۔ لوگ اسے "پاگل" قرار دینے لگے تھے۔ خلیق صاحب اور ان کی اہلیہ اس بات سے پریشان تھے۔ لیکن اولاد تھی نا۔ اس لیے وہ اس امر کو ہر ایک کے سامنے تسلیم کرنے سے احتراز برتتے تھے۔

"ہم سب مل کر انہیں سمجھا سکتے ہیں۔ آپ داؤد صاحب سے بات کریں نا۔ وہ کہیں گے تو بی بی مان جائیں گی۔" حبیب اللہ خان سوچ کر آیا تھا کہ اسے انہیں آمادہ کرنا ہی ہے۔ اس نے بیگم خلیق کی جانب مدطلب نظروں سے دیکھا تھا۔

"وہ تو کہہ ہی رہا ہے۔ بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ دبئی سے علاج کروایا جائے۔ پاکستان میں ابھی نفسیاتی امراض کی ویسی سہولیات میسر نہیں ہیں۔ جیسی دبئی میں ہیں اور داؤد کے پاس فری میڈیکل انشورنس کی سہولت بھی ہے۔ لیکن یہ مانتی نہیں ہے۔ اپنے کمرے سے نکل کر باہر لاؤنج میں بیٹھنے کے لیے کئی بار کہو تو ستی ہے۔ یہ کہاں پہاڑوں میں جائے گی روحانی علاج کے لیے۔" وہ بھی جیسے بیزار تھیں۔

"میں ایک بار ان سے بات کرکے دیکھوں؟" اس نے اجازت طلب کی تھی۔ اب کی بار خلیق صاحب اور ان کی بیگم نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔ وہاں رضامندی نہیں تھی لیکن پھر خلیق صاحب ہی بولے تھے۔

"حبیب صاحب! آپ کو ہم اپنے گھر کا فرد ہی نہیں سمجھتے۔ خاندان کا حصہ بھی سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ہماری بھلائی کا سوچ کر ہی یہ بات کہہ رہے ہوں گے۔ کر لیجیے آپ بھی اپنی سی۔ شاید آپ کی سن لے وہ۔"

ان کے انداز میں بے پناہ تھکن تھی۔ حبیب اللہ خان کو ان پر ترس آیا اور ساتھ ہی شیریں خلیق محمد کے روحانی علاج کا ارادہ مزید مستحکم ہوا تھا۔

☆☆☆

"حبیب صاحب! میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ لیکن مجھ سے نارمل زندگی کی طرف پلٹا ہی نہیں جارہا۔ میں جب بھی اپنی روٹین لائف شروع کرنا چاہتی ہوں۔ اور یقین کریں۔ میں چاہتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں لیکن مجھے ہر طرف ننھے کیڑے نظر آنے لگتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے میرے سر میں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔ ہر وقت مجھے یہ بے چینی لاحق رہتی ہے کہ میرے دماغ میں ایک پیراسائٹ ہے۔ اور اگر میں دوبارہ سے اپنی نارمل زندگی کی جانب گئی تو وہ بیدار ہوجائے گا۔ میرے دل سے یہ خوف ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔"

وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔ رات کا وقت تھا اور وہ دونوں لان میں بیٹھے تھے۔ حبیب اللہ خان دل میں عہد کرکے بیٹھا تھا کہ آج اسے منا کر ہی دم لے گا۔ اسی لیے وہ اسے ٹوکنے کے بجائے اس کی ساری بات سننا چاہتا تھا۔

"اس ایک پیراسائٹ نے مجھ پر آگہی کے کئی دَر وا کیے ہیں۔ مجھے زندگی کی حقیقت سمجھ میں آگئی ہے۔ زندگی موم بتی کے شعلے سے بھی گئی گزری چیز ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا اسے نیست و نابود کردینے کو کافی ہوتا ہے۔ مجھے ان چند دنوں میں بارہا لگا کہ میں مرنے والی ہوں اور موت آگہی کے کئی در کھول دیتی ہے۔ موت کا احساس سب سے پہلے زندگی کو بدصورت کردیتا ہے۔ میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔ مجھے زندگی بدصورت لگتی ہے۔ مجھے اپنا آپ بدصورت لگتا ہے کیونکہ میری سمجھ میں آگیا ہے میں زندگی میں کتنی ہی کامیاب کتنی ہی خوش شکل یا کتنی ہی مستحکم ہوجاؤں۔ مجھے ایک دن مر ہی جانا ہے۔ یہ ہے زندگی کی حقیقت۔ جس کی خاطر انسان ساری زندگی بھاگتا

آواز میں صدیوں کی تھکن تھی اور لہجہ آنسوؤں کو برداشت کرنے کی چغلی کھا رہا تھا۔

''یہ تو نظام قدرت ہے۔ اس سے فرار.....'' حبیب اللہ خان نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے بات کاٹ دی

''جی ہاں۔ یہی نظام قدرت ہے اور اس کے لیے انسان ایک جھاڑو کے تنکے سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ قدرت جب چاہتی ہے انسان کو اپنی ہتھیلی پر رگڑ کر مسل دینے اور پھر پھونک مار کر اڑا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم ساری زندگی خود کو مٹی سمجھتے رہتے ہیں اور پھر ایک دن آتا ہے۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ ہم تو مٹی بھی نہیں ہیں۔ ہم مٹی کے لفافے میں بند ایک ہوا کے جھونکے کی طرح ہیں جسے قدرت ایک جست میں نگل جاتی ہے۔ اسی لیے میرا دل نہیں چاہتا کہ میں زندگی میں دلچسپی لوں۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

وہ کہتے کہتے اب کی بار رو پڑی تھی۔ حبیب اللہ خان کا دل جانتا تھا، اس نے اسے گلے لگانے، اور اپنی ہتھیلی سے اس کے آنسو پونچھنے کی خواہش کو کیسے ضبط کیا تھا۔

''یہ مجھ سے ہوتا نہیں ہے بی بی! میں کیسے چھوڑ دوں آپ کو اس حال میں۔'' وہ خود کو یہ کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔ شیریں چپ رہی تھی۔ وہ مزید کہنے لگا۔

''ہم سب آپ کو اس حال میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرا، ہم سب کا دل دکھتا ہے۔ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ یقین کریں، آپ جس فیز سے گزر رہی ہیں اس کا علاج ممکن ہے۔ آپ ایک بار میرے ساتھ چلیں تو سہی۔ یہ روحانی علاج ہے۔ کوئی ڈاکٹری علاج نہیں کہ آپ کو ٹیکا لگا کر بے ہوش کر دیا جائے گا۔ جو ہوگا آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ اللہ رسول کا نام لے کر ہوگا۔ قرآن سے ہوگا۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔ ایک بار میری خاطر۔ پھر دل نہ چاہا تو میں اصرار نہیں کروں گا۔''

وہ منت کر رہا تھا۔ شیریں چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر جانے اس کے دل میں کیا سمائی تھی۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی تھی۔ حبیب اللہ خان کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

''میں فون کر کے آپ کے لیے وقت لیتا ہوں۔'' وہ مطمئن ہو کر کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ ایسی جہالت کہاں سے آ گئی ہے آپ سب لوگوں کی سوچ میں۔ روحانی علاج کے نام پر بے وقوف بن رہے ہیں آپ لوگ۔''

یہ داؤد کی آواز تھی۔ حبیب اللہ خان اندر جانے کے بجائے باہر ہی رک گیا تھا۔ وہ شاید اسکائپ کال پر خلیق صاحب سے بات کر رہا تھا اور اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے اس کی آواز دروازے سے باہر تک سنائی دے رہی تھی۔

''انکل یہ لوگ تعویذ گنڈوں کے چکر میں پھنسا کر پیسہ لوٹتے ہیں اور مس لیڈ کرتے ہیں۔ مجھے یہ آئیڈیا بالکل پسند نہیں آیا۔'' وہ مزید کہہ رہا تھا۔

''حبیب صاحب کے بھروسے کے لوگ ہیں۔ ان کا خاندان اس خاتون کو عرصہ سے جانتا ہے۔ ان کے علاقہ میں کافی چرچا ہے ان کا۔''

خلیق صاحب اسے تفصیل بتا رہے تھے لیکن ان کا انداز بودا سا تھا۔ حبیب اللہ خان کو الجھن ہوئی۔ داؤد کیوں نہیں چاہتا تھا کہ علاج کی غرض سے کہیں سفر کیا جائے۔ اس کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

''انکل! آپ اس دو نمبر کے ڈرائیور کی باتوں میں آ گئے ہیں۔ ہمیں کیا پتا، وہ کون ہے۔ اس کے وئیر اباؤٹس کی بھی کوئی خیر خبر نہیں ہمیں۔ ایک ملازم ہے وہ آپ کا۔ جسے سڑک سے اٹھا لائے تھے آپ۔ اس پر اتنا بھروسا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے کہنے پر آپ ماسکرہ جائیں گے۔ اور کیا پتا اتنا لمبا سفر کر پائے گی۔ وہ تو دس منٹ

داؤد بالکل بھی مطمئن نہیں تھا۔

حبیب اللہ خان نے بس یہاں تک سنا تھا۔ اسے داؤد کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔ اس کے دل میں اچانک ہی ایک خیال آیا تھا۔ اس نے کمرے کے دروازے کے باہر پڑے چیسٹ ڈرار پر بجی انٹرنیٹ کی ڈیوائس بند کردی تھی۔ کال خود بخود بند ہوگئی تھی۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اسے داؤد پر بے پناہ غصہ آرہا تھا۔ اسے خلیق صاحب کی توجہ کو اس نکتے پر مبذول رکھنا تھا کہ شیریں خلیق محمد کو روحانی علاج ہی کی ضرورت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ داؤد انہیں اس ضمن میں کسی پیش رفت سے روکے۔

☆☆☆

''یہ بیماری نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسباب ہیں۔ اور خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے آپ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ وہ آپ کو پسند کرتا ہے۔ آپ سے محبت کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ آپ وہ زندگی گزاریں جو آپ گزارتی آئی ہیں۔ اس لیے اس نے آپ کو ذرا سی تکلیف دی ہے۔ تاکہ آپ سبق سیکھیں۔''

وہ خاتون کہہ رہی تھیں۔ شیریں ان سے پہلے بھی ایک بار مل چکی تھی جب وہ ہاسپٹل میں تھی لیکن آج کی ملاقات ان کی درس گاہ میں ہورہی تھی۔ شیریں ان کی شخصیت سے پہلی نظر میں ہی متاثر ہوئی تھی۔ ماڈلنگ میں اس کا واسطہ نہایت خوب صورت چہروں سے پڑتا رہتا تھا لیکن اس کے سامنے بیٹھی خاتون کا حسن کچھ انوکھا تھا۔ وہاں مصنوعی پن نہیں تھا، جھوٹی آرائش نہیں تھی، بناوٹ نہیں تھی۔ ان کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے وجود سے الوہی سی روشنی پھوٹ رہی ہو۔ وہ خود کو ان کی شخصیت کے طلسم سے مرعوب ہونے سے روک نہیں پائی تھی۔ ان کے سامنے دوزانو بیٹھے اسے تھکن بھی محسوس نہیں ہورہی تھی۔

''یہ ذرا سی تکلیف نہیں ہے۔ اگر یہ ذرا سی ہوتی تو میں اس طرح آپ کے سامنے نہ بیٹھی ہوتی۔ میں تو بالکل ختم ہوچکی ہوں۔ میرے اندر جینے کی امنگ دم توڑ چکی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے، میں سمندر میں چھلانگ لگادوں۔ کسی اونچی عمارت سے کود جاؤں۔ یا کچھ کھا کر مرجاؤں۔'' وہ بے چین لہجے میں انہیں بتارہی تھی۔

''یہ تو بالکل نارمل ہے۔ یہ ان سب انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے جو خدا کے راستے سے ہٹ کر چل رہے ہوتے ہیں اور پھر یک دم اس کی جانب پلٹنا چاہتے ہیں۔ جانتی ہیں کیوں؟'' وہ خاتون اس سے سوال کررہی تھیں

''شیطان کو بھی تو اپنی جاب کرنی ہے نا۔ اسے بھی تو اللہ نے کسی کام کے لیے پیدا کیا ہے نا۔ وہ انسان کو ورغلائے بنا چین سے بیٹھتا ہی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ انسان اور اللہ کے درمیان حائل ہوکر انسان کو درست سمت سے بھٹکا دیتا ہے۔ آپ عبادت کرنا شروع کریں۔ پہلے چند دن آپ رغبت سے اللہ کا کلام پڑھ ہی نہ پائیں گی۔ شیطان آپ کے ارتکاز کو قائم ہی نہ ہونے دے گا۔ پھر آہستہ آہستہ آپ اگر اپنے ارادے پر قائم رہیں گی تو آپ کا خشوع وخضوع قائم ہونا شروع ہوگا۔ شیطان کو رکاوٹ محسوس ہونا شروع ہوگی۔ وہ آپ کے راستے سے ہٹنا شروع ہوگا۔ پھر دھیرے دھیرے آپ کو عبادت میں وہ لطف آنے لگے گا جو عبادت کی اصل روح ہے۔ اور پھر آپ کو وہ راستہ بھی نظر آنے لگے گا جس پر چلنے کی خاطر آپ کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے ان تکالیف سے گھبرائیں مت۔ صرف ہمت سے کام لیں۔ اللہ کے راستے پر چلنا شروع کریں۔ وہ خود آپ کا ہاتھ تھام کر آپ کے لیے آسانیاں پیدا کردے گا۔

ان کے لہجے میں اس قدر محبت تھی کہ ان کے الفاظ شیریں کو اپنے دل میں اترتے محسوس ہوئے۔

''آپ میری مدد کریں نا۔ مجھے اللہ کے راستے پر چلنا آتا ہی نہیں ہے۔ مجھے سکھادیں پلیز۔ مجھے اس کی سمت چلنے کا گر سکھادیں۔ پلیز۔'' وہ یک دم لجاجت سے ان کا ہاتھ تھام کر بولی تھی۔ وہ مسکرائیں۔

''میری کیا اوقات۔ میں کیا سکھا سکتی ہوں کسی کو۔ اللہ خود سکھائے گا آپ کو۔ اس نے ابتدا کردی ہے۔

آپ کل تیاری کریں آگے بڑھنے کی۔ تو کل کریں پانچ وقت نماز قائم کریں۔ پانچ نمازیں قائم کریں۔ آپ کو ایک تعویذ دے رہی ہوں۔ جمعرات کو اللہ کا نام لے کر اسے پہن لیجیے گا۔ اور دوبارہ جب تک میں نہ کہوں۔ آپ اسے اتاریں گی نہیں۔ چند عمل بھی بتاؤں گی۔ وہ آج سے ہی شروع کر دیں۔''

وہ لمحہ بھر کو رکیں پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

''ایک اور بات جس کا آپ نے خاص خیال رکھنا ہے۔ آپ کے دشمن آپ کے اردگرد ہیں۔ یوں سمجھیں وہ آپ کے گھر میں ہی ہیں۔ اس سے زیادہ بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھیں، وہ آپ کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ آپ اپنی سمت درست کریں۔ اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کریں گے آپ کو اس راہ سے ہٹانے کی۔ لیکن آپ ان کی باتوں میں نہیں آئیے گا۔ اور اپنا اعتقاد قائم رکھتے ہوئے یہ عمل کرتے رہنا ہے۔'' انہوں نے ایک پرچی اور ایک لفافہ اسے تھما دیا تھا۔ شیریں خلیق محمد نے سر ہلایا۔

''جی صندل بی۔ میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گی۔''

اس کے بعد واقعی اس نے وہی کرنا شروع کر دیا جو صندل بی نے اس سے کرنے کو کہا۔ صندل بی اچھی خاتون تھیں لیکن وہ پہاڑوں کی باسی تھیں۔ ان کی تدریس میں وہاں کا مخصوص رنگ چھلکتا تھا۔ وہ شیریں کے ساتھ رونما ہونے والے ہر واقعہ کو بری نظر، حسد اور آسیب کے ساتھ منسوب کر دیتی تھیں۔ ان کے لیے ہر برائی کی جڑ مذہب سے دوری تھی جبکہ شیریں شہر کی پروردہ تھی جس نے مذہب صرف بچپن میں اسلامیات کی کتاب میں پڑھا تھا۔ ابتدا میں وہ ان کی باتوں سے الجھتی بھی لیکن پھر جب وہ ان کی مانتی چلی گئی تو اس کے لیے کافی کچھ بہتر ہونے لگا۔

وہ بظاہر معجزہ نہیں تھا لیکن شیریں کے خاندان کے لیے یہ کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ شیریں کو صندل بی کی رفاقت راس آ گئی تھی۔ وہ اسے دھیرے دھیرے مذہب کی جانب راغب کرنے لگی تھیں۔ اس کے تھکے ہوئے بیمار ذہن کو بھی عبادت اچھی لگنے لگی۔ وہ ان کے بتائے ہر عمل پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے لگی۔ نماز اسے بچپن میں یاد کروائی گئی تھی، شاید اس نے ایک عمر تک طریقے سے ادا بھی کی تھی لیکن خشوع سے نماز ادا کرنا اسے صندل بی نے سکھایا۔ وہ اسے قرآن پڑھنے کی طرف مائل کرتی تھیں۔ ان ہی کے کہنے پر وہ تسبیحات پڑھتی رہتی۔ خلیق صاحب اور ان کی اہلیہ کافی مطمئن رہنے لگے تھے۔ داؤد کے اعتراضات کے جواب میں بھی وہ اسے اپنے حساب سے دلائل دے کر چپ کروا دیتے تھے لیکن پھر ایک اور بات ہوئی۔

صندل بی شیریں کو صدقے خیرات کی بھی تلقین کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا بھوکے کو روٹی کھلانا ثواب ہے لیکن کسی بھوکے کو اپنے کمائے پیسوں سے، اپنے ہاتھ سے کھلانا مسرور کن بھی ہے۔ خلیق محمد اس سے پہلے بھی خیرات اور صدقہ کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، وہ ہمیشہ ایک خطیر رقم نادار لوگوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ صندل بی کے کہنے پر گھر کے لان میں لنگر کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ہفتے میں ایک مخصوص دن ان کے گھر کے گیراج میں دیگیں پکوا کر بانٹی جانے لگیں۔ اس روز صبح سے ہی ان کے گھر کے باہر گداگروں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو جاتا جو کئی گھنٹے کھانے کے انتظار میں باہر بیٹھا رہتا۔ شیریں کے بھائی کو اس امر پر کافی اعتراض تھا۔

''ڈیڈی! یہ غلط اپروچ ہے۔ ساری قوم کو کب تک صرف کھانا کھانے پر لگائے رکھیں گے ہم۔ کیا انسانی جسم میں پیٹ ہی کی حرمت ہے کہ اس کی طلب پوری کرنے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جایا جائے۔ کیا دل دماغ کا خیال رکھنے کا کوئی حکم نہیں۔ کیا عزت نفس کو قائم رکھتے ہوئے بھوک نہیں مٹائی جا سکتی۔ میں اس امر کے خلاف ہوں۔ آپ لوگ ٹھیک نہیں کر رہے۔ یہ لنگر نہیں بانٹ رہے آپ لوگ۔ یہ تو ڈرگ ڈیلنگ ہے۔ دس دس پلاؤ بریانی کی دیگیں ایک ہی وقت میں بانٹ کر آپ نادار لوگوں کا بھلا نہیں کر رہے۔ بلکہ انہیں ڈرگز دے رہے ہیں۔ بنا محنت کیے روٹی مل جانا چرس کے ٹیکے سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ یہ لوگ اور ان کے بچے ہاتھ پھیلا کر

مانگنا اور کھانا سیکھ رہے ہیں۔ خیرات کا کھانا کھاتے رہنے سے ان کی جینز ہی تبدیل ہو جائیں گی۔ ایک وقت آئے گا یہ ہاتھ سے محنت کرنا بھول جائیں گے اور اللہ کے عطا کیے ہاتھ انہیں صرف مانگنے والا آلہ لگا کریں گے۔ اس سے خطرناک ڈرگ کیا ہو سکتی ہے جو آپ کا ڈی این اے ہی تبدیل کر دے۔ اس سے بہتر ہے، ان میں سے کسی پانچ خاندانوں کو چن کر انہیں کوئی کاروبار کرنے کی جانب راغب کریں۔ انہیں کاروبار کرنے کے گر بتائیں۔ ان کی اولادوں کو ہنر سیکھنے کی ترغیب دیں۔ وہ سارا پیسہ جو صرف رزق بانٹنے پر لگا رہے ہیں، وہ محنت کر کے رزق کمانے کی پالیسی پر لگائیں۔ یہ لانگ ٹرم پلان ہے۔ اسے کہتے ہیں صدقہ جاریہ۔ اس کا فائدہ ہوگا۔''

اس نے یہ بات نیک نیتی سے کہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بہن کو اس کی کسی بات سے دکھ پہنچے۔ اسی لیے اس نے شیریں کی غیر موجودگی میں اپنے والدین کے سامنے اپنا مؤقف بیان کیا تھا مگر حبیب صاحب اس وقت کمرے میں موجود تھے اور یہ بات شیریں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کافی ناراض ہوئی تھی اور اس نے خلیق صاحب کے سامنے اپنا احتجاج بھی ریکارڈ کروایا تھا۔

''عمر کو مذہب کا کچھ اتا پتا ہے نہیں۔ اس نے طریقے سے کبھی قران کھول کر نہیں دیکھا۔ نماز کی رکعات کی تفصیل اسے معلوم نہیں ہوگی۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر کیا حق ہے۔ بھوکے کو کھانے کھلانے کا کتنا ثواب ہے۔ یہ بھی نہیں پتا ہوگا۔ اور یہ ہمیں لانگ ٹرم پلان سکھانے آ گیا ہے۔ ڈیڈی آپ اس سے کہیں کہ اپنے کام سے کام رکھے۔ ہم نے ایک لمبی عمر دین سے دور رہ کر دیکھ لیا ہے۔ اس میں سوائے تکلیف کے کچھ نہیں ہے۔ آپ پلیز عمر کو ایڈوائس کریں وہ میرے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ اسے اگر زیادہ اعتراض ہے تو میں اپنے گھر واپس چلی جاتی ہوں۔ داؤد کو کسی بھوکے پیٹ کو روٹی کھلانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

خلیق صاحب کے سمجھانے پر وہ دوٹوک انداز میں بولی تھی۔ اس کا چہرہ خفگی کے باعث سرخ ہو گیا تھا اور اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ وہ جو بیٹی کو تحمل سے کچھ سمجھانا چاہ رہے تھے، چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ شیریں کی ذہنی حالت سے وہ سب خائف تھے۔ اسے کب ہینگ اٹیک ہونے لگتا تھا کسی کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا۔ شیریں نے اس بات کا تذکرہ صندل بی سے بھی کیا۔ انہوں نے اسے سمجھایا۔

''ہر نیک کام وقوع پذیر ہونے سے پہلے چالیس بار شیطان کی وجہ سے ڈگمگاہٹ کا شکار ہوتا ہے۔ یہ انسان کا ہی نہیں اس نیک عمل کا بھی امتحان ہوتا ہے لیکن آپ بالکل بھی فکرمند نہ ہوں۔ آپ اگر حق پر ہیں، سچے رستے پر ہیں اور اللہ آپ کے در سے کسی بھوکے کا پیٹ بھرنا چاہتا ہے تو یہ عمل بھی نہیں رکے گا۔ آپ بس استقامت کی راہ پر چلیں۔ اور کسی مخمصے کا شکار مت ہوں۔'' انہوں نے اسے یقین دہانی بھی کروائی تھی اور ساتھ ہی نماز کے بعد چند تسبیحات کرنے کی تلقین کی تھی۔ اگلے ہی دن خلیق صاحب نے عمر کو شٹ اپ کال دے دی تھی۔

''وہ میری بیٹی ہے۔ بیمار ہے۔ موت کے منہ سے بچ کر آئی ہے۔ اللہ اللہ کر کے زندگی کی طرف پلٹنے کی سعی کر رہی ہے۔ اسے جو چیز خوشی دیتی ہے۔ اسے وہ کرنے سے مت روکو۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔'' خلیق صاحب نے اپنے بیٹے سے کہہ دیا تھا۔ وہ بہت وسیع ذہن رکھنے والا پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ فائنانس میجر کے ساتھ آسٹریلین یونیورسٹی سے گریجویٹ تھا۔ اسے ایسی باتیں آسانی سے ہضم نہ ہوتی تھیں۔

''ڈیڈی! آپ نے یہ نہیں سکھایا تھا ہمیں۔ آپ تو کہا کرتے تھے، دین بہت پریکٹیکل سی چیز ہے۔ آپ نے تو مجھے اے لیولز کے ایگزامز کے بعد ایک مال میں گیسٹر کی جاب دلوا دی تھی تاکہ میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کوئی کام سیکھ لوں۔ آپ ہی کہا کرتے تھے، دین میں رزقِ حلال کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اور اب آپ ہی خیرات کو پروموٹ کر رہے ہیں۔''

وہ بھی شیریں کا بھائی تھا۔ اسے کسی مؤقف کو ماننے کے لیے آسانی سے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''میں ابھی بھی اپنے موقف پر قائم ہوں۔ لیکن وہ ڈپریشن کی مریضہ ہے۔ اور ڈپریشن بڑی بری چیز ہے۔ اس سے میں ایسے بات نہیں کرسکتا جیسے تم سے کر رہا ہوں۔ تم چاہتے ہو، وہ دوبارہ بستر سے لگ جائے۔ وہ دوبارہ سے اس موذی مرض کا شکار ہوئی تو بچ نہ پائے گی۔'' خلیق صاحب زچ ہو کر بولے تھے۔ ان کی اہلیہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

''عمر! ختم کرو اس بحث کو۔ کچھ عرصہ کی بات ہے پھر اس کا جنون ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ وہ دوبارہ سے نارمل زندگی کی طرف پلٹ جائے گی۔ تب تک کے لیے ہم انتظار کر سکتے ہیں۔''

''نارمل زندگی؟'' وہ استہزائیہ ہنسی ہنسا

''اس کا مطلب آپ کو یقین ہے کہ یہ زندگی جو وہ گزار رہی ہے، وہ نارمل نہیں ہے۔ آپ لوگ غلطی کر رہے ہیں۔ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ اس کی ذہنی حالت کو بھی سمجھتا ہوں لیکن اسے کسی اندھی کھائی میں گرتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لیے مجھے لگتا ہے اسے اس اسٹیج پر سمجھانا ہوگا۔ روکنا ہوگا ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔''

وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا تھا۔ خلیق صاحب نے اکتاہٹ بھرے انداز میں سر جھٹکا۔ وہ اپنی اولاد کے درمیان پنگ پانگ بال بنے ہوئے تھے۔

''وہ صرف چند نادار لوگوں کو کھانا کھلا رہی ہے۔ چند بھوکے لوگوں کا پیٹ بھر رہی ہے۔ یہ گناہ نہیں ہے۔ وہ بینک نہیں لوٹ رہی۔ ڈکیتیاں نہیں کر رہی۔ اس لیے تم ایسا خوفناک نقشہ بھی نہ کھینچو۔ تمہیں قطعاً فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں ہوگی دیر۔ میں ہوں نا۔ سنبھال لوں گا سب۔''

اپنی جانب سے انہوں نے بیٹے کو ٹوک کر بات ختم کر دی تھی لیکن اس سے شیریں کو مزید شہ مل گئی تھی۔ وہ صندل بی کی مزید معتقد ہو گئی تھی لیکن نجانے کیوں وہ جتنا صندل بی کو پسند کرتی تھی، اس کے گھر والے اتنا ہی ان سے خار کھانے لگے تھے۔ سب سے پہلے عمر نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔ دوسری باری کس کی تھی؟

☆☆☆

''تھینک گاڈ۔ کارن فلیکس موجود ہیں۔ میرا اتنا دل چاہ رہا تھا کھانے کو۔''

لاریب نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ گلے کو خبر مل چکی تھی کہ وہ صبح ہی صبح کتوں کے دولت خانے پر حاضری دے کر آئی ہے اس لیے وہ سخت ناخوش تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اسے لاریب کے مان بھرے انداز پر بہت لاڈ آتا لیکن اس وقت وہ بہت کبیدہ خاطر بیٹھی تھی، اس لیے کچھ نہیں بولی۔ خان بابا نے ہی لاریب کو مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے ناشتہ شروع کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے باؤل میں کارن فلیکس انڈیلے پھر دودھ ڈالتے ہوئے گلے کی جانب دیکھا۔

''گلے! آپ کے پاس انسٹنٹ نوڈلز ہیں؟ میں لنچ میں اپنے لیے بنا سکتی ہوں؟ میرا بہت دل چاہ رہا ہے۔'' وہ اس کی جانب دیکھے بنا استفہامیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ اس کا موڈ کافی خوش گوار لگتا تھا۔ گلے عموماً اپنے تاثرات باہر والوں کے سامنے جلدی ظاہر نہیں کرتی تھی لیکن لاریب کو وہ گھر کا فرد سمجھنے لگی تھی اس لیے اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی، بعجلت بولی۔

''نہیں۔ نوڈلز نہیں ہیں۔ میں منگوا سکتی ہوں۔ لیکن تمہیں جو بھی کھانا ہے۔ مجھے بتا دو۔ میں بنا دوں گی۔ تم کچن میں زیادہ آیا جایا مت کرو۔''

اتنا کہہ کر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی خان بابا کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر حیرانی نہیں تھی لیکن گرم چائے پیتے ہوئے ان کی آنکھیں جو سرد سی لگنے لگی تھیں وہ گلے کو باور کروا رہی تھیں کہ انہیں یہ بات پسند نہیں آئی۔ گروسری میں ہمیشہ ہی وراثت نوڈلز، پاستا لایا کرتا تھا کیونکہ خوش الحان کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی کب چلا آئے اور اسے رات بے رات بھوک بھی لگ جایا کرتی تھی تو ایسی چیزیں وہ خود بھی بنا لیا کرتا تھا یا رحمت بھی ایسے کام کر دیتا تھا۔

آپ ہی بنا دینا۔ لیکن میں آپ کی ہیلپ کردوں گی۔ بہت اچھے نوڈلز بناتی ہوں میں۔ نہ زیادہ نرم۔ نہ ہی سخت۔ ایک دم پرفیکٹ۔'' خان بابا کو اس کے لہجے سے چھلکتے اطمینان سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بلاوجہ کسی بات پر خوش ہے۔ انہوں نے گلے کی جانب دیکھا جہاں تاثرات میں ذرا نرمی نہیں آئی تھی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ ضرور بنانا۔ ہم دونوں مل کر کھائیں گے۔'' انہوں نے گفتگو میں حصہ لیا تھا، گلے اپنی مکھن والی روٹی کو دودھ پتی میں بھگو بھگو کر کھا رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا ہاتھ رکا اس نے شاکی نظروں سے ان کی جانب دیکھا لیکن وہ اسکی جانب متوجہ نہیں تھے۔

''ڈن ہوگیا۔ ویسے ایک اور کام بھی ہے جو میں آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔'' وہ واقعی آج کسی بات پر خوش لگتی تھی۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

''آپ کے پاس بہت سے کتے ہیں نا خان بابا۔ ان میں سے ایک مجھے دے دیں۔ میں اسے یہاں حویلی کے اندر رکھوں گی۔ مجھے ایک پیٹ لینے کا بہت شوق ہے۔ لیکن.....''

وہ کچھ کہتے کہتے رکی تھی جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ خان بابا بھی چند لمحے کچھ نہ بول سکے۔ یہ مسئلہ کافی گمبھیر تھا۔ گلے کو حویلی کے باہر کتے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے کجا حویلی کے اندر رکھنا۔ انہوں نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ ان ہی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''وہ تو بہت خوں خوار قسم کے کتے ہیں۔ گھروں میں نہیں رکھے جاسکتے۔ حویلی کے باہر بھی وہ چوکیداری کی غرض سے پالے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو ایک پلی دلوادوں گا۔'' انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے ایسے بات کرتے تھے جیسے وہ ایک چھوٹی بچی ہو۔ گلے کو غصہ آئے چلا جارہا تھا۔

''انسانوں سے زیادہ خوں خوار کچھ نہیں ہوتا خان بابا! جب ہم انسانوں کے ساتھ رہ لیتے ہیں تو پھر کتوں کے ساتھ رہنے میں کیا مسئلہ ہے۔ آپ پلیز مان جائیں۔ میں سارے ہیں لوں گی۔ بس ایک۔'' وہ ضد پر اتر آئی تھی۔ خان بابا نے پھر گلے کی جانب دیکھا۔ وہ انہیں ''انکار'' کرنے کے لیے اکسا رہی تھی لیکن پھر بھی انہوں نے اثبات میں سر ہلایا

''ہاں۔ ایک تو رکھا جاسکتا ہے لیکن میری ایک شرط ہے۔'' خان بابا کا یہ کہنا ہی کافی تھا۔ گلے نے ہاتھ میں پکڑی روٹی پلیٹ میں رکھی اور ناراضی سے باہر کی جانب چل دی۔ خان بابا نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا مگر روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ماسی جمیلہ اپنا ناشتہ مکمل کر کے سنک کے پاس کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے یہ سارا عمل ضرور دیکھا تھا۔ گلے نے پہلے کبھی خان بابا سے پہلے کچن نہیں چھوڑا تھا۔ آج یقیناً ایک عجیب دن تھا۔ خان بابا کی ساری توجہ لاریب پر تھی۔

''آپ اپنی اسٹڈیز پر فوکس کرنا شروع کریں۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اپنی تعلیم مکمل کریں۔''

وہ اسے سمجھا رہے تھے۔ اس نے کارن فلیکس والے باؤل سے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ یونیورسٹی واپس نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اس نے ایک دم سے اپنی خواہش بیان نہیں کی تھی۔

''تعلیم کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ پڑھا لکھا انسان زندگی میں کسی اسٹیج پر مار نہیں کھاتا۔ ایسے انسان کو شکست دینا آسان نہیں ہوتا۔'' وہ بے دھیانی میں چھوٹے چھوٹے رٹے رٹائے جملے بول رہے تھے کہ اس نے گہری سانس بھری اور دودھ سے بھرا چمچہ منہ میں رکھا۔

''خان بابا! میرا باپ پڑھا لکھا نہیں تھا کیا؟'' وہ ان سے پوچھ رہی تھی۔ خان بابا ششدر رہ گئے۔ اس نے اپنے باپ کے متعلق پہلے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ وہ دوبارہ سے باؤل کو دیکھنے لگی تھی اور اب کی بار اس کا لہجہ پھیکا سا لگنے لگا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''مت کیا کریں ایسی آؤٹ ڈیٹڈ باتیں۔ شکست نصیب میں لکھی ہو تو تعلیم بھی کچھ نہیں بگاڑ پاتی۔ ہار آپ

کا مقدر ہو تو ڈگریاں روک نہیں سکتیں۔"
خان بابا کو الفاظ ہی نہ مل سکے جو اسے مطمئن کر سکیں۔

☆☆☆

"خوش الحان۔ اٹھو..... تم سے ملنے آیا ہے کوئی۔" وہ گہری نیند سویا ہوا تھا جب کسی کی آواز نے نیند میں خلل ڈالا۔ اس نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹایا اور اس سے پہلے کہ دوبارہ سے رکھ لیتا پھر پکارا گیا۔
"یار! اٹھ جاؤ۔ کوئی ملنے آیا ہے تم سے۔ نادر ہال سے گھنٹی پر گھنٹی بجا رہا ہے۔ میں اپنا روم چھوڑ کر تمہیں بتانے آیا ہوں۔"
یہ ان کے کمرے کے ساتھ والا ہاسٹل میٹ اکبر تھا۔ خوش الحان بے زاری بھرے انداز میں اٹھا تھا۔
"کون ہے؟" اسے کسی قدر حیرانی بھی تھی کیونکہ موبائل کی وجہ سے جو بھی ملنے آتا تھا، پہلے کال کر کے آتا تھا۔ خان بابا تو ایک دن پہلے ہی بتا دیتے تھے کہ وہ آ رہے ہیں۔
"مجھے کیا پتا۔ ہوگا کوئی انڈر ورلڈ کا ڈان۔ گن پوائنٹ پر تم سے کسی پرانے حساب کو چکتا کرنے آیا ہوگا۔" وہ ناک چڑھا کر کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ خوش الحان سوچتا ہوا بستر سے اترا تھا۔ اس کا دھیان وراثت کی جانب گیا تھا۔ گلے کو جب زیادہ لاڈ آتا تھا تو وہ کوئی نہ کوئی سوغات ضرور بھجوا دیا کرتی تھی۔ وہ گلے سے ناراض تھا۔ اس لیے وجود پر بے زاری بھی زیادہ حاوی ہوئی تھی۔ تساہل سے واش روم سے فراغت کے بعد اس نے مزید دس منٹ کمرے میں ہی لگائے تھے۔ وہ جیسے اپنے ہی گھر والوں کو سزا دینا چاہ رہا تھا۔ اس دوران ہال سے بجائی گئی بھونپو نما گھنٹی اور اس کے نام کی پکار اس نے خود سنی تھی۔ پھر وہ خراماں خراماں چلتا ہوا باہر ہال تک آیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کا ذہن الرٹ ہوا تھا کیونکہ وہ جو بھی تھا وراثت نہیں تھا۔ نیلی جینز پر دودھیا سی رنگت کی فی شرٹ پہنے وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ خوش الحان اس شخص کو بخوبی پہچانتا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا ان کے قریب گیا تھا۔ اسے افسوس ہوا۔ وہ اتنا انتظار کروائے جانے کے حق نہیں تھے۔
"آپ..... آپ مجھے بلوا لیتے۔ میں آ جاتا۔ آپ یہاں..... اس وقت....." وہ گڑبڑایا نہیں تھا لیکن اسے افسوس ضرور ہوا تھا اس لیے الفاظ طریقے سے ادا نہ کر پایا۔ اسے مزید افسوس ہوا۔ اسے انہیں انتظار نہیں کروانا چاہیے تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔
"بیٹے ملنے آئیں تب اچھا لگتا ہے۔ لیکن بیٹوں سے ملنے جاؤ تو بہت اچھا لگتا ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج کچھ "بہت اچھا" ہو۔ اس لیے میں ملنے آ گیا۔"
وہ سادہ اور سپاٹ سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ خوش الحان نے انہیں کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے سارے جذبات ہمیشہ الفاظ کے ذریعے دوسروں تک پہنچتے تھے۔ وہ اسی طرح سے بات کرنے کے عادی تھے لیکن آج خوش الحان کو کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید وہ رشتہ تھا جو اب ان دونوں کے درمیان استوار ہو چکا تھا۔
اتنا کچھ ہو چکا تھا۔ ان سب کی زندگیاں تیزی سے تبدیل ہو رہی تھیں اور ان کے رشتے بھی۔ لیکن خوش الحان کے دل میں اس شخص کا جو اسٹیٹس پہلے دن قائم ہوا تھا اس میں ایک انچ بھی تبدیلی نہ آئی تھی۔ اسے اس شخص پر ترس آتا تھا۔ ایک کامیاب، ہینڈسم پڑھا لکھا، مالی طور پر انتہائی مستحکم مگر لاچار غریب بے چارہ سا شخص۔
"آپ بیٹھ جائیں داؤد انکل۔ میں چائے لاتا ہوں آپ کے لیے۔" اس نے کہا تھا۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

قرۃ العین خرم ہاشمی

تعلق کے پرندے

سارہ! کہاں ہو؟ کب سے آواز دے رہی ہوں۔'' چاروں طرف بکھرے اور ادھورے کاموں سے گھبرا کر آسیہ نے بیٹی کو آواز دی تھی۔

''جی مما!'' سارہ جلدی سے اپنے کمرے سے باہر نکلی اور بھاگتے قدموں سے کچن میں آئی۔ جہاں آسیہ رات کی دعوت کی تیاری کرنے میں مصروف تھیں۔

''یہ کوئی وقت ہے اپنے کمرے میں بیٹھنے کا؟ پتا بھی ہے کہ مہمان آرہے ہیں۔ کتنی تیاریاں باقی ہیں۔ سلاد کون بنائے گا۔ چاول نکال دیے ہیں۔ جب میں کہوں تب اچھی طرح دھو کر بھگو دینا اور فریج میں پانی کی بوتلیں لگائی ہیں؟ گرمی میں جتنا بھی پانی پیو، لگتا ہے کہ پیا ہی نہیں اور وہ جو.....'' آسیہ تیزی سے ہاتھ چلاتی بول رہی تھی جب ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے سامنے آیا۔

''مما! پانی پی لیجیے۔ آج گرمی بہت ہے۔''

اسماء نے نرم مسکراہٹ سے کہا تو آسیہ نے سر ہلایا اور پاس رکھے درمیانے سائز کے اسٹول پہ بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ دونوں بیٹیاں ماں کو محبت سے دیکھ رہی تھیں۔

''مما! میں روبی پھوپھو کے لیے کمرہ سیٹ کر رہی تھی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں وقت پہ سارے کام کر دوں گی۔'' سارہ نے جلدی سے کہا تو اسماء نے اسے گھورا۔

''سارا کام تو میں نے کیا ہے۔ تم نے صرف ڈسٹنگ کی۔ بیڈ شیٹ میں نے تبدیل کی تھی۔ تمہاری ساری بکھری چیزیں بھی میں نے اٹھا کر ان کی درست جگہ پہ رکھی تھیں اور.....'' اسماء جلدی جلدی کام گنوانے لگی۔

''ہاں تو تم بڑی بہن ہو۔ اگر تھوڑا زیادہ کام کر لوگی تو کیا ہو جائے گا۔'' سارہ نے اسے چڑایا۔

''صرف ایک سال چھوٹی ہو مگر بنتی ایسے ہو جیسے کئی سال چھوٹی ہو۔'' اسماء نے منہ بنا کر کہا۔

''تم دونوں کی یہ بحث کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس سے پہلے کہ تم دونوں کی بحث میں مزید اضافہ ہو، میں اٹھ جاؤں۔'' آسیہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ہدایات دینے لگی۔

''اف مما! مہمان کون؟ روبی پھوپھو غیر تھوڑی ہیں۔'' سارہ نے جھنجھلا کر کہا۔

''اچھا! اور فریدہ پھوپھو کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اسماء نے شرارت سے پوچھا۔

''وہ تو مہمان ہی لگتی ہیں۔ وہ بھی دور والا مہمان! جس کے نہ آنے کی خوشی ہوتی ہے اور نہ جانے کی۔ بس ایک فارمیلیٹی ہی بندہ نبھاتا ہے۔'' سارہ نے بے لاگ تبصرہ کیا تو آسیہ نے گردن موڑ کر بیٹی کو دیکھا۔ ماں کے گھورنے پر سارہ فوراً کچن سے باہر چلی گئی جبکہ آسیہ اور اسماء ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''پتا نہیں اسے فریدہ سے کیا مسئلہ ہے۔'' آسیہ نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ویسے مما! سارہ کی بات اتنی غلط بھی نہیں ہے۔ فریدہ پھوپھو سے کسی کو کیا مسئلہ ہوگا وہ تو خود سب کے لئے مسئلہ بن جاتی ہیں۔''

اسماء نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اسماء! بری بات ہے۔ ایسا نہیں کہتے۔'' آسیہ نے بیٹی کو ٹوکا تو اسماء نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگا کر سوری کیا اور پھر سلاد کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''مما! فریدہ پھوپھو کیا ہمیشہ سے ایسی تھیں؟'' اسماء کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تو ماں سے سوال کرنے لگی جو کوفتے کے گولے بنا کر اب فرائی کر رہی تھی۔

''ہاں! فریدہ کا مزاج ہمیشہ سے تھوڑا تیز ہے جبکہ روبینہ عرف روبی اس کے برعکس بہت نرم مزاج اور اچھے دل کی مالک ہے۔'' آسیہ نے مصروف انداز میں کہا۔

''فریدہ پھوپھو کا مزاج تھوڑا تیز نہیں، فور جی سے بھی تیز ترین ہے۔'' اسماء نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اپنی فریدہ پھوپھو کے مزاج کا پوسٹ مارٹم بعد میں کرنا۔ پہلے دیکھ کر آؤ کہ سارہ کیا کر رہی

کھیرے کا قتلہ دانتوں سے کترتی، سر ہلاتی کچن سے باہر نکل گئی۔

''فریدہ کے تیز مزاج اور سخت زبان کو مجھ سے بہتر کون جانے گا۔''

بیٹی کے جانے کے بعد آسیہ نے ناگواری سے خود کلامی کی تھی۔ وہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ، خاندانی سیاست یا مسئلوں پہ ہرگز گفتگو نہیں کرتی تھیں مگر انسان ہونے کی حیثیت سے وہ دوسروں کے برے رویے سے ہرٹ بھی ہوتی تھیں اور انہیں یاد بھی رکھتی تھیں۔ آسیہ اکلوتی بھابھی تھیں مگر فریدہ نے ہمیشہ ان کے ساتھ عجیب سا رویہ رکھا تھا۔ آسیہ نے سر جھٹک کر اپنا باقی رہ جانے والا کام تیزی سے ختم کرنے لگیں۔ پسندیدہ نند کے آنے سے پہلے وہ سب کام مکمل کرنا چاہتی تھیں تاکہ اس کے پاس بیٹھ کر باتیں بھی کر سکیں۔

☆☆☆

''آسیہ! تم نے اتنا تکلف کیوں کیا۔ میں اکیلی ہی تو آئی ہوں۔'' روبی نے کھانے کی میز پہ دو سالن، چاول، شامی کباب کے ساتھ سلاد، رائتہ دیکھتے ہوئے حیرانی سے سوال کیا۔

''تکلف کیسا۔ تم کون سا روز روز آتی ہو۔'' آسیہ نے محبت سے کہا تو روبی کا چہرہ روشن ہو گیا۔

''روبی پھپھو! اچھا ہے نا، آپ کی وجہ سے ہمارے بھی عیش ہو گئے ہیں۔'' سارہ نے جلدی سے کہا تو حامد بیٹی کی بات سن کر ہنس پڑے۔

''روبی پھوپھو! سارہ آپی کتنی بھوکی ہیں نا۔'' سارہ سے دو سال چھوٹے عمیر نے کہا۔

''او رئم کیا ہو۔ موٹو!'' سارہ نے بھائی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ارے اب تم دونوں ہمیشہ کی طرح لڑنا مت شروع کر دینا۔ کھانا کھاؤ شاباش۔'' روبی پھپھو نے جلدی سے کہا اور پھر اپنے ساتھ بیٹھے عمیر سے پوچھ کر اس کی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگیں۔

''روبی پھوپھو! آپ کھانا کھائیں۔ میں سیرو دیکھ لیتی ہوں۔'' اسماء نے جلدی سے کہا تو روبی نے سر ہلایا اور اپنے سامنے رکھی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''صدیق بھائی اور واصف کیوں نہیں آئے۔'' آسیہ نے کھانا کھاتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے تو اصرار کیا تھا مگر انہیں کل کسی ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ کہنے لگے کہ تم نے دو دن رہنا ہے، آرام سے رہو۔ میں پرسوں لینے آجاؤں گا اور جہاں تک بات ہے، واصف کی تو اس کے امتحان ہونے والے ہیں۔ بس اسی میں مصروف ہے۔ گھر سے کم ہی نکلتا ہے۔''

روبی پھوپھو نے اپنے شوہر اور اکلوتے بیٹے واصف کا ذکر کرتے ہوئے کہا تو آسیہ نے سر ہلا دیا۔

''اس سال واصف کی تعلیم مکمل ہو جائے گی۔ آگے کیا کرے گا نوکری یا باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے گا۔'' حامد نے کھانا کھاتے ہوئے سوال کیا۔

''ارادہ تو واصف کا نوکری کرنے کا ہے مگر اس کے باپ کی ضد ہے کہ اپنا خاندانی کاروبار سنبھالے۔'' روبی پھوپھو نے تفصیل سے بتایا۔

کھانے کے بعد ٹھنڈے اور لذیذ فروٹ ٹرائفل کا دور چلا۔ اس کے بعد حامد تو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ باقی سب لاؤنج میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

''بھئی۔ میں تو اب عشاء کی نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ صبح جلد اٹھنا بھی ہے۔ میری طرف سے شب بخیر۔ چلو عمیر!''

آسیہ نے وہاں سے اٹھتے ہوئے عمیر کو گھورا جس کا دل ابھی مزید باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا مگر صبح اس نے اسکول جانا تھا۔ ماں کی گھوری پہ دل پہ پتھر رکھ کر اٹھا، روبی پھپھو سے پیار لیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ روبی پھپھو کو لے کر اسماء اور سارہ بھی اپنے کمرے میں آ گئیں۔ اسماء فرسٹ ایر میں پڑھتی تھی جبکہ سارہ میٹرک میں تھی۔

ایک ٹیمپرس کے آؤ۔ ہم کیوں بیڈ پہ کیسے سوئیں گے؟" روبی پھپھو نے کہا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"روبی پھپھو! بالکل ویسے ہی جیسے ہم بچپن میں آپ کے ساتھ سوتے تھے۔" سارہ نے کہا تو روبی مسکرادی۔ پھر وہ دونوں روبی پھپھو کے دائیں، بائیں لیٹ کر ان سے باتیں کرنے لگیں۔ کبھی دادا، دادی کے قصے، کبھی ان دونوں کے بچپن کی شرارتیں، کبھی مستقبل کے منصوبے، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے، وہ بھول گئیں کہ رات گہری ہو چکی ہے۔

☆☆☆

"پھر کیسا رہا تمہارا ویک اینڈ۔ سنا ہے تین دن رہ کر آئی ہو۔" روبی کے گھر واپس پہنچنے کے اگلے دن فریدہ کا صبح سویرے ہی فون آ گیا۔ روبی، صدیق اور واصف کے جانے کے بعد، ناشتہ کر کے چائے پی رہی تھی۔ فریدہ کی تیز آواز سنتے ہی روبی کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تم تک خبر پہنچ گئی؟" روبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھ تک کیا۔ سارے خاندان کو پتا ہوگا۔ تمہاری لاڈلی بھتیجی نے واٹس ایپ پہ اسٹیٹس لگایا ہوا تھا۔ بھئی پھوپھو کی محبت جاگ گئی ہے۔"

فریدہ نے ہمیشہ کی طرح طنزیہ انداز میں کہا۔

"محبت تو وہ سب مجھ سے ہمیشہ سے کرتے ہیں۔" روبی نے فوراً کہا۔

"سب پتا ہے۔ اتنے اچھے ہوتے تو دوسری پھوپھو سے بھی اتنی ہی محبت کرتے۔ اس کے آنے پہ بھی خوش ہوتے۔ سب تمہیں مسکہ لگا رہے ہیں۔ آخر کو اکلوتے اور قابل بیٹے کی ماں ہو۔ اگلے سمجھ دار ہیں۔" فریدہ نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"فریدہ! تم مجھ سے عمر میں تین سال چھوٹی ہو مگر ذہنی طور پر کئی سال پیچھے ہو۔ تمہیں ایسی بات کہتے ہوئے شرم کرنی چاہیے۔"

روبی نے سخت لہجے میں کہا تو فریدہ کو اپنے لفظوں کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

ہے۔" فریدہ نے کمزور لہجے میں کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہونی تھی مگر واصف کو اپنی کلاس فیلو پسند ہے اور وہ اس کے بارے میں ہمیں پہلے ہی بتا چکا ہے۔ میں نے پہلے سے شور نہیں مچایا کہ دونوں امتحان دے کر فارغ ہو جائیں تو رشتے کی بات چھیڑوں گی۔"

روبی نے تفصیل سے بتایا تو فریدہ حیرت سے اچھل پڑی۔

"بہت بے وقوف ہو تم! واصف پسند کی شادی کر کے تمہاری زندگی مشکل بنا دے گا۔ من چاہی بیوی بن کر آنے والی کا نخرہ ہی کم نہیں ہونا۔ تمہاری خدمت کیا خاک کرے گی۔"

فریدہ اب دوسرے ٹریک پہ بولنے لگی تو روبی گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ فریدہ کی منفی سوچ کو بدلنا آسانا ہرگز نہیں تھا۔

☆☆☆

"روبی تو بہت تعریفیں کر رہی تھی تم لوگوں کی۔ خاص کر سارہ اور اسماء کی۔ ایسا کیا کر دیا ہے انہوں نے۔ روبی تو ان کے گن گا رہی تھی۔"

فریدہ کی تیز آواز سنتے ہوئے، آسیہ مسلسل نرمی سے جواب دے رہی تھیں۔

"بس بچیوں کو شروع سے روبی سے زیادہ لگاؤ ہے۔ روبی بھی میرے بچوں سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس بار بھی تینوں کے لیے تحفے لائی تھی۔ حالانکہ میں منع کرتی ہوں مگر وہ سنتی ہی نہیں۔" آسیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"خیر، تحفے تو ہم نے بھی ہمیشہ دیے ہیں مگر نہ کبھی روبی جیسا پروٹوکول ملا اور نہ اتنی محبت۔" فریدہ نے جلے دل کے ساتھ کہا تو آسیہ کوئی سخت جملہ کہتے ہوئے رک گئیں۔

"تم سناؤ بچے کیسے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں؟" آسیہ نے موضوع بدلا۔

''کیا کرنا ہے۔ بے چارے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ ایک ماموں ہے اور وہ بھی اپنے گھر نہیں بلاتا۔''
فریدہ نے کہا تو آسیہ خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئیں۔
''ہاں تو کسی دن آجاؤ۔ کس نے منع کیا ہے۔''
آسیہ نے کہا تو سامنے والے صوفے پر بیٹھی سارہ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ماں کو نہیں نہیں کا اشارہ کیا تھا۔
''اتنی بے دلی سے بلا رہی ہو۔ بھئی بندہ خلوص سے کہتا ہے۔'' فریدہ نے نخرے سے کہا۔
''نہیں فریدہ! بے دلی کیسی! تم شوق سے آؤ۔ بس آنے سے پہلے مجھے بتا دینا۔'' آسیہ نے گہری سانس لے کر کہا اور کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔
''مما! فریدہ پھوپھو آرہی ہیں؟'' سارہ نے کتاب ہاتھ میں پکڑ کر فکرمندی سے سوال کیا تو آسیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
''کہہ تو رہی تھی۔ اب دیکھو۔'' آسیہ نے کندھے اچکا کر کہا اور صوفے پر بیٹھ گئیں۔
''اونو مما!'' سارہ نے کھلی کتاب میں سر گرایا۔
''تم اور اسٹیٹس لگاؤ۔ شو مارو۔ لو یو روبی پھپھو۔ بہت مزا آرہا ہے۔ بیسٹ ویک اینڈ۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب مزے کرو۔ جب فریدہ پھپھو اپنے چار عدد بچوں کے ساتھ رہنے آئیں گی۔'' اسماء نے آنے والے دنوں کا خوفناک نقشہ کھینچا تھا۔
''مجھے کیا پتا تھا کہ فریدہ پھپھو میرے لگائے معصوم اسٹیٹس سے اتنی متاثر ہو جائیں گی۔ میرے تو امتحان بھی قریب ہیں۔ میں ان کی بیٹیوں کو اپنے کمرے میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔'' سارہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔
''میں انہیں عمیر کا کمرہ دے دوں گی۔ بس وہ یہاں سے خوش ہو کر واپس جائیں۔'' آسیہ نے فکرمندی سے کہا۔
''یہ تو ناممکن سی بات ہے۔'' اسماء نے فوراً کہا۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے ہنس پڑیں۔

''چلو دیکھتے ہیں۔'' آسیہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''واہ جی! ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ سارہ بی بی کے امتحان ہونے والے ہیں۔ بند کمرے میں پڑھائی ہو رہی ہے اور یہاں چھپ کر موبائل استعمال کیا جا رہا ہے۔'' فریدہ نے ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا تو اپنے دھیان میں موبائل فون دیکھتی سارہ اچھل پڑی تھی۔ فریدہ کے پیچھے نویں جماعت کی رمشا کھڑی تھی۔ ماں کو یہ خبر اس نے ہی پہنچائی تھی۔
''فریدہ پھوپھو! ابھی پڑھ کر فارغ ہوئی ہوں۔ سوچا اپنی دوستوں سے حال احوال پوچھ لوں۔'' سارہ نے موبائل بند کر کے ایک طرف رکھا۔
''کبھی اپنی پھپھو کا حال پوچھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ دوستیں بہت پیاری ہیں۔'' فریدہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے شروع ہو گئی۔ اس کی عادت تھی شکوے شکایتیں کرنے کی۔
''ایسی بات نہیں ہے فریدہ پھوپھو!'' سارہ نے بیزاری سے کہا۔
''بہت تیز ہو تم! میری رمشا اور رمنا بل بھی ہیں۔ بڑوں کے سامنے کبھی زبان درازی نہیں کرتیں۔'' فریدہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''فریدہ! تم یہاں بیٹھی ہو۔ میں چائے پہ انتظار کر رہی ہوں۔'' اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر آسیہ اندر آئیں۔ سارہ نے دل میں شکر ادا کیا تھا۔
''چائے کیوں بنائی ہے۔ بلاوجہ کا تکلف کیا ہے۔ ویسے تمہاری بیٹیاں کوئی کام نہیں کرتیں۔ میں جس دن سے آئی ہوں، ان دونوں کو کمرے میں بند دیکھ رہی ہوں۔ روبی تو کہتی ہے کہ دونوں لڑکیاں بھاگ بھاگ کر کام کرتی، ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ پتا نہیں ہمیں دیکھ کر سب کو کیا ہو جاتا ہے۔'' فریدہ نے تلخی سے کہا تو سارہ نے بے چارگی سے ماں کی طرف دیکھا۔ آسیہ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
''ایسا نہیں ہے۔ خیر تم آؤ چائے کے ساتھ

رول اور سموسے بھی ہیں۔"

آسیہ نے جلدی سے کہا تو فریدہ اور رمشا سر ہلاتی ان کے پیچھے چلی گئیں۔

"اللہ میاں! ساری پھوپھیاں روبی پھپھو جیسی کیوں نہیں ہوتی ہیں۔ اف کیسے کٹیں گے چار دن؟"

سارہ نے تپ کر سوچا۔ فریدہ کو آئے ابھی ایک دن ہوا تھا مگر انہوں نے اپنی زبان کے جوہر اور مسلسل تنقید سے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ فریدہ کے بڑے دو بیٹے کالج میں پڑھتے تھے۔ رمشا اور منابل نویں اور آٹھویں جماعت میں زیر تعلیم تھیں۔ رمشا انتہا کی چغل خور، دوسروں کی ٹوہ لینے والی تھی جبکہ منابل منہ پھٹ اور صاف گو بچی تھی۔ رمشا، ماں کو ہر بات کی خبر دینا اپنا اولین فرض سمجھتی تھی۔ فریدہ کے ساتھ، اس کے بیٹے نہیں آئے تھے۔ وہ باپ کے ساتھ گھر پہ تھے۔

☆☆☆

"اچھی بہن ہو نا۔" سارہ نے کروٹ بدل کر دوسری طرف منہ کر کے لیٹی ہوئی اسماء کو میٹھے لہجے میں پکارا۔

"اچھی بہن کو سونے دو۔" اسماء نے مطمئن انداز میں کہا۔ سارہ کہنی کے بل سر ہتھیلی پہ رکھ کر بہن کی پشت کو گھورنے لگی۔

"کیا ایک نیک فطرت، اچھے دل، روشن مستقبل کے خواب دیکھنے والی پُرعظم لڑکی یہ برداشت کرے گی کہ اس کی معصوم، سیدھی، سادھی، ناولز کی ہیروئن جیسی بہن رات کے اس پہر پیٹ میں اچھل کود کرتے چوہوں سے شکست کھا کر ساری رات جاگے؟" سارہ نے افسردہ لہجے میں کہا تو گہری سانس لے کر اسماء سیدھی ہوئی اور چھت پہ گھومتے پنکھے کو دیکھنے لگی۔

"پچھلے تین دن سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے کہ جیسے میں بھی اس پنکھے کی طرح گول گول گھوم رہی ہوں۔ سارا دن فریدہ پھوپھو گھماتی رہتی ہیں۔ رات کو تمہارے ڈرامے۔ سب کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھایا تھا؟" اسماء نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو سارہ اس سے پہلے چھلانگ مار کر بیڈ سے نیچے اتر گئی اور پرجوش انداز میں بولنے لگی۔

"سب کے ساتھ کھانا کھایا تھا مگر تھوڑا سا کیونکہ فریدہ پھوپھو کی تیز نگاہیں ہر نوالے کا پہلے اچھی طرح پوسٹ مارٹم کرتی ہیں اور پھر....."

وہ دونوں کمرے سے نکل کر لاؤنج سے ہوتی کچن کے دروازے کے پاس پہنچی تھیں۔ اسماء اس کی باتیں سنتے ہوئے اردگرد سے انجان تھی۔

"فریدہ پھپھو!" سارہ نے حیرانی سے کہا۔

"کیا رات کے اس پہر بھی فریدہ پھپھو کی گردان کر رہی ہو۔ پتا بھی ہے کہ شیطان کا نام لو اور....."

اسماء کی آدھی بات منہ میں رہ گئی کیونکہ کچن کے وسط میں کیبنٹ کے دروازے کھول کر کھڑی فریدہ، اس اچانک چھاپے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اسماء بھی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی جو جلدی جلدی سب کیبنٹ کے دروازے بند کر رہی تھی۔

"وہ میں گرین ٹی کی پتی ڈھونڈ رہی تھی۔ میرے خیال سے رمشا بلا رہی ہے۔"

فریدہ نے بوکھلا کر کہا اور پھر تیزی سے ان کے پاس سے گزر کر کمرے میں چلی گئی۔ سارہ اور اسماء نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"فریدہ پھپھو کی شروع سے عادت ہے۔ ہر دراز، ہر الماری کھول کر تلاشی لینے کی۔"

سارہ نے کہا تو اسماء نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ دونوں مسکراتے ہوئے فریج کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

روبی پھوپھو نے واصف کا رشتہ طے کر کے سارے خاندان میں مٹھائی تقسیم کی تو ہر طرف سے مبارکباد کے فون آنے لگے۔ سارہ اور اسماء نے ضد کی کہ وہ سب مل کر واصف کا رشتہ پکنے ہونے کی خوشی منائیں گی۔ روبی پھوپھو نے سوبسم اللہ کہا اور ایک دن ویک اینڈ پر دوپہر کی دعوت پہ حامد کی پوری فیملی کے ساتھ فریدہ کی فیملی اور دو اور قریبی لوگوں کو مدعو کر لیا۔ سارہ اور اسماء بہت پرجوش تھیں۔ روبی پھوپھو سے ان کا دلی تعلق تھا۔ اس لیے ان کے گھر کی پہلی اور آخری خوشی کو وہ دونوں بھی دل سے منانا چاہتی

ہیں۔ مجھ سے تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔" فریدہ نے بیزاری سے کہا۔

"تم نے پرندوں کے لیے دانے اور پانی رکھا ہے؟" روبی نے سوال کیا۔

"کئی بار رکھا ہے مگر یہاں کوئی پرندہ نہیں آتا۔ تمہارے گھر پتا نہیں کیسے آجاتے ہیں۔" فریدہ نے کہا تو روبی ہنس پڑی۔

"روز ڈالا کرو۔ ضرور آئیں گے۔ اچھا میں اب فون بند کرتی ہوں۔ پرسوں وقت پہ آجانا۔" روبی نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ فریدہ کسی گہری سوچ میں گم پرسوں کی پلاننگ کرنے لگی۔

☆☆☆

روبی پھوپھو خوشی سے بھرپور چہرے کے ساتھ، سارہ اور اسماء کے ساتھ باقی لڑکیوں کو ڈھولکی بجاتے اور گانے گاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لڑکیوں نے ڈھولکی بجانے کی ضد کی۔ سب بڑے انھیں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

"چلو اب آئس کریم کھالو۔ باقی گانا، بجانا بعد میں۔" روبی پھوپھو نے ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ ٹرے میں رکھے آئس کریم کپ سب کو پیش کرنے لگی۔ مرد ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے جبکہ خواتین نے لاؤنج میں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔

"بھئی آسیہ! تم نے اپنی بیٹیوں کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔"

اچانک فریدہ نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا تو سب چونک کر انھیں دیکھنے لگے۔

"فریدہ!" روبی پھوپھو سمجھ گئیں اس لیے انہوں نے بہن کو ٹوکا مگر فریدہ کب کسی کی سنتی تھی۔

"کیا ہوا؟" آسیہ نے فکرمندی سے سوال کیا۔ روبی کی سسرالی خواتین حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"تمہاری بیٹیاں بہت چالاک اور جھوٹی ہیں۔ روبی سے کہتی ہیں کہ میں کچن کی تلاشی لے رہی تھی۔ کیوں کیا تم نے وہاں خزانے دفنائے ہوئے ہیں۔" فریدہ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ سارہ اور اسماء معمول وہ حسد کا شکار ہوگئی۔

"پتا نہیں تم نے کون سے تعویذ گھول کے پلائے ہیں۔ ورنہ وہ دونوں اتنی محبت کرنے والی تو ہرگز نہیں لگتی ہیں۔ میں چار دن کتنی مشکل سے ان کے گھر گزار کے آئی ہوں۔ تمہیں کیا بتاؤں۔ دونوں لڑکیاں کام چور، موبائل کی شوقین ہیں۔ سارا دن پڑھائی کے بہانے کمرے میں بند اور رات کو سارے گھر میں مٹرگشت کرتی ہیں جیسے بدروح ہوں۔"

فریدہ نے جلے دل سے کہا۔ وہ دونوں بہنیں ہر روز کی طرح فارغ وقت میں فری منٹس پہ باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی کال کا دورانیہ کبھی بھی ایک گھنٹے سے کم ہرگز نہیں ہوتا تھا۔

"ویسے تم آدھی رات کو ان کے کچن میں کیبنٹ کھول کر کیا ڈھونڈ رہی تھیں؟"

روبی نے مسکرا کر پوچھا تو فریدہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں کوئی چور ہوں۔ تمہیں یہ بات کس نے بتائی۔ نام بتاؤ اس کا۔ میں ابھی پوچھتی ہوں۔" فریدہ نے غصے سے کہا

"فریدہ! میں مذاق کر رہی ہوں۔ بچیوں نے ہی ہنستے ہوئے بتایا کہ وہ تمہیں کچن میں دیکھ کے ڈر گئی تھیں۔ اس میں ایسا کیا ہے۔"

روبی نے نرمی سے کہا مگر فریدہ کو اپنی شدید بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔

"سب سمجھتی ہوں میں۔" فریدہ نے سر جھٹک کر کہا۔

"اچھا غصہ مت کیا کرو۔ ایک منٹ۔ میں چڑیوں کے خالی برتن میں پانی ڈال لوں۔" روبی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ کافی دیر سے کھلی کھڑکی سے پرندوں کو صحن میں رکھے خالی برتن پہ اڑتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ روبی نے پہلے پرندوں کے لیے برتن میں پانی اور دانہ بھرا اور پھر دوبارہ فون پکڑ کر کان سے لگالیا۔

"ایک تو تم نے فضول کے شوق پالے ہوئے

کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ آسیہ نے انہیں گھورا۔

''فریدہ پھپھو! ہم آپ کو اچانک وہاں دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ روبی پھپھو سے اس بات کا ذکر ضرور کیا تھا مگر آپ کی برائی نہیں کی۔'' سارہ نے شرمندگی سے کہا۔

''فریدہ! میری بچیوں کی روبی سے بہت دوستی ہے۔ انہوں نے مذاق میں بات کر دی ہوگی مگر میں پھر بھی معذرت کرتی ہوں۔''

آسیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ دوسری خواتین طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھیں۔ آسیہ کو سب کے سامنے بہت بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ یہ ہی حال سارہ اور اسماء کا تھا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کی کہی عام سی بات، سرِ محفل ان کے منہ پہ ماری جائے گی۔ سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ خوشی کی محفل میں سنجیدگی کا رنگ غالب آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد روبی کے سسرالی رشتے دار چلے گئے تو روبی غصے سے بھری بہن کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''فریدہ! آسیہ کی بیٹیاں، تمہاری بھتیجیاں بھی ہیں۔ تمہارا اپنا خون ہیں۔ تم یہ بات سرِ محفل کہنے کے بجائے، بعد میں بھی کہہ سکتی تھیں نا۔''

روبی نے سنجیدگی سے کہا تو فریدہ چونک گئیں۔ جبکہ اسماء اور سارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بہت معذرت روبی! ہماری وجہ سے تمہاری پہلی خوشی کا فنکشن خراب ہوا۔'' آسیہ نے دل گرفتی سے کہا اور پھر دونوں بیٹیوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں نے تو ویسے ہی کہا تھا۔ اس میں اتنا برا ماننے والی کیا بات ہے۔'' فریدہ نے دونوں بچیوں کی نم آنکھیں اور بجھے چہرے دیکھ کر شرمندگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں! تمہارا حق ہے۔'' آسیہ نے نرمی سے کہا اور ان دونوں سے مل کر گھر سے باہر نکل گئیں۔ عمیر جا کر باپ کو بلا لایا تھا۔ حامد ان کے اتنی جلدی وہاں سے اٹھنے پہ حیران ہوئے مگر آسیہ نے خراب طبیعت کا بہانا بنا کر انہیں مطمئن کر دیا تھا۔ سارا راستہ اسماء اور سارہ نم آنکھوں سے گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھتی رہی تھیں۔ قریبی رشتوں سے بھرے پیالے ایسے ہی چھلک جاتے ہیں۔

☆☆☆

''مما! آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں۔ آپ کی وجہ سے سب ہم سے بھی منہ بنا لیتے ہیں۔'' ان کے جانے کے بعد، منہ پھٹ منال نے فریدہ سے کہا تو فریدہ نے غصے سے بیٹی کو گھورا۔

''ابھی بتاتی ہوں۔'' فریدہ نے اپنی جوتی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو منال پیر پٹختی لاؤنج سے باہر چلی گئی۔

''میں نے ایسا کیا کر دیا ہے۔ سب مجھے ہی برا کہتے ہیں۔'' فریدہ نے تنگ آ کر خاموش بیٹھی روبی سے پوچھا۔ جو چہرے پہ اداسی لیے، کھڑکی سے نظر آتے اپنے صحن کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں، پانی اور دانے کے برتن پہ آئے پرندوں پہ مرکوز تھیں۔ فریدہ نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور حیران رہ گئی۔

''اتنے سارے پرندے!'' فریدہ کے لہجے میں ستائش تھی۔

''فریدہ! تم ہمیشہ کہتی ہو نا کہ تمہارے رکھے گئے پانی اور دانے کے برتن پہ پرندے نہیں آتے ہیں۔'' روبی نے پرسوچ انداز میں کہا تو فریدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ تم باقاعدگی سے پرندوں کے لیے یہ اہتمام نہیں کرتی ہو۔ ایک یا دو بار دانہ ڈالنے سے پرندے نہیں آتے۔ ہر روز صاف برتنوں میں دانہ اور پانی ڈال کر ان کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تب اللہ کی یہ بے زبان مخلوق، رحمت اور برکت بن کر ہمارے آنگن میں اترتی ہے۔ چہچہاتی ہے۔'' روبی نے کہا تو فریدہ نے غور سے صحن میں شور مچاتے پرندوں کو دیکھا تھا۔

''تمہیں ہمیشہ یہ شکوہ رہا کہ سب تمہاری نسبت، مجھ سے زیادہ پیار اور لگاؤ کیوں رکھتے ہیں؟ حالانکہ رشتہ ہم دونوں کا ایک ہی ہے۔

اس لیے کیونکہ میں مدت سے، تعلق کے پرندوں کو محبت کا دانہ ڈال رہی ہوں۔ میرے

رشتوں کے آنگن میں، سب رشتے اسی لیے پنپتے ہیں کیونکہ میں نے ایک عمر، انہیں دی ہے۔'' روبی نے نم لہجے میں کہا تو فریدہ گم صم انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''میری بہن! تعلق کے پرندے، اسی آنگن میں اترتے ہیں، وہاں ہی چہچہاتے ہیں، جہاں محبت کے دانے رکھے جاتے ہیں۔ جہاں میٹھے بولوں جیسا روح کو تر کر دینے والا پانی ہوتا ہے۔ تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تمہیں انسانوں اور پرندوں کے لیے اپنے آنگن میں دانے اور پانی رکھنا نہیں آیا۔ پھر تم خود ہی بتاؤ کہ تمہارے آنگن میں تعلق کے پرندے کیونکر اتریں؟ اتر بھی جائیں گے تو تمہارے لہجے اور لفظوں کی گھن گرج سے ڈر کر فوراً اڑ جائیں گے۔ میری بات پر یقین نہیں تو ذرا ان پرندوں کے پاس آہٹ کر کے دیکھو۔ یہ دانہ کھانے میں کتنے ہی مگن کیوں نہ ہوں، شور پر فوراً اڑ جاتے ہیں۔ انسانی فطرت، ان پرندوں سے زیادہ آزاد اور جلد باز ہے۔ رشتوں کے آنگن سے اگر تعلق کے پرندے اڑ جائیں تو پھر آپ لاکھ محبت کے دانے ڈالیں، وہ پرندے واپس اپنی مرضی اور پسند سے ہی آئیں گے۔''

روبی نے سنجیدگی سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ فریدہ نے شرمندگی سے خالی پڑے لاؤنج پہ ایک نگاہ ڈالی۔ اس کی بداخلاقی نے آج کئی دلوں کو رنجیدہ اور کئی آنکھوں کو نم کر کے خوشی کے سب رنگ پھیکے کر دیے تھے۔ فریدہ کو پہلی بار اپنے دل پہ بوجھ محسوس ہوا تھا۔ برے اخلاق اور بدصورت رویے کا بوجھ۔

☆☆☆

''فریدہ پھپھو! بس کریں میرا دم نکل جائے گا۔''

سارہ نے بمشکل کہا کیونکہ فریدہ نے اسے زور سے خود میں بھینچا ہوا تھا۔ روبی اور آسیہ اس کی حالت دیکھ کر ہنس پڑیں۔ آج صبح فریدہ اور روبی بیکری کا ڈھیر سارا سامان لے کر حامد کے گھر پہنچی تھیں۔ سارہ اور اسماء کو دیکھتے ہی فریدہ نے گلے سے لگا کر بہت پیار کیا۔ یہ اپنے نکل والے برے رویے کا ازالہ تھا۔

''تم لوگ مجھے بہت عزیز ہو۔ بس جی تھکی ہو جاتی ہے نا۔'' فریدہ نے بڑی ہوتے ہوئے بھی شرمندگی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔

''فریدہ! پرانی باتوں کو چھوڑو۔ میں پکوڑے بناتی ہوں۔ زبردست سی چائے اسماء بنائے گی۔'' آسیہ نے جلدی سے کہا۔

''میں تو فریدہ پھوپھو کا لایا پیزا کھاؤں گی۔'' سارہ نے جلدی سے کہا۔

''میری شہزادی کے لیے ہی ہے۔'' فریدہ نے اس کی بلائیں لی تھیں۔

''ہائے! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ روبی پھپھو! ذرا مجھے چٹکی کاٹ کر دیکھیں۔'' سارہ نے شرارت سے کہا۔

''میں حاضر ہوں۔'' پاس سے گزرتی اسماء نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور زور کی چٹکی اس کے بازو پہ کاٹی اور بھاگ گئی۔ سارہ تڑپ کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ روبی اور فریدہ ان دونوں کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

''حیرت ہے مما! آج آپ کی وجہ سے سب ہنس رہے ہیں۔'' منال نے ہمیشہ کی طرح بے لاگ تبصرہ کیا تو فریدہ نے بیٹی کو گھورا۔

''بیٹا جی! لگتا ہے تمہیں شوز تھراپی کی شدت سے ضرورت ہے۔'' فریدہ نے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ جوتی کی طرف بڑھایا تھا کہ منال فوراً رفو چکر ہو گئی۔

''رمشا جاؤ! اسماء اور سارہ کی کچن میں مدد کرو۔''

فریدہ نے سمجھ دار ماں ہونے کا ثبوت دیا تو رمشا فوراً سر ہلاتی وہاں سے اٹھ گئی۔ روبی اور فریدہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیں۔

''تم ٹھیک کہتی تھیں، تعلق کے پرندے، ہمیشہ محبت کے دانوں پہ ہی، رشتوں کے آنگن میں اترتے ہیں۔''

فریدہ نے روبی کا ہاتھ دباتے ہوئے نرم لہجے میں سرگوشی کی تھی۔ روبی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ دیر سے ہی سہی، مگر فریدہ نے رشتوں کو سنبھالنے کا ہنر سیکھ ہی لیا تھا۔

☆

قرۃ العین سکندر

دل دیا جیا

جون کی چلچلاتی دھوپ نے ہر ذی نفس کو ادھ موا کر رکھا تھا۔ اور تپش سے بچنے کے لیے چرند پرند اپنے آشیانوں میں گھسے، خشک زبان لیے، ترستی نگاہوں سے آسمان کی طرف کسی ابر رحمت کی آس میں تکتے تھے مگر مجال ہے جو جیا کو پل بھر کے لیے بھی سکون ہو۔ اس سے تو بیٹھنا ہی محال تھا۔

جب تپتی دوپہر میں سب اہل خانہ ستانے کے لیے لیٹ جاتے وہ چپکے سے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیتی تھی۔ ایک دن تو بی جان نے اسے پکڑ لیا تھا۔

''اے اللہ کی مار ہو تم پر۔ کم بخت، نگوڑی مار..... فریج میں ہی باؤل میں منہ دے آلو چھولے کی چاٹ پرندیدوں کی طرح ٹوٹی پڑ رہی ہو۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی مگر عقل کوری.....'' بی جان نے ایک زوردار دھموکا اس کی کمر پر جڑ دیا تھا۔

وہ ہائے کر کے کراہی تھی۔

''ایک تو آپ کو اس بڑھاپے میں بھی آرام نہیں۔ سیکرٹ سروس چالو ہی رکھتی ہیں۔'' اب ان نادیدہ دانتوں کے بنا کیسے چبائیں گی اتنے سخت چھولے۔

''میری عمر ہے کھانے دیں مجھے۔''

وہ ڈھٹائی سے بولی تھی اور مزے سے باؤل سے پلیٹ بھر کر وہیں کچن میں کرسی پر بیٹھ کرسی سی کر کے پاؤں ہلاتے ہوئے کھانا شروع ہو چکی تھی۔

اور بی جان حیران پریشان اس کی لن ترانیاں ملاحظہ کر رہی تھیں۔

''اگر تو انسان کی بچی نہ بنی تو میں تجھے ایسی چار چوٹ کی ماروں گی کہ یاد کرے گی۔ ارے کم بخت نحوست ماری یہ ہلنا تو بند کر۔ اللہ کی پناہ نری شیطانی حرکت۔ سارا دن پیر ہلاتے گزر جاتا ہے۔ اگلے گھر جا کر ہماری ناک کٹوائے گی۔''

بی جان نے اسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''اب بندہ سکون سے کھا بھی نہیں سکتا۔ معلوم ہے نا، مجھ سے نہیں کھائے جاتے روز روز ٹنڈے۔ شکر ہے کچھ تو نصیب ہوا اور مجھے اگلے گھر کی بات کر کے نہ چھیڑا کریں۔''

وہ دوپٹہ منہ میں ڈال کر مسخرے پن سے بولی تھی تبھی بی جان نے اپنی چپل نشانہ تاک کر اس پر پھینکی۔ مگر تب تک وہ بیہ جا وہ جا.....

''دفعان ہو کم بخت کہیں کی۔''

بی جان اب اپنی چپل کی تلاش میں چشمہ ناک پر درست کرتی اسے صلواتیں سنا رہی تھیں۔

☆☆☆

جون کا مہینہ، تپتی دھوپ اور ہر نیا دن آندھی کی آمیزش لیے ہوا کرتا ہے۔ بی جان نے بہو بیگم سے کہہ کر کام والی ماسی سے چھوٹی چھوٹی کیریوں پر نمک مرچ لگوا کر تیز دھوپ میں رکھوا دیا تھا۔ پتی دھوپ میں بننے والی کیریاں بہت ہی مزے دار بنتیں اور جیا کے تو منہ میں پانی آ رہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ کب بی جان اور اماں قیلولے کے لیے لیٹیں اور وہ ان سے دو دو ہاتھ کرے۔

''اس ندیدی کو بھی کوئی عقل دے۔ نگوڑی اونٹ کی اونٹ ہو گئی۔ مجال ہے کہ کوئی کام ڈھنگ کا

کرلے۔ سارا دن پتنگ توڑتی رہتی ہے یا کامران کے بچوں کے ساتھ لڈو کھیل رہی ہے۔ ابھی کچھ سکھاؤ گی تب ہی سیکھے گی نا۔"

بی جان مسلسل اس کو نظر میں رکھے ہوئے تھیں۔

"بس اماں! کیا کروں۔ ایک سین ہے اتنی بکھڑ سارا گھر اس اکیلی نے سنبھالا ہوا ہے اور اس کو دیکھیں صرف لاابالی طبیعت، کوئی نصیحت کرو ہنسی ٹھٹھول میں اڑا دی اور کل میں نے اس کی الماری دیکھی پہچان مشکل تھی کہ ان میں دوپٹہ کون سا ہے اور قمیص کون سی ہے۔ ست رنگی بنی پھرتی ہے۔"

اماں جان کے پاس تو اپنی ہی شکایات کا اسٹاک موجود تھا۔

اس ساری گفتگو سے بے نیاز وہ آرام سے یوں املی چاٹتی رہی گویا کسی اور کی تعریف میں وہ دونوں

رطب اللسان ہوں۔

''مجال ہے جو کوئی فرق پڑتا ہو۔''

''چل جا کر نہا دھو لے۔ سبین تجھے جو کپڑے پہننے کو بولے وہی پہن لے اور جب تک میں نہ کہوں تو زبان نہ کھولنا۔ میں تو کہتی ہوں اپنی کترنی بند ہی رکھیو۔''

بی جان نے اس کو براہ راست مخاطب کیا تھا۔

''کون آرہا ہے بی جان۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی تھی۔

''تیری ساس آرہی ہے کم بخت ماری! ایک تو سوال بہت پوچھتی ہے۔''

بی جان نے اس کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''کیا واقعی میری ساس آرہی ہیں۔'' جیا کی خوشی دیدنی تھی۔

''دیکھ ذرا۔ اس کے تو دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔ بے شرم، نابنجار، دیوانی کہیں کی۔'' بی جان کا پارہ چڑھ چکا تھا۔

''جیا! کچھ تو لحاظ رکھو۔ زلفی نے تمہارے لیے رشتہ بھیجا ہے۔ زلفی کے گھر والے رشتہ طے کرنے آ رہے ہیں۔ گھر کے ہی لوگ ہوں گے۔ ہفتہ بھر یہیں قیام ہوگا۔ تم اپنے کمرے سے خبردار جو باہر نکلیں۔''

اماں جان کے فرمودات سے زیادہ تو اسے یہ جان کر صدمہ پہنچا تھا کہ اس کی شادی زلفی سے ہوگی۔

''زلفی سے..... اللہ نہ کرے۔'' وہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی تھی۔

''ذرا، میں بھی تو سنوں کہ کیا برائی ہے زلفی میں۔ ماشاء اللہ کما پوت ہے اور سارا خاندان اس پر فخر کرتا ہے۔ بس اس کے نصیب ماٹھے تھے کہ تجھ پر نظر مقصود ٹھہری.....'' بی جان نے اسے جتایا تھا۔

''اب یہ مقصود کون ہے؟'' وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ مگر بی جان نے ہمیشہ کی طرح ہاتھ میں جو بھی موجود تھا تاک کر وار کیا تھا۔

الو سیدھا جا کر جیا کے ماتھے پر لگا تھا۔

وہ اوئی اللہ کر کے نم آنکھ لیے اندرونی دیوار پار کر کے تایا کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ بی جان کو معلوم تھا کہ اب وہاں جا کر جی ہلکا کرے گی۔

☆☆☆

تایا جان کا مین گیٹ کھول کر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اسے لگا کہ بات کرنے کے لیے یہ نامناسب وقت ہے۔ ساری چنڈال چوکڑی مچائے اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔

کمرے میں چلتا دلکش دھیما سا میوزک، تاشقند آرام سے ہاتھوں پر نیل پالش لگا رہی تھی اس کے قدرے فاصلے پر بیٹھی مشال پنچی سے اخبارات سے من پسند تصویریں کاٹ کر اپنی فائل میں لگا رہی تھی۔ جو اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔

جالب بھائی مزے سے چپس کے پیکٹ میں گم منہ چلا رہے تھے اور غالب اس وقت کینوس پر جھکا رنگ بھر رہا تھا۔ اس کی آمد پر سب نے بس ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ امید واثق تھی کہ وہ خود ہی کوئی کونا دیکھ کر ایڈجسٹ کر لے گی کیونکہ وہ تو کوئی ایسا تکلف بھی نہیں رکھتی تھی مگر جب اسے مایوسی سے الٹے قدموں واپس لوٹتے دیکھا تو تاشقند بولے بنا نہ رہ سکی تھی۔

''کیا ہوا ہے ڈیئر کزن؟''

بس تاشقند کے پوچھنے کی دیر تھی کہ وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ ڈھیٹ ترین اور چکنا گھڑا لڑکی نیر بہا رہی تھی تو ضرور صورت حال نمبر ترین تھی۔

''خیر تو ہے نا جیا؟''

اب کے غالب نے بھی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ سب ہی اس کی طرف متوجہ تھے۔

''کیا خیر ہو سکتی ہے۔ جہاں بی جان ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ چکی ہیں۔ تم لوگوں کے تو مزے ہیں۔ بی جان، تائی اماں کی وجہ سے ادھر بھٹکتی نہیں۔

اتنی صلواتیں سننا پڑتی ہیں کہ مجھے اپنا نام ہی لگتا ہے کہ بھول گیا ہے۔ یاد ہے تو سنکی، دیوانی، نگوڑی، البڑ، لاابالی اور بلا بلا.....'' وہ منہ بسور کر بولی تھی۔

''مگر ہوا کیا ہے؟''

''زلفی نے میرے لیے اپنا رشتہ بھیجا ہے۔'' وہ منہ بسور کے بے چارگی کی انتہا پر بولی تھی۔

''ہائے اللہ۔ سچی، قسم سے۔''

''کتنی لکی ہو تم۔''

''زبردست۔''

''واؤ۔''

چہار سو اٹھنے والی ملی جلی آوازوں کا جوش دیدنی تھا، اس کا دل غم و غصہ سے بھر گیا تھا۔

''ہائے تم کتنی لکی ہو۔ زلفی بھیا جیسا ڈشنگ بندہ تو پورے خاندان میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔'' ناشقند نے تبصرہ کیا۔

''ہائے یہ ہوا کب۔ تم تو چھپی رستم نکلیں۔''

وہ جی بھر کر بدمزہ ہو کر سخت ترین ناراضی لیے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

قصہ مختصر یہ تھا کہ کسی شادی میں زلفی اور جیا کا ٹاکرا ہو چکا تھا۔

وہ خوب صورت دن تھا جس میں صرف زلفی بھیا سے ملاقات ہی بدصورت تھی۔ وہ نک سک سے تیار بارات کی آمد کی منتظر تھی۔ وہ بہت پرجوش اور خوش تھی۔ آخر کو اس کی آپی نبھی کی شادی جو تھی۔ مگر بارات کے ساتھ دولہا بھائی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ اس اونچے اونٹ جیسے مرد نما لڑکے کی موجودگی ناقابل برداشت۔ سونے پہ سہاگا عین دودھ پلائی کی رسم میں زلفی بھیا سے بات چیت کی وجہ سے اس کی عین امید کے مطابق متوقع دودھ پلائی نہیں مل سکی۔

''یہ کیا یہ تو صرف تین ہزار روپے ہیں۔ ہم اتنی ساری سہیلیوں میں یہ کیسے تقسیم ہوں گے۔ ہم تو

وہ سب میں پیش پیش تھی۔ طفلانہ حرکات میں تو اس کی باقاعدہ مثالیں پیش کی جاتی تھیں۔

''ہم بھی آپ کو امیر ہی سمجھے تھے مگر آپ تو خاصی غریب فاقہ زدہ سی لگ رہی ہیں۔ آج جمعرات تو نہیں ہے جو بھکاری بھکاری کھیل رہی ہیں۔''

زلفی کے برجستہ جملے پر سب ہی بے ساختہ کھی کھی کرنے لگے تھے مگر جیا کی تو وہیں سے دشمنی کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ وہ سخت برا مان گئی تھی۔ ''ویسے آپ کو یہ لمبی مونچھیں رکھنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ فلموں کے ولن لگتے ہیں۔''

وہ کسی کا ادھار رکھنے کی کب قائل تھی۔

معاملہ تو تو میں میں تک جا پہنچا تھا جب بی جان نے ہی کسی بڑے سے کہا کہ اس موٹی جیا کی کترنی بند کرو۔ اب ان کو کیا معلوم تھا کہ اسی گھمسان کے رن میں زلفی دل ہار بیٹھے تھے۔ وہ لوگ دور پار کے عزیز بھی تھے۔ اب باقاعدہ رشتہ لے کر آ رہے تھے۔ ان کا ارادہ رسم کرنے اور شادی کی تاریخ فائنل کرنے کا تھا۔ اور جیا کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے۔

وہ تو من موجی لڑکی تھی۔ مست ملنگ بنی پورے گھر میں گھومتی۔ بقول اماں..... ابھی تو اس کا بچپن ہی نہیں ختم ہونے میں آیا تھا۔ حق بابا یہ مصیبت آن پڑی۔ وہ ملول سی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ جب سبین نے اسے خوب صورت سا کڑھائی والا سوٹ تھما دیا تھا۔

''جاؤ، جا کر نہا کر یہ کپڑے پہن لو۔''

وہ بھی تو حکم کی غلام تھی۔

''خود تو لو میرج کر رہی ہیں میرا بکھ کیا خاک سمجھیں گی۔'' وہ تیز تیز بولی تھی۔ اس کی بات پر سبین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا۔ آہستہ بولو۔ یہ تو نصیب کی بات ہے۔ غالب نے پروپوزل بھیجا مجھے بھی پسند..... اگر نہ بھی پسند ہوتے تو کیا میں احتجاج

بات تو سبین کی درست تھی۔ مگر وہ تو اس وقت سخت متنفر تھی۔ سب سے ہی برگشتہ ہو رہی تھی۔ سب ہی اسے دشمن دکھائی دے رہے تھے۔ اولین دشمن تو وہ زلفی بھیا تھے۔

''اللہ کرے راستے میں ہی حادثے کا شکار ہو جائیں یہاں پہنچیں ہی نہیں یا پھر ان کی فوج داری سے بلاوا آجائے۔ ہائے اللہ شہید ہی ہو جائیں۔''

وہ منہ پھاڑ کر کوس رہی تھی۔ اس کی خرافات سن کر سبین نے تو اپنا کلیجہ ہی تھام لیا۔

''کب عقل آئے گی تمہیں۔ سوچ کر بولا کرو۔ تانیہ خالہ بیوہ ہیں ایک ہی ان کا سہارا ہے۔ تمہارا دل نہ پسیجا یہ بکواس کرتے۔'' وہ تو باقاعدہ اس سے لڑنے لگی تھی۔

اسی وقت تاشقند آ گئی تو اس کی گلوخلاصی ہوئی تھی۔

''تمہارے منہ پر کیوں بارہ بج رہے ہیں؟'' تاشقند نے چوکڑی مارتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

''تم ہی سمجھاؤ اسے، میری تو ایک بات نہیں سن رہی ہے۔'' سبین یہ کہہ کر کمرے سے ہی نکل گئی تھی۔

''یار! تم ہی کر لو نا ان سے شادی۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولی تھی۔

''اااان ہم..... اب وہ ان بھی ہو گئے۔'' تاشقند نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ آنسوؤں کے گھونٹ بھر کر کپڑے اٹھا کر ایک خشمگیں نگاہ تاشقند پر ڈالتی واش روم میں گھس گئی تھی۔

☆☆☆

وہ تانیہ بیگم کے ہمراہ چلا آ رہا تھا طویل قامت اور متناسب جسم۔ بے حد وجیہہ اور پرکشش مردانہ چہرہ۔ سارا خاندان جمع تھا۔ سب ہی جیا کے نصیب پر رشک کر رہے تھے۔

تائی اماں کے دل سے تو باقاعدہ ہوک اٹھی سبین ان کے سر منڈھ دی گئی اور جیا جس کی کھلنڈری طبیعت سے سب نالاں رہا کرتے تھے۔ وہ کس طرح اتنے اونچے قدبت کے شخص کو تسخیر کر گئی تھی۔ سب ہی اس سے باری باری پرتپاک انداز میں مل رہے تھے اور جس سے ملنے کے لیے وہ اتنی طویل مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا وہ نجانے کس کونے میں جا چھپی تھی۔

اب اس بے چارے کو کیا معلوم کہ اس کو کمرے میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ بی جان چاہتی تھیں نکاح ہی ہو جائے اور تب تک جیا کوئی کارنامہ سرانجام نہ دے۔

''جیا دکھائی نہیں دے رہی۔''

تانیہ ماں تھیں۔ اپنے لخت جگر کی بے چینی کو بخوبی بھانپ رہی تھیں۔ اس کے احساسات کو باقاعدہ لفظوں کی زبان مل گئی تھی۔

''میں نے ہی کہا اچھا نہیں لگتا نا۔'' بی جان کھسیانی ہنسی ہنس دی تھیں۔

''ارے ہم کوئی دقیانوسی لوگ تھوڑی ہیں۔ جیا جیسی بچی ہی تو میرے گھر کو اپنی چہکار سے رونق بخش سکتی ہے۔ اس کی وہی زندہ دلی تو بھا گئی ہے ہمیں۔ آپ اسے فوراً بلائیں ورنہ میں خفا ہو جاؤں گی۔''

تانیہ کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اسی وقت جیا کو بلایا گیا۔ بی جان نے اس کے کانوں میں نجانے کیا صور پھونکا کہ جیا خود اعتمادی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی جہاں سارا کنبہ جمع تھا۔ جیا پر نگاہ پڑتے ہی زلفی کی آنکھوں میں واضح ستائشی چمک اور ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ چھا گئی تھی۔

''ارے میری چندا کے آنے سے کتنی رونق ہو گئی۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔'' تانیہ نے ماتھا چوما تھا۔

''جاؤ بیٹا! جا کر شربت لاؤ۔''

اماں اسے مزید وہاں دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ وہ بھی معصوم صورت بنا کر کچن میں چل دی تھی۔

پیش کرنے لگی۔ جیسے ہی زلفی نے گلاس تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے گلاس چھوڑ دیا جو زلفی کے کپڑوں کو داغ دار کر گیا تھا۔

زلفی نے تحیر سے اسے دیکھا تھا اور جیا کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ دیکھ کر جیسے ہوش کھونے لگا تھا۔

وہ جان چکا تھا کہ یہ اس کی شرارت ہے مگر محبوب کے پتھر بھی پھول بن کر لگتے ہیں۔ جوں ہی نگاہوں کا تصادم ہوا وہ ہنسنا بھول بھال گئی تھی۔

''افف یہ زلفی بھیا کو کیا ہوا۔ توبہ کیسے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے تو انداز ہی بدلے بدلے ہیں۔ اللہ کیسی ڈوئی جیسی آنکھیں ہیں ان میں چمکتے جذبات۔ اف۔ وہ بوکھلا کر نظر چرا گئی تھی۔

''بچی گھبرا گئی ہے۔''

پیچھے سے تبصرے۔ بھانت بھانت کے چہرے۔ مشورے۔

''جاؤ جیا! ان کو واش روم دکھا دو۔ سارے کپڑے خراب ہو گئے ہیں۔''

اور جیا کو تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے.....

''افف، اب یہ بھی میں کروں۔''

وہ چپ چاپ وہیں تانیہ کے پہلو سے جا چپکی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ ان کی ہی تھی۔

تب جالب ہنستے ہوئے زلفی کو لے گیا تھا۔

جیا نے ذرا کی ذرا اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ بی جان کے چہرے پر رقم ایک خاص تنبیہہ دیکھ کر اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ مگر اس نے بھی جی ہی جی میں ٹھان لی تھی کہ یہ ہاں ناں میں بدل کر رکھے گی۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بی جان داخل ہوئی تھیں۔

''یہ کیا حرکت تھی؟''

کرخت ہموار لہجہ میں بولی تھی۔

''کیا بی جان؟''

''بنو مت۔ میں کہتی ہوں انسان بن جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

لگتا تھا جیسے وہ اسے کچا ہی چبا جائیں گی۔

''ویسے بھی آپ سے برا ہے ہی کون۔'' وہ بولنے کو روانی سے بول تو گئی تھی۔ مگر اس کے بعد بی جان نے جب دو ہتڑ اس کو مارے تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ بی جان تو اس کو طعنے تشنیع دے کر چلی گئی تھیں۔ مگر اس کے بعد اماں جان کی آمد ہوئی تھی۔

''کھانا لگ گیا ہے۔ انسانوں کی طرح تہذیب کے دائرے میں رہ کر کھانا۔ چلو مرو باہر۔ ایک تو منٹ منٹ بعد تمہاری ہونے والی ساس تمہیں پکارنے لگتی ہے۔''

وہ شاید عاجز آ گئی تھیں۔ وہ کیا کہتی۔ اشتہا انگیز خوشبوؤں سے تو گھر ویسے بھی مہک اٹھا تھا۔ وہ جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے آتے ہی تانیہ نے اسے اپنے پاس بیٹھا لیا تھا۔

قورمہ۔ نہاری۔ بھنا۔ اس کی من پسند بریانی اور کھیر۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہاں سے شروع کرے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کھانے پر دھاوا بول دے۔ مگر اس کے عین سامنے ہی وہ دشمن جاں کسی زکوٹا جن کی طرح اس کو ہی میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خفا سی منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

بی جان بھی اچانک موت کے فرشتے کی طرح اس کے بائیں دائیں طرف آ کر بیٹھ گئی تھیں..... مرتی کیا نہ کرتی کہ مصداق سب کو کھاتا دیکھ کر کلس رہی تھی۔

''ارے بیٹا تم تو کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔ تم بھی تو لو نا.....'' تانیہ نے محبت سے کہا تھا۔

اس نے ابھی ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بی جان نے ڈش اپنی طرف کھسکا لی تھی۔

بچی مردنا پاس بیٹھ گئی ہے۔"

بی جان کے بیان کے بعد تو وہ بس اس مرغ مسلم کو سب کے حلق سے نیچے اترتا ہی دیکھ سکتی تھی۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ انتہائی خراب موڈ کے ساتھ اس نے کن انکھیوں سے زلفی کو کھیر سے انصاف کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تاشقند لیگ پیس اٹھا کر اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔

"کمینی کہیں کی۔"

وہ دل میں جتنی گالیاں آتی تھیں اسے دے کر اسے ہزار سے ضرب دے کر تاشقند اور زلفی کو نواز چکی تھی۔

تب وہ برتن اٹھتے دیکھ کر خود بھی اٹھنے لگی تھی کہ اس کی ہونے والی ساس کو پھر اس پر پیار آنے لگا۔

"ارے میرے پاس بیٹھو نا، باتیں کرتے ہیں۔" وہ پیٹ سے اٹھتی احتجاجی آوازوں کو دباتی ہوئی مرے قدموں سے وہیں بیٹھ گئی تھی۔ پھر چائے کا دور چلا تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہونے لگی تو سب کو سونے کا خیال آیا۔ ایک ایک کر کے تائی جان کے بچے کھسکنے لگے۔ پھر بی جان نے سین سے کہا کہ مہمانوں کو کمرا دکھا دے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیے تو جیا نے کچن کی طرف دوڑ لگا دی۔ کچن میں اس نے ہانڈی کے ڈھکن الٹ الٹ کر دیکھنے شروع کیے۔ سب سے پہلے اس نے سب سے بڑی جمبو سائز پلیٹ میں بریانی بھری اور اس پر بوٹیوں کی باقاعدہ چھوٹی سی پہاڑی بنا کر وہیں کچن میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔

درمیان میں اسے خیال آیا کہ کھیر بھی نکال لینی چاہیے۔ اس نے کھیر نکال کر کٹوری میں اپنے سامنے رکھی اور جلدی جلدی کھانے لگی۔ اس سب میں اس کے ہاتھ گندے ہو گئے اور چہرے سے بال ہٹانے جلدی اس لیے تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بی جان ادھر کا رخ کریں وہ کھانے میں اتنی محو تھی کہ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ کب زلفی پانی کی تلاش میں کچن میں آ گیا تھا۔ جیا کو اس طرح کھاتے دیکھ کر پہلے آنکھوں میں بے یقینی پھیلی تھی اور اس کے بعد اس کے بے ساختہ قہقہے فضا میں گونجے تھے۔

"آپ کو میں نے ازراہ مزاح بھکاری کہا تھا لیکن قسم سے اس وقت آئینے میں خود کو دیکھ لیں تو غش کھا کر بے ہوش ہو جائیں۔"

وہ محظوظ ہو رہا تھا۔ جیا کی برداشت یہیں تک کی تھی۔

"ہاں تو نہ کریں ناں بھکاری سے شادی..... زبردستی کی ہے کیا کسی نے..... ایک تو آپ کی وجہ سے میں صبح سے ڈھنگ سے کچھ کھا نہیں سکی۔ اس پر آپ پھر سے یہاں نازل ہو گئے۔" وہ زچ ہو کر ایک ایک لفظ چبا کر بولی تھی۔

"زبردستی ہی تو کی ہے آپ نے۔ میرے دل کو میرا رہنے ہی نہیں دیا اور آپ اسے ڈھنگ سے کھانا کہتی ہیں۔ تو بے ڈھب کیا ہوگا۔" وہ ہنس دیا تھا۔ جیا پاؤں پٹختی ہوئی کچن سے نو دو گیارہ ہو گئی تھی۔

"ہائے میرے نصیب میں کھانا ہی نہیں۔" وہ رونے کو تھی۔ غم و غصے سے کمرے میں داخل ہوئی تو سین سو چکی تھی۔

اس نے قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو ایک دم ہی پہلے خجالت ابھری اور پھر ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ وہ کسی بدروح جیسی لگ رہی تھی۔ ہونٹوں کے پاس چکن کے نشان اسے اچھا خاصا مضحکہ خیز بنا رہے تھے۔

☆☆☆

اگلا دن چھٹی کا تھا۔ جیا کو گھر کا ماحول عجب گھٹن زدہ سا لگ رہا تھا۔ بی جان کی نصیحتوں کا پلندہ وزنی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ہمارے زمانے میں تو لڑکیاں بچ بچ کر چلتی تھی ایک یہ جیا کی بچی ہے کہ پاؤں کدھر اٹھ رہے ہیں پڑ کسی اور جگہ رہے ہیں۔

بی جان کی بات پر وہ کلس کر رہ گئی تھی۔ اتنی پابندیاں وہ بوکھلا گئی تھی۔ بی جان ایک بات تو بتائیں جس سے شادی ہو رہی وہ کدھر سے نامحرم ہو گیا۔ اسی کے سامنے جانے سے منع کر دیا۔ خواہ پورے زمانے کے سامنے گھوم پھر لوں۔ حد ہے اور وہ لمبی مونچھ تو پہلے ہی سب دیکھ بھال چکے۔

اپنی دانست میں وہ عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سچ بیان کر رہی تھی مگر بی جان کی گھوری اور پیشانی پر شکنوں کا جال گواہ تھا کہ وہ پھر بی جان کے غصے کو للکار چکی ہے۔ نجانے وہ کیسے صبر کر کے اس کی بکواس سن رہی تھیں۔

"اب یہ بھی کوئی بات ہوئی اپنے ہی گھر میں اونچا نہ بولو، جھک کر چلو۔ دوپٹہ کو سر پر اوڑھو۔ یہ لڑکی ہونا بھی قیامت سے کم نہیں اور آپ..... آپ نے جو سہا ہم پر آزمانے چلی ہیں....."

وہ اپنی ساری بھڑاس نکال چکی تو دیکھا کہ بی جان اسے نظر انداز کر کے جا چکی ہیں۔ شاید اس بار بی جان کی ناراضی طول پکڑ جائے گی۔ میں بھی ان کی ہی پوتی ہوں منا کر ہی دم لوں گی۔ وہ دل میں ٹھان چکی تھی۔

وہ باہر صحن میں نکل آئی تھی۔ سین کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر مشین لگا چکی تھی۔

صبح ناشتہ بھی سین نے اکیلے ہی بنایا تھا۔ اور اب بھی آرام سے کام میں مگن تھی۔

"تم کام کر کر کے تھک نہیں جاتیں۔" وہ کچھ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو، میں تو ایسی ہی ہوں۔" وہ بوری ہو کر اسے کپڑے دھوتے اور نتھار نتھار کر الگنی پر ڈالتے دیکھ رہی تھی۔

"اے سنو..... جا کر ذرا زلفی کو تو بلا لا اور تانیہ کو بھی۔ تیری تائی کی طرف گئے ہیں صبح کے۔ نجانے کیا کھول کھول کر پلا رہی ہوگی۔ اتنی دیر ہو گئی۔ وہ تو وہیں کے ہو رہے۔ کہو کھانا تیار ہے۔ آ جائیں اب۔" یہ بی جان تھیں۔

"آپ بھی نا بی جان۔ کبھی تو کہتی ہیں کہ کمرے میں بند رہو اور اب کہہ رہی ہیں کہ میں بلانے جاؤں۔" وہ پٹپٹا کر بولی تھی۔

"بی جان اب اسے کیا بتاتیں کہ کل سے مشال کے رنگ ڈھنگ ملاحظہ کر رہی ہیں۔" مشال بار بار زلفی کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی پھر تائی جان کے لگاوٹ بھرے مظاہرے بھی ان کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے تھے۔ تب بی جان نے اسے اپنے پاس ہی تخت پر بیٹھا لیا تھا۔

"چندا تو بہت سیدھی ہے مگر زمانہ بہت تیز ہے تو ان باریکیوں کو کہاں سمجھے گی۔ بس ایسا کر بلا لا اور کچھ دھیان دیا کر اپنے حلیے پر۔"

بی جان اس وقت کسی اور ہی دھیان میں گم تھیں۔ ورنہ اتنی نرمی سے کب بات کرتی تھیں۔

"اچھا بی جان! جاتی ہوں۔" وہ کدکڑے لگاتی یہ جا وہ جا۔

"ہائے کتنی بے ڈھنگی لڑکی ہے۔ جانے کب عقل آئے گی۔ اللہ ہی حافظ ہے۔" وہ اب دل مسوس کر بیٹھ گئی تھیں۔

جیا نے داخلی راستہ پار کیا۔ وہ سیدھا اندر چلی گئی تھی۔ اندر کا منظر بہت واضح تھا۔ زلفی جالب کے ساتھ کسی موضوع پر بات کر رہے تھے مگر ان کے بہت ہی پاس صوفے پر بیٹھی مشال یک ٹک زلفی کو ہی تکے جا رہی تھی۔ وہ تو پہلے ہی نک سک سے تیار رہا کرتی تھی۔ مگر آج تو چھب ہی نرالی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ خاص اہتمام سے تیار ہوئی ہو۔

تانیہ اور تائی اماں جانے کن مذاکرات میں گم تھے۔ زلفی کی سب سے پہلے اس پر نگاہ پڑی تھی اور وہ جو سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا تھا اس پر نگاہ پڑتے ہی آنکھوں کے جگنو بڑھ سے گئے تھے۔ وہ کچھ پزل سی وہیں گرل سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ جب تائی اماں

نے اس سے خاصے کھردرے لہجے میں پوچھا تھا۔
''خیر تو ہے نا۔ تم کیسے آدھمکیں؟'' وہ تو تائی اماں کی آواز سے پہلے ہی ہراساں رہا کرتی تھی۔ گونج دار اور پاٹ دار آواز۔
''جی کھانا تیار ہے۔ بی جان بلا رہی ہیں۔'' وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔
''ان سے کہو شام میں آئیں گے، ابھی کھانا میری طرف ہی کھائیں گے۔''
''تاشقند نے اور مشال نے لگ کر تیار کیا ہے۔ ایسے تھوڑی جانے دوں گی۔'' تائی اماں نے قطعیت سے کہا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی۔
''کیا میں جاؤں اب؟''
اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا واقعی لوٹ جائے یا اصرار کرے۔ بی جان نے کہا تھا ساتھ ہی لانا۔ اب اسے ڈانٹ کا خوف تھا۔ کچن سے تاشقند نکلی تھی۔
''یہ دیکھیں! بہن میری بچیوں کو، میں نے بہت اچھی تربیت کی ہے۔ ایک یہ ہے جیا! کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔'' تائی اماں کا اشارہ جیا کی طرف تھا۔ اسے سخت صدمہ ہوا تھا۔
''بچی ہے وقت کے ساتھ سیکھ جائے گی۔'' تانیہ بیگم نے کمزور لہجہ میں طرف داری کی تھی۔
''یہ لڑکی سارا دن اودھم مچائے رکھتی ہے۔ کھانے بناتے وقت غائب اور ڈائننگ ٹیبل پر بھاگم بھاگ آتی ہے۔ بھئی اب کب تک بچپنا باقی رہے گا؟''
تائی اماں مسلسل بولتی چلی گئی تھیں۔ وہ تحیر زدہ وہیں کھڑی سوچ رہی تھی کہ ان کے دل میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ اس نے آخر کیا بگاڑا ہے ان کا۔
''تائی اماں! اپنے گھر سے کھاتی ہوں، آپ سے تو نہیں مانگتی۔'' اس کا صبر بس اتنا سا ہی تھا۔
''دیکھی اس کی زبان۔ میں تو کہتی ہوں ابھی بھی وقت ہے، خوب سوچ سمجھ لیں۔ یہ تو ہل کر پانی نہیں پیتی۔ سارے گھر کا بوجھ سبین نے اٹھا رکھا ہے۔ وہ نہ ہو تو ہوش ٹھکانے آجائیں۔'' تائی اماں نے تیز لہجہ میں کہا تھا۔ جیا کی نگاہ زلفی کی جانب اٹھی تھی۔ زلفی کے چہرے پر اتنی سنجیدگی دیکھ کر اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔
کیا تھا جو کوئی طرف داری کر دیتے۔ کیسے بیٹھے میری برائیاں سن رہے ہیں۔ وہ سوچ کر رہ گئی اور واپس لوٹ آئی۔ بی جان نے اسے آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو سیدھا اندر جا رہی تھی جب بی جان نے پکار لیا۔
''اے کیا ہوا؟'' وہ متعجب تھیں۔
''وہ لوگ شام میں واپس آئیں گے۔ تائی جان نے کہا ہے کہ کھانا کھائے بنا نہیں آنے دیں گی۔'' وہ آنسو ضبط کر کے بولی تھی۔
پھر رکی نہیں تھی۔
''میں تو پہلے کہہ رہی تھی کہ یہ ضرور کسی مقصد سے بلا رہی ہے۔'' بی جان متفکر وہیں بڑبڑانے لگی تھیں۔
رات کے کھانے پر سب اہل خانہ جمع تھے سوائے جیا کے۔ دو بار سبین اس کے کمرے میں گئی تھی بلانے مگر وہ تو اوندھی پڑی تھی۔ منہ سوجا ہوا تھا۔ موڈ فل آف تھا۔
''ارے کھانے سے کیا جھگڑا بھلا؟'' وہ بضد تھی کہ وہ سب کے ساتھ مل کر کھانا کھالے..... اچانک ہی وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ تکیہ گود میں رکھے، چہرے پر واضح بے زاری تھی۔
''مجھے ایک بات بتائیں؟ بات صرف کھانے کی نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں نا کہ جس وقت تائی اماں میری ذات کے پرخچے اڑا رہی تھیں۔ یہ موصوف وہاں بیٹھے منہ دیکھ رہے تھے۔ ساری عمر ساتھ چلنے کے دعویدار تو ایک بات میں میری حمایت نہ کر سکے۔''
وہ سخت غصے میں تھی۔ طیش سے بولتی چلی گئی۔ سبین ایک دم ہنس دی تھی۔ سبین کا ہنسنا اسے سخت گراں گزرا تھا۔

اچھا!!!!!! تو بات یہ ہے۔ سارا غصہ تو رنگی پر ہے۔ میں سمجھی تائی اماں سے خفگی ہے....." سبین کا لہجہ شریر سا ہو چلا تھا۔

وہ سبین کو حق دق چہرے لیے دیکھ رہی تھی۔ جب اچانک اسے اندازہ ہوا کہ بات تو کچھ اور ہے۔ ہلتے پردے نے احساس دلایا کہ دروازے پر کوئی کھڑا نجانے کب سے اس کو سن رہا تھا۔ زلفی کو دیکھ کر وہ سٹپٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بھئی تم لوگ آپس میں ہی یہ صورت حال سلجھا لو، مجھے کباب میں ہڈی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے....." وہ مسکرا رہی تھی جبکہ جیا کا تو خون ہی کھول اٹھا تھا۔

"سبین آپی! میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ جیا کھانا کھالے سب کے ساتھ۔ کیونکہ میں نے اسے بھی چھپ کر کھاتے دیکھا ہے اور سچ کہوں، مجھے یہ ایسے ہی اچھی لگتی ہے۔ مجھے ہر رشتے کی بنیاد نفاق سے پاک رکھنی تھی اور جیا کی آنکھیں تصنع سے مبرا ہیں، ہر بھید کھول دیتی ہیں۔ جیسے اس وقت یہ کھڑی جن کینہ توز نگاہوں سے مشال کو دیکھ رہی تھی نا مجھے لگا کچا ہی نہ چبالے....."

وہ اونچا لمبا شخص گوڈے گوڈے اس کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا اور وہ پگلی اس کو ملنے سے پہلے ہی کھو دینے کے خوف میں مبتلا ہو چکی تھی۔ سبین ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

وہ بھی اس کے نکلتے ہی راہ فرار تلاش کرتی نکلنا چاہتی تھی جب زلفی نے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ اس وقت حیا کی لالی نے اس کے چہرے کو گلنار بنا دیا تھا۔

"پگلی..... ہم محبت ایک بار ہی کرتے ہیں اور وہ ہو چکی اب تو بس اس محبت کو تسخیر کرنا ہے۔"

خواب آگیں لہجہ اسے اندر تک سرشار و مغرور کر گیا تھا۔

جب بی جان نے شرم سے دوہری ہوتی سر جھکائے جیا کے عقب میں زلفی کو آتے دیکھا تو ان کے اندر تک طمانیت اتر آئی تھی۔

تائی اماں اور مشال نے جب ان دونوں کو اکٹھے آتے دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ ہی فق ہو گیا تھا۔

"بھئی مٹھائی کدھر ہے۔ اے سبین! اپنی ہونے والی ساس کا منہ تو میٹھا کروا۔ کل نکاح ہے زلفی اور جیا کا۔"

بی جان نے بالآخر بم پھوڑ دیا تھا۔

"اتنی جلدی کاہے کی ہے۔" تائی جان نے اپنی جگہ پہلو بدلتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی بات کا جواب تانیہ نے دیا تھا۔

"بہن خدا خدا کر کے تو اس نے کسی لڑکی کے لیے ہاں کی ہے اور پھر میں چاہتی ہوں جلد از جلد میری بہو میرے گھر آجائے۔"

زلفی اور جیا نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دنیا مسکرا اٹھی تھی۔

☆

برادری دست نوردر

نسیم سحر قریشی
قیمت -/400 روپے

فوزیہ یاسمین
قیمت -/750 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہء عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہاجرہ ریحان

مرد یا عورت

میرا نکاح چھ مہینے چلا..... پھر رخصتی..... شادی کے دوسرے مہینے میں امید سے ہوگئی۔ بچہ چار ماہ کا ہوا کہ میرا مس کیرج ہوگیا۔ اس کے دو ماہ بعد طلاق ہوگئی۔ یہ تھی میری پہلی شادی کی روداد ..

بس اتنے سے دن کے لیے میرے گھر والوں نے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہائے۔ یوں تو کہنے کو یہ صرف چند ماہ ہیں مگر دراصل ان چند ماہ کے پیچھے پوری ایک داستان پنہاں ہے جو دنوں مہینوں پر نہیں بلکہ سالوں پر محیط ہے..... یقیناً میرے سابقہ شوہر کے پاس بھی اپنے حصے کی ایک داستان ہوگی مگر کیونکہ اس نے مجھے کبھی اپنی زندگی میں شامل کیا ہی نہیں لہٰذا مجھے اس کے حصے کی داستان کا کچھ علم نہیں۔

جہاں تک میرے تعلق ہے میرا واقعہ شادی کے وقت کا نہیں ہے۔ میری زندگی کو، میرے مزاج اور لوگوں کے متعلق میرے رویوں کو باقاعدہ کئی سالوں کی خواری نے ایسی شکل میں ڈھالا کہ ابھی تک میں اس کے اثر میں خود کو قید پاتی ہوں۔

میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی مگر مجھ پر شروع سے ہی کافی ساری ذمہ داریاں ڈال دی گئی تھیں۔ اس کا جواز مجھے یہ دیا جاتا کہ میں بہت بردبار اور سمجھ دار ہوں..... مجھے گھر کا ایک فعال انسان بننے کے لیے ہر وقت گھر میں ہونے والی بے ہودہ خاندانی سیاست کا حصہ بننا پڑتا تھا..... کوئی بھی مسئلہ ہوتا مجھے سب سے آگے کر دیا جاتا جو بات بڑے نہ کہہ پاتے مجھ سے کہلوائی جاتی۔

کم عمری میں اس طرح کی آزادی اور طاقت ملنا کسی بھی لڑکی کو بہت اچھا لگ سکتا ہے، ایسے گھر میں جہاں لڑکوں کو ایک قدم آگے رکھا جاتا ہو..... لڑکیوں کو ان کی شکل وصورت پر فوقیت ملتی ہو۔ والدین ایسے بچوں پر محفل میں فخر کرتے نظر آئیں جو شکل وصورت میں یکتا ہوں..... تو پھر مجھ جیسی کم شکل وصورت لڑکی کے لیے یہ ایک بہت نادر موقع ہوتا ہے کہ وہ چھ بہن بھائیوں میں سب سے نمایاں ہونے کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ لے۔ آزادی تو دے دی تھی ماں اس بات پر پریشان بھی تھیں کہ لڑکی ہاتھ سے نہ نکل جائے وہ کبھی میری کم شکلی و بدرنگی پر تو کبھی میرے انداز گفتگو پر بھی بلا روک ٹوک تبصرے جاری رکھتیں۔ یہ ماں کی احتیاط تھی..... کہ اپنے ہتھیار کو چمکا کر بھی رکھنا ہے مگر اس کو کبھی بھی گولیوں سے بھر کر نہیں رکھنا۔ کہیں کبھی حادثاتی طور پر ہی یہی اپنے ہی گھر میں فائر نہ کھل جائے۔ چونکہ سمجھ دار تھی لہٰذا اچھی طرح اندازہ لگا لیتی تھی کہ بھائیوں کے لیے اور میری بڑی بہنوں جو بے حد خوب صورت تھیں۔ ماں کا مزاج میٹھا اور میرے لیے کیسا کڑوا کسیلا ہے۔

ان کی تعلیم وشوق کی تکمیل کے لیے سارے وسائل حاضر مگر میرے لیے ایک ہی خواب.....

''تم تو سمجھ دار ہو جانتی ہی ہو، اتنی آمدنی نہیں ہے تمہاری باپ کی۔''

''کچھ کر نہیں پاتی تھی کہ اندر سے بہر حال ایک کمزور انسان تھی بس چڑ کر رہ جاتی تھی۔ ایسے واقعات ویسے ہی اس قدر زچ کر دیتے تھے کہ پھر جیسے ہی ماں کا اشارہ ملتا کسی بھی رشتہ دار، ملنے ملانے والوں کی ایسی کی تیسی کرتی کہ ماں اس رات خوب دل سے گلے لگاتی، دوسرے معنوں میں

شاباشی ملتی اور دل شاد ہو جاتا۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ بھائی بہن دوسرے ملک سدھار گئے اور میں باقی رہ گئی اپنی ماں کے ساتھ..... اب گھر میں رشتہ دار بھی کم آتے۔ ماں بھی والد کے انتقال کے بعد آدم بیزار ہو چکی تھیں..... یوں گھر پر جان پہچان والے تو کم ہی آتے ہاں ایک اور طرح کے لوگوں سے ملنا ملانا ہونے لگا۔

ہر وقت گھر میں کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں مزدور طبقہ آنے لگا..... پہلے گھر میں مرد تھے وہ بہت سے چھوٹے بڑے کام خود سے کر لیا کرتے تھے۔ اب صرف میں اور ماں اس کے بعد باہر کا پیسہ بھی..... ایک جوش اور ولولہ کہ ہم بڑے امیر لوگ ہیں ہمارا گھر ہر وقت ہر طرح کی آرائش و تزئین کا گہوارہ نظر آنا چاہیے۔ یوں کبھی پلمبر، الیکٹریشن، مستری تو کبھی پینٹر جیسے لوگ آنے جانے لگے۔

اس کے ساتھ ہی ماں کو مختلف بیماریوں نے گھیر لیا کیونکہ اب علاج کے لیے وافر مقدار میں مال بھی تھا لہٰذا آئے دن ہسپتال، کلینک اور ڈاکٹروں کے چکر لگنے لگے..... ایک زمانہ ایسا آ گیا کہ میری اپنی کوئی بھی سوشل لائف نہ رہی بلکہ کپڑے بناتے وقت سوچتی کہ یہ چند کپڑوں کو تو مزدور طبقے کے لیے رکھوں گی اور یہ چند کپڑے ہسپتال یا ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے ٹھیک رہیں گے۔

☆☆☆

اب میں کافی سے زیادہ آزادی حاصل کر چکی تھی..... ماں کی ہمیشہ کی خواہش کہ وہ خود کو بہت اچھا اور معصوم سا دکھانا چاہتی تھیں..... وہ چاہتی تھیں کہ ساری دنیا ان کی سادگی اور ان کی معصومیت کے گن گائے۔ لہٰذا مجھے مکمل طور پر محاذ پر چوکس کھڑا کر دیا گیا تھا۔

ہر آنے والے پلمبر، الیکٹریشن یا پینٹر کو میں ہی سدھاتی..... یہ حضرات بھی گھر میں مرد نہ پا کر عورت سمجھ کر اپنی مرضی چلانے اور بلاوجہ خرچا بڑھانے کی کوشش کرتے میں ہر ایک پر قہر بن کر ٹوٹتی اور پہلے ہی دن کچھ اس سختی اور بے رحمی سے بات کرتی کہ کام کرنے والے کو اندازہ ہو جاتا کہ یہاں دال نہیں گلے گی مگر پھر بھی کرنے والے بے ایمانی کر ہی لیتے تھے اور میں اس بے ایمانی کی روک تھام نہ کر سکنے پر کئی روز تک خود کو ذہنی اذیت دیتی رہتی۔

ماں کا یہ کام رہ گیا تھا کہ ایک تو وہ گھر میں کام کرنے والوں کو میری پھٹکار کھانے دیتیں۔ مجھے ایک بار بھی نہ ٹوکتیں مگر پھر میرے اس سے خوب چاہ سے بات کرتیں اور یہ باور کراتیں کہ ان کی بیٹی یعنی کہ میں ایک مغرور، بدتمیز، بگڑی ہوئی شہزادی ہوں لہٰذا وہ میری بات کا زیادہ برا نہ مانا کریں اس کے علاوہ رات کے کسی بھی پہر اچانک مجھے نیند سے اٹھا کر ٹی وی پر کوئی بہت ہی دلچسپ ڈرامہ یا فلم کے

دوران وہ مجھ پر ناراض ہو جاتیں اور پھر خوب دیر تک روتی دھوتی مجھے یہ باور کراتیں کہ میں بہت خود غرض ہو گئی ہوں کہ میں نے ذرا خیال نہیں کیا اور فلاں آدمی اتنے سے کام کے لیے میرے بھائیوں کے بھیجے حلال پیسوں سے اتنے سارے پیسے بٹور گیا اور کیونکہ یہ پیسہ میرا نہیں ہے۔ اس لیے میں بھائیوں کی کمائی کس بے دردی سے لٹاتی ہوں۔

میں ایک قدم اور خود کو مضبوط کرنے کا ٹھان لیتی کہ اب کی بار کس کی مجال کہ ہمیں بے وقوف بنا سکے۔ مگر ایسے لوگوں کے ہاتھوں الو بننے پر میں خود کو کئی روز تک وحشت بھری تنہائی اور غم و غصے سے بھرے دن رات سے ضرور نوازتی تھی۔ مجھے لگتا کہ میری نااہلی ہے کہ میں اس طرح بے وقوف بنائی گئی اور مجھے اپنی نااہلی کی سزا ملنی ہی چاہیے۔

ان سب حالات نے میرے اندر رواداری، مروت اور احساس کے تمام سوتے کاٹ دیے تھے۔ میں ایک بہت اکھڑ، بدزبان اور بدلحاظ انسان بن کر رہ گئی تھی۔ جہاں کہیں کوئی دس بیس روپے بھی زیادہ مانگ لیتا تو فوراً اس کی عزت اتار کر رکھ دیتی۔ مجھے یہ لگنے لگا کہ ہر کوئی..... یعنی جو کوئی بھی مجھ سے ملتا ہے دراصل وہ مجھ سے نہیں بلکہ میرے اختیار میں پیسے سے ملتا ہے۔

کہیں دل میں میرے یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ کوئی کبھی مجھ سے مخلص ہو ہی نہیں سکتا کوئی مجھ سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ مجھے انسانوں سے شدید نفرت ہو گئی خاص طور سے مردوں سے..... میں ہر دم ہر جگہ ان مردوں کی مردانگی کو للکارنے لگی۔ کئی بار سڑک پر بازار میں لچے لفنگے کی پٹائی کی..... اور یونیورسٹی یا پھر جاب میں ملنے والے کسی بھی جاذب نظر مرد کی اگر اپنی طرف نظر کرم دیکھ لیتی تو کچھ اس طرح اس کو محفل میں ہی طنز و تشنیع کا نشانہ بناتی کہ وہ باقاعدہ مجھ سے نفرت کرنے لگتا..... پچھلے دنوں میرے ایک فیس بکی فرینڈ محمد احسن نے کسی پوسٹ پر لکھا تھا..... 'مرد یا عورت..... اصل میں یہ ایک سوال تھا جس کے جواب میں دو لفظ تھے..... مرد یا عورت مگر محمد احسن نے کمال عمدگی سے اسے ایک مکمل جامع پہنا دیا..... مرد یا عورت.....

پہلے تو مجھے پڑھ کر بے حد ہنسی آئی مگر پھر فوراً دل اداس ہو گیا..... میں خود بھی تو ہو گئی تھی مرد یا عورت۔

☆☆☆

خیر تو پھر یوں ہوا کہ خاندان میں چند ایک کزنز نے میرے لیے اپنی پسندیدگی دکھائی جس پر ماں بے حد چراغ پا ہو گئیں کیونکہ ان کی نظر میں رشتہ میں عمر کا کافی فرق تھا..... سب کو آگے بڑھنا ہی پڑتا ہے۔ وہ سب بھی آگے بڑھ گئے مگر اب ماں پر رشتہ داروں کی سوالیہ نظریں گڑنے لگیں..... آخر لڑکی کو کب تک بٹھائیں گی..... کیا اس کو اپنی بیماری کے لیے سنبھال رکھا ہے..... ایسی ہی کچھ باتیں جو وہ خود ہی سوچ کر مجھے بھی پریشان کر دیتیں۔

مگر اب رشتے کہاں سے ملتے..... وہ خود ہی ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال لیتیں یا پھر رشتے والے ہی ایسے ہائی فائی آتے کہ مجھ جیسی کہاں چل پاتی..... یوں تو میری کوئی اتنی زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی مگر ماں کو بے چینی لگ گئی تھی کیونکہ وہ خود پر کسی بھی طرح کا الزام برداشت نہیں کر پاتی تھیں۔

انہوں نے میری کم شکل وصورت کو وجہ بنا کر اپنے سے بہت کمتر اور تقریباً جاہل لڑکوں کے رشتے گھر پر بلانے شروع کر دیے۔ ایسا کوئی لڑکا وہ پہلی ہی نظر میں ناپسند کر دیتیں جو مجھے دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کر دیتا۔ وہ زیادہ تر ان لوگوں کو پسند کرتی تھیں جو مجھے تو ناپسند کر دیں مگر میرے گھر بار اور اسٹیٹس کے رعب میں آ کر مجھے قبول کرنے کی کوشش کریں۔

میں جانتی تھی اپنی ماں کو..... وہ پیسے دیں گی بھی مگر پھر ذلیل بھی بے حد کریں گی اور پھر ان کی زندگی کے بعد کیا میرے بھائی، میرے شوہر کو یوں مالا مال رکھ سکیں گے۔ خیر ہو سکتا ہے کہ یہ میرا خیال ہو..... شادی کرنے والے نے اس حد تک نہ سوچا ہو.....

اب یہاں بات آ جاتی تھوڑی سی تعقل و شعور

کی..... تم نے بھی ہر طرح کی سیاسی پارٹیوں میں شامل مجمع پر غور کیا ہے..... یہ لوگ اپنے لیڈران سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کو ان کا کیا گیا سنگین جرم، ظلم و ناانصافی کبھی بھی بری نہیں لگتی۔ خود مہنگائی بے روزگاری کے ہاتھوں برباد ہو جائیں گے مگر لیڈر کو سلامتی کی دعائیں دیتے نہیں تھکیں گے۔

یہ لوگ کچھ لوگوں سے ایسے متاثر اور کچھ اس طرح ان کے زیر اثر آجاتے ہیں کہ اس کی کہی بات پلو سے باندھ لیتے ہیں وہ اگر کسی کو ایک گالی دے تو یہ اس کے برابر کھڑے ہو کے دس گالیاں دیں گے۔ یہ سوچے بغیر کہ کیا واقعی سامنے والا ان کی گالیوں کا اہل ہے یا نہیں۔

تو آنے والا میرا ہونے والا پہلا شوہر کچھ ایسا ہی تھا۔ پہلی ہی نظر میں میری ماں نے اس کی شخصیت کا یہ راز پالیا تھا..... یہ ایک بات ان کے لاشعور میں تھی کہ میں کبھی کبھی کہیں بھی ان سے بغاوت کر سکتی ہوں۔ ان کو آئینہ دکھا سکتی ہوں۔ لہٰذا وہ مجھ سے بے حد خائف تھیں۔

انہوں نے ساری عمر مجھے رشتہ داروں، ملنے والوں اور بھائی بہنوں کو سبق سکھانے کے لیے استعمال کیا تھا پھر بھی اندر ہی اندر ہر کوئی مجھ سے تعلق بنائے رکھتا تھا۔ شاید وہ جانتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ میں جذباتی ہوں، باتوں میں آجاتی ہوں مگر میرا دل برا نہیں ہے۔ میرے دل میں کینہ، حسد، جلن، نہیں ہے۔

میری نظروں میں وہ بات نہیں جو کسی کی ہنستی بستی زندگی میں آگ لگا دیتی ہے اور اس سب کا اندازہ ان کو کیسے ہوا۔ اس پر ایک الگ سے کہانی بن سکتی ہے لہٰذا ابھی میں کہانی کو دوسری طرف لے جانے کے بجائے ہونے والے شوہر اور میری ماں کی سوچ پر واپس لاتی ہوں۔

تو ماں نے سابقہ شوہر کو سابقہ شوہر نے میری ماں کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ میری ماں بہت کچھ دیں گی منہ سونے سے بھر دیں گی۔ فقط میرے شوہر کو مجھ سے بدتمیزی کرنی ہے۔ اسے میری عزت نہیں کرنی مجھے ذلیل کرنا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ میرا وہم ہو مگر اگر یہ وہم ہوتا تو ایسا کیوں ہوا کہ شادی کی پہلی ہی رات اس نے پوری رات صرف یہ بات باور کرانے میں لگا دی کہ اس کی نظر میں اس کی ماں، بھائی، بھاوج، بہن کی کتنی قدر ہے۔ وہ مجھ سے صرف اپنی بیوہ ماں کی خوشی چاہتا ہے۔

اس کے بعد جب جب وہ میرے ساتھ بدتمیزی کرتا یا میرے اوپر ہاتھ اٹھاتا میں اپنی ماں کے پاس شکایت لے کر جاتی تو وہ یہی کہہ کر مجھے فارغ کر دیتیں کہ میں تو ہوں ہی بدتمیز یقیناً میں نے ہی کوئی بدتمیزی کی ہوگی۔ میری بدتمیزی کیا تھی۔

بس یہی کہ چند ایک دنوں میں شوہر کے گھر کے عجیب طرح کے رسم و رواج میری برداشت سے باہر ہونے لگے۔

پہل تو یوں ہوئی کہ شادی کے شاید تیسرے یا چوتھے دن سے ہی مجھے باورچی خانے میں کام پر لگا دیا۔ اس کے بعد یہ بھی فرمائش کہ میں گھر میں صفائی جھاڑو پونچھا کیا کروں۔ کیا اس نے میرے گھر میں نہیں دیکھا تھا کہ ہمارے گھر میں تین نوکر ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر میں اپنے سسرال میں کام کرنے بھی لگوں تو کیا شادی کے تیسرے روز سے ہی اس طرح کی خواہشات کا اظہار کوئی تک کی بات تو نہ تھی۔

اس کے بعد میں نے اپنی بیوہ ساس میں عجیب تبدیلی دیکھی۔ ایک بار وہ رات گئے میرے کمرے میں آگئیں۔ میں نے رات کے کپڑے یعنی سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوسری ہی رات میرے سابقہ شوہر نے زبردستی مجھے اپنی ماں کی خیریت لینے بھیجا جو کہ مجھے بے حد عجیب لگا کہ پورا دن میں اس کی ماں کے پہلو سے ہی لگی رہتی تھی۔ میں نے بیوہ ساس کو اپنی ہی طرح کا جالی دار سلیپنگ سوٹ پہنے دیکھا اور بے حد چڑ ہوئی۔

مجھے یہ چڑ کیوں ہوئی؟ ہو سکتا ہے تم مجھے واقعی

ایک بدتمیز انسان سمجھ لو مگر تم خود سوچو..... صرف اپنا سلیپنگ سوٹ دکھانے کے لیے بیوہ ساس نے مجھے رات گئے اپنے بیٹے سے کہہ کے اپنے کمرے میں بلوایا تھا اور بیوہ ہو کر ایک غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے کیا اسے زیب دیتا تھا کہ وہ میرے مقابلے پر آ کر میرے ہی جیسا سلیپنگ سوٹ پہن کر مجھے دکھائے۔ بلکہ اس واقعے میں غریب طبقے سے تعلق سے زیادہ ان کے بیوہ ہونے کے عنصر پر نظر رکھو تو اچھا ہے۔ میں کھسیانی ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد ایسے ہی کئی واقعات کی ایک لمبی فہرست ہے جیسے میرے بھائی نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شادی کی خوشی میں دعوت رکھی جس میں سابقہ شوہر نے ایک ایک کر کے اپنے تمام ہی رشتہ داروں کو دعوت دے ڈالی۔

میں نے اسے سمجھانا چاہا کہ دیکھو یہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہے یہاں تو ایک بندے پر کافی خرچا آئے گا تم کچھ خاص مہمانوں کو بلا لو مگر اس کو تو جیسے میری کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی۔

اس پر بھی بس نہ ہوا تو اس نے ہوٹل جانے کے لیے ٹیکسی یا گاڑی کرائے پر نہیں لی بلکہ وہ اپنے بڑے بھائی کے بچوں کو اسکول لے جانے والی سوزوکی کیری مانگ کے لے آیا۔ اور میری تیاری..... میں نے ایک اچھی سی ساڑھی زیب تن کی۔ خود کو ڈھنگ سے سنوارا۔ مگر جب جانے کے لیے باہر نکلی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بڑے شادی شدہ تین جیٹھ اپنی بیویوں اور بے حساب بڑے چھوٹے بچوں کے ساتھ۔ بیوہ ساس اور میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس سوزوکی میں؟ یہ تو حد ہی ہو گئی۔

''آپ باقیوں کو اس میں جانے دیں۔ ہم دونوں آپ کی والدہ کے ساتھ ایک عدد ٹیکسی کر لیتے ہیں۔'' میں نے جب ہر طرح سے ساڑھی کو سمیٹ کر سوزوکی پر چڑھنے کی کوشش ناکام دیکھی تو مشورہ دیا۔ مگر ایک بار پھر میری بات سنی ان سنی کر دی گئی۔

سب سے زیادہ تو ذلت کا احساس فائیو اسٹار ہوٹل کے دروازے پر ہوا جہاں پہلے تو ہم سب کو اتار کر اچھے طریقے سے سوزوکی کی تلاش لی گئی اس کے بعد ہمارا واسطہ ہمیں ہال تک لے جانے کے لیے میرے بھائی اور بھابھی اور چند ایک رشتہ داروں سے پڑا۔

میں جانتی ہوں یہاں میں زیادتی کر رہی ہوں کیا میں غریب لوگوں کا مذاق بنا رہی ہوں۔ اللہ اللہ نہیں۔ میں تو بس یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ نکاح کے بعد اور شادی سے پہلے ماں نے میرے سابقہ شوہر کو بہت کچھ نوازا تھا کہ اگر اس نے کہا کہ اسے موٹر سائیکل چاہیے تو ماں نے اسے بھائی کے ہاتھوں گاڑی کے پیسے بھجوا دیے جو کہاں گئے۔ کس طرح خرچ ہوئے کچھ پتا نہیں چل سکا۔

اس کے علاوہ نکاح کے وقت سلامی کے طور پر بے حساب پیسے برسائے گئے اور اس سے زیادہ کچھ رخصتی پر بھی دیے گئے تھے۔

☆☆☆

نکاح کے بعد دونوں ماں بیٹا تقریباً ہر روز ہمارے گھر شام سے آ کر بیٹھ جاتے تھے..... میں ان کے سامنے نہیں جاتی..... حالانکہ میں نکاح میں تھی پھر بھی سابقہ شوہر کبھی بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرتا تھا بلکہ کبھی میری ڈرائنگ روم میں کوئی جھلک نظر آ جاتی تو فوراً منہ گھما کر کھڑا ہو جاتا کہ کہیں سلام دعا نہ کرنی پڑ جائے۔

تو میں یہ بتا رہی ہوں کہ شادی تک میری ماں نے ان لوگوں پر ہزاروں نہیں لاکھوں لٹا دیے تھے اور کسی کا بھی حساب مجھے شادی کے بعد نہیں ملا کیونکہ حالات ویسے ہی نظر آ رہے تھے جیسے کئی دنوں کے کسی موذی بیمار یا کسی بے روزگار کے گھر میں ہوتے ہیں۔

میری ماں لوگوں کو اپنی معصومیت ثابت کرنے پر اس قدر تیزی میں تھیں کہ لڑکے کی نہ تو تعلیم ہی دیکھی نہ ہی اس کی نوکری کا ہی کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بس وہ میری شادی کرنا چاہ رہی ہوں۔

سابقہ شوہر کی نوکری کی ہی نہیں اور تیم بھی ایسی نہیں تھی کہ کبھی کہیں نوکری کا چانس بن سکتا وہ تو اس امید پر تھے کہ ماں ہی ان کو کوئی دکان وغیرہ کھلوا دیں گی۔ میں نے ایک دو بار دبے لفظوں میں ماں سے اظہار کیا ان کو احساس دلایا کہ آپ چاہیں تو پوچھیں ان لوگوں سے کہ رات میں پینے کے لیے آدھا کلو دودھ بھی منگوانے کی اگر حیثیت نہیں تھی تو پھر اس گھر میں اس حیثیت کے لوگوں کی لڑکی لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر ماں اپنی چالوں میں لگی ہوئی تھیں۔

ان کی دشمنی کو اب ایک ہتھیار اور مل گیا تھا۔ میری ضرورت ختم ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی خاموش معاہدہ کرلیا ہے جس کا اصل مقصد صرف مجھے راہ راست پر لانا ہے۔

☆☆☆

تھوڑے دنوں بعد میرے امید سے ہونے کی خوشی اس طرح منائی گئی کہ مجھے رات گئے دھکے دے کر گھر سے باہر کھڑا کر دیا گیا۔ اب میں یہاں یہ بتاؤں کہ میرا سابقہ شوہر ایک بہت دور دراز کچے گھر میں مگر کچے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔

شام سے ہی سڑک سنسان ہو جاتی اور دور دور تک کسی انسان کا وجود نظر نہ آتا ہاں آوارہ کتے بے حساب تھے جو اکا دکا آنے جانے والے پر بلاوجہ بھونکتے رہتے۔ میں کمزور ہوئی ایک دم ڈھے گئی۔ کہاں تو میں ایک مرد یا عورت اور کہاں میرا یہ حشر، طاقت کا نشہ ہرا ہوا۔

پوری رات دروازے کے باہر بیٹھ کر گزاری۔ صبح دودھ والے کے آنے سے چند منٹ پہلے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ کسی بھی عورت پر جب اس کا شوہر یا سسرال والے ایسا یا اس طرح کا کوئی رویہ اپناتے ہیں تو دراصل ان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کو روکنے ٹوکنے والا عورت کے میکے سے کوئی نہیں ہوگا۔

باقیوں کو تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ عورت بدزبان ہے اور اس کو میز سلھانا مرد کا اولین فرض ہے۔ میں اب تک اپنی ماں کو سمجھ چکی تھی۔ وہ مجھے کنوئیں میں دھکا دے کر ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو چکی تھیں۔ اب مجھے ہی کنوئیں میں رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

''سابقہ شوہر کو میں بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں انگریزی فلمیں شوق سے دیکھتی تو ناراض ہو جاتا۔ تم بے ہودہ فلمیں دیکھ کر بگڑی ہو۔'' میں اس کے گھر میں آنے والے مرد کزنز انکلز وغیرہ سے بات کر لیتی تو پریشانی..... غرض وہ ہر طرح ایسے شک کا اظہار کرتا جیسے میں نے ساری زندگی بے راہ روی میں گزاری ہو۔

اس کے شک کو ثابت کرنے کے لیے میری ماں جو موجود تھیں۔

☆☆☆

مگر پھر یوں ہوا کہ میں تو ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اب ماں کو پریشانی لاحق ہونے لگی۔ ایک تو وہ مجھے بلانے پر بھی مجبور کہ ان کے گھر کا کاروبار میں ہی چلا رہی تھی دوسری طرف مجھے ماں کے ہاں جانے پر سابقہ شوہر کا منہ بند کرنا پڑتا یوں میں تو پھنسی ہی تھی۔ ماں بھی پھنس گئیں۔ اب آئے دن کے نخرے، آئے دن کی ڈیمانڈ۔

ایک دو بار کے بعد جب ان کی خواہش پوری نہ ہوئی تو مجھ پر زور دیا جانے لگا کہ ماں کے بلانے پر نہ جاؤں مگر یہاں میں اقرار کرتی ہوں میں باز نہ آئی۔

مجھے اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ اپنا فرض بھی سمجھتی تھی، ماں اکیلی تھیں ان کو فلو بھی ہو جاتا تو میں اس سے ملے بغیر نہ رہ پاتی تھی مگر پھر جیسی بھی تلخیوں کے ساتھ سسرال سے میکے آتی واپس سسرال چلی جاتی یوں سابقہ شوہر اپنی بھی بھڑاس نکال لیتا۔

پہلے زبانی کلامی بعد میں ہاتھا پائی۔ تھپڑ گھونسے لات..... میں خاموشی سے سہہ کر اپنے کاموں میں لگ جاتی..... مگر لت لگ گئی تھی تو مجھے مار پیٹ کر کام نکلوانے کی کوشش کی گئی جس کا کوئی سدباب نہ ہوا تو پھر بات بے بات طلاق طلاق ہونے لگا۔ ماں

نے بھی جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بھی اب اس کھیل سے تنگ آ گئی تھیں۔

''بھئی ہم کتنا دیں گے تم خود سمجھ دار ہو، سمجھ ہی رہو ہو ناں۔ وہ مجھے جیسے باور کراتیں کہ سابقہ شوہر کے لالچی ہونے میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

ایک دن یوں ہوا کہ میں کچھ بیمار سی تھی اور حالات کو سمجھ نہ سکی۔ سابقہ شوہر نے باقاعدہ میرا نشانہ نہیں باندھا تھا بس وہ اپنا غصہ نکالنا چاہ رہا تھا اس نے قریب میز پر رکھا ماربل کا پیپر ویٹ مجھے ڈرانے کے لیے دیوار پر مارنا چاہا مگر وہ سیدھا میرے ہی سر پر آن لگا۔

شاید میں ہی گھبرا کر پیپر ویٹ اور دیوار کے بیچ آ گئی تھی..... میرے سر سے گاڑھا گاڑھا خون بہنے لگا اور بہہ کر میرے کرتے کے گریبان کو گیلا کرنے لگا۔ میں گری تو جیسے ہوش ہی نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو خود کو ایک سرکاری ہسپتال کے بغیر چادر کے گندے سے گدے پہ پایا۔ میرے آنے سے ایک دن پہلے ہی شہر میں کسی سیاسی پارٹی کے جلسے میں کوئی حادثہ یا دھماکا ہوا تھا تمام بستر بھرے ہوئے تھے لہٰذا بہت سے مریضوں کو زمین پر جیسے تیسے گدے ڈال کر لٹا دیا گیا تھا۔

میرے برابر میں ابھی شاید کسی لاوارث کا انتقال ہوا تھا اس کو سفید چادر سے منہ تک ڈھانکا ہوا تھا مگر اس کے مردہ جسم سے بے حد تیز قسم کی بدبو میرے چاروں طرف پھیل رہی تھی شاید یہی بدبو مجھے ہوش میں لے آئی تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ مجھے بے ہوشی میں ہسپتال کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا دیکھ کر کسی راہ گیر نے ایمرجنسی تک پہنچایا۔

اوہ ہاں سوری مجھے یاد آیا وہ راہ گیر تو تم ہی ہو اس بات کا ایک بار پھر شکر یہ کہ تم میرے ساتھ ساتھ رہے تم نے مجھے کم از کم لاوارث ہونے سے بچا لیا تھا۔ اسی بے ہوشی میں مجھے بچے سے بھی محروم کر دیا گیا بقول ہسپتال انتظامیہ کہ سر پر چوٹ کچھ ایسی ہی شدید تھی کہ میرے جسم نے کام کرنا تک چھوڑ دیا تھا یہ تو بہت غنیمت ہوا کہ میں کوما میں نہیں گئی۔

میں واپس میکے آ گئی اور اس کے ہی چند ہفتوں بعد طلاق نامہ بھی مل گیا۔ میں تمہارا احسان بھی نہیں بھول سکتی کہ تم مسلسل ہم سے رابطے میں رہے۔ ماں کو بھی تسلی کے لیے تم جیسے ہی سمجھ دار اور بردبار انسان چاہیے تھا مگر..... میں نے تو کبھی بھول کر بھی یہ نہ سوچا تھا کہ تم..... یعنی تم اس وجہ سے یہاں آ رہے ہو اور اب مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ اتنا کچھ بتانے پر بھی تم اپنے فیصلے پر قائم ہو۔ بھئی میں یہ بھی بتا دوں کہ اب مجھے کئی لوگوں نے مشورہ دیا کہ میں کسی سائیکاٹرسٹ یا سائیکالوجسٹ کو دکھا دوں مجھے ضرورت ہے مگر بات یہ ہے کہ اب مجھے اپنے آپ کی ایسی ہی عادت ہو چکی ہے۔

دیکھو جب ایک نازک برتن آپ کے ہاتھ سے یا کسی کے بھی ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتا ہے تو آپ کو لاکھ اس پر پیار آئے وہ دوبارہ آپ کے کام نہیں آ سکتا۔ آپ چاہیں بھی تو اس کی زندگی کو ویسا ہی فعال نہیں بنا سکتے۔ کہیں نہ کہیں کچھ ایسی واضح دڑاڑیں پڑ جاتی ہیں کہ آپ چاہ کر بھی اس کی اصل شکل و صورت اجاگر نہیں کر سکتے۔

میں تو یہی مشورہ دوں گی کہ دنیا بھری پڑی ہے کسی ایسے پر ہاتھ رکھو جو میری طرح ٹوٹا بکھرا ہوا نہ ہو..... بہرحال تم کو مجھ سے کہیں بہتر مل سکتی ہے۔ شادی کے لیے عورت کی ضرورت ہوتی ہے مرد نما عورت کی نہیں۔ سنو تم اس طرح ہنس کر میری بات نہیں ٹال سکتے۔

اور ..... اور یہ انگوٹھی..... یہ کس لیے چھوڑے جا رہے ہو۔ ٹھیک ہے انگوٹھی بہت پیاری ہے اور مجھے شوق بھی ہے پہننے کا، میں چند دن پہن لیتی ہوں مگر نہیں میں تمہارے یا تمہارے گھر والوں کے چند دن بعد آنے پر تیار ہو کر بالکل نہیں بیٹھوں گی..... تم لکھ لو اپنے پاس میں اس رشتے سے انکار کر دوں گی..... شاید!

☆

وصال کی خواہش،

کہہ بھی دے اب وہ سب باتیں
جو دل میں پوشیدہ ہیں
سارے روپ دکھا دے مجھ کو
جو اب تک نادیدہ ہیں
ایک ہی رات کے تارے ہیں
ہم دونوں اس کو جانتے ہیں
دُوری اور مجبوری کیا ہے
اس کو بھی پہچانتے ہیں
کیوں پھر دونوں مل نہیں سکتے
کیوں یہ بندھن ٹوٹا ہے
یا کوئی کھوٹ ہے تیرے دل میں
یا میرا غم جھوٹا ہے

منیر نیازی

نیا سفر،

تعلقات کا افسوں گدوڑتوں کا غبار
دلوں کا بُغض، محبت کے واڑوں کا حصار
مسرّتوں کا ہر اک رنگ، غم کا ہر لمحہ
گزرتی موج کی مانند اُبھر کے ڈوب گیا
خلوص و مہر و عداوت کی ساری تجسیریں
پلک جھپکنے کی مہلت میں جل کے راکھ ہوئیں
نہ کٹنے والے کٹھن دن خیال و خواب ہوئے
نہ آنے والے جو دن تھے وہ آ کے بیت گئے
غمِ فراق شبِ انتظار صبحِ وصال
بس ایک گردشِ زمانہ محیط ہے سب پر
یہ صبح تو ہے کہ شامِ حیات کی منزل
یہ اختتام سفر ہے کہ ابتدائے سفر

محمود ایاز

ہے دُعا یاد مگر حرفِ دُعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں

میں نے پلکوں سے دریار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

میں نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں

کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں
کیسے مہکی چراغوں کی ضیا، یاد نہیں

صرف دُھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا کون ہوا کس سے خفا، یاد نہیں

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جُرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغرؔ کو خدا یاد نہیں

ساغرؔ صدیقی

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لادوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے ہم پہ ستم بھی میسّر ہو یا نہ ہو
کیا جانے یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنّا نہ کر سکو

صوفی تبسّم

ادارہ

ایک سے بڑھ کر ایک

ایک صاحب سے ان کے تمام ملنے والے بہت گھبراتے تھے اور جوں ہی ان کی شکل نظر آتی ہر ایک چھپنے کی کوشش کرتا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ صاحب ہر ایک سے کچھ نہ کچھ قرض مانگ لیتے تھے اور اکثر لینے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے مگر واپس کرنا انہیں یاد نہیں رہتا تھا۔

ایک روز خواجہ صاحب انہیں سرِ راہ نظر آ گئے اور وہ کوشش کے باوجود چھپ نہ سکے۔ ان صاحب نے خواجہ صاحب کو جالیا اور تمہید باندھی۔ ''یار ایک بڑی ایمرجنسی آن پڑی ہے۔ دو ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔ میں اس سلسلے میں سوچتا آ رہا تھا اور فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس سے مانگوں؟''

''خدا کا شکر ہے آپ فیصلہ نہیں کر پا رہے۔'' خواجہ صاحب نے اطمینان سے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں تو سمجھا تھا آپ نے مجھ سے مانگنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

آثارِ قدیمہ

ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔ ''مجھے ایسی جگہ ملازمت مل گئی ہے۔ جہاں آثارِ قدیمہ کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔''

دوست نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''اچھا وہ کون سی جگہ ہے؟''

اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بیوٹی کلینک میں کام مل گیا ہے۔''

بے چارگی

ایک بہت ہی موٹی عورت اسٹیشن پر ریلوے گاڑی سے اتر رہی تھی چونکہ وہ حد سے زیادہ موٹی تھی اس لیے وہ گاڑی کے دروازے سے عام لوگوں کی طرح سیدھا اترنے کے بجائے الٹا اتر رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے یہ سوچ کر شاید یہ خاتون ریل گاڑی میں سوار ہونا چاہ رہی ہے۔ سہارا دے کر گاڑی میں سوار کرا دیا۔

''خدا کے لیے اب تو اتر جانے دو۔'' اس عورت نے بے بسی سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ''ہر اسٹیشن پر میرے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔ جہاں مجھے اترنا تھا۔ وہاں سے پانچ اسٹیشن آگے آ چکی ہوں۔''

خوب گزرے گی!

دولہا نے شادی کے اوائل دنوں میں اپنی نئی نویلی دلہن پر رعب جھاڑتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ ''میں تم سے شادی سے پہلے فیس بک پر بیس لڑکیوں کے ساتھ چکر چلا چکا ہوں۔''

دلہن نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا تھا کہ جب ہمارے ستارے ملتے ہیں تو ''کرتوت'' بھی ملتے ہوں گے۔''

ستم ظریفی

اخباری نمائندوں کا ایک گروپ ملک کے مشہور پاگل خانے کا دورہ کرنے آیا تھا۔ ایک ڈاکٹر انہیں دورہ کراتے ہوئے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ گروپ کے ارکان ایک کوٹھڑی کے سامنے رکے تو انہوں نے دیکھا کہ اس میں ایک پاگل ہاتھوں میں بڑی سی گڑیا لیے بیٹھا تھا۔ وہ کبھی اس سے باتیں کرنے لگتا اور کبھی رونے لگتا۔ اسے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہ تھا۔

''اس شخص کی کہانی بڑی المناک ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''اسے ایک لڑکی سے شدید محبت تھی لیکن اس نے بے وفائی کی اور اسے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر لی۔ اس غم میں یہ پاگل ہو گیا۔ اب یہ اس گڑیا کو وہی لڑکی سمجھ کر اس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔''

اخباری نمائندوں نے مختلف انداز میں اس شخص کے بارے میں تاسف اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ آگے بڑھے تو ایک کوٹھڑی میں ایک شخص نظر آیا جو دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔ اس کے سر کو چوٹ سے بچانے کے لیے دیواروں پر فوم کے گدے لگا دیے گئے تھے۔

''اور یہ ہے وہ شخص جس سے اس لڑکی نے شادی کی تھی۔'' ڈاکٹر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اراکین کو آگاہ کیا۔

معصوم شوہر

بیوی نے شوہر کا موبائل چیک کیا تو اسے تین نہایت مشکوک نام نظر آئے (1) نزاکت ولی (2) بھولی بھالی (3) سپنوں کی شہزادی۔ ظاہر ہے یہ دیکھ کر بیوی کا پارہ غصے اور دکھ سے اوپر چلا گیا۔ اس نے فوری طور پر پہلا نمبر ملایا تو دوسری جانب اس کی امی یعنی شوہر کی ساس نے جواب دیا۔ پھر اس نے دوسرا نمبر ملایا تو دوسری جانب اس کی آٹھ سالہ چھوٹی بہن نے جواب دیا۔ جب اس نے حیرت سے تیرا نمبر ملایا تو اس کا اپنا فون بج اٹھا۔ بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اسے خود پر انتہائی افسوس ہوا کہ کیوں اس نے اپنے معصوم شوہر کے کردار پر شک کیا۔ اسی پچھتاوے کو کم کرنے کے لیے اس نے اپنی پیارے شوہر کو اپنی پچھلے ماہ کی تنخواہ تحفے میں دے دی۔

شوہر نے اس پیسے سے اپنی گرل فرینڈ کے لیے تحفہ خریدا۔ جس کا نمبر اس نے اپنے موبائل میں بشیر الیکٹریشن کے نام سے سیو کیا ہوا تھا۔

کارگر نسخہ

نیویارک کے ایک پارک میں ایک معمر شخص کی ادھیڑ عمر بیوی سے ملاقات ہوئی۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ جو بعد میں دوستی اور پھر رومان کی صورت اختیار کر گیا۔ کچھ دنوں بعد معمر شخص نے خاتون سے شادی کی درخواست کی، جو فوراً منظور کر لی گئی۔ اس معمر شخص نے بیوی کو منگنی کی انگوٹھی بھی پہنا دی۔ پھر انہوں نے اپنے لیے مکان کی تلاش شروع کر دی کیونکہ بڑے میاں ایک ہوٹل میں رہتے تھے۔

بیوہ نے ایک مکان پسند کیا اور اس کے ہونے والے شوہر نے منہ مانگی قیمت دے کر اس مکان کو خرید لیا لیکن دوسرے روز وہ بیوہ خاتون مقررہ وقت پر پارک میں نہیں پہنچی۔ بڑے میاں نے بہت انتظار کیا۔ کئی روز گزر گئے مگر خاتون کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔ خاتون نے بڑے میاں کو اپنے گھر کا جو پتہ بتایا تھا وہ اس پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ خاتون وہاں سے جا چکی ہے۔

یہ مکان وہی تھا جو بڑے میاں نے ایجنٹ کی معرفت خریدا تھا اور ان کی ہونے والی دلہن نے بے حد پسند کیا تھا۔ ایجنٹ سے دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ خاتون اس مکان کی مالکہ تھی اور ایک عرصے سے اسے فروخت کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی مناسب قیمت نہیں ملتی تھی۔

سوا سیر

ایک لڑکا رشتے کے سلسلے میں لڑکی دیکھنے گیا۔ لڑکے کو لڑکی پسند آ گئی تو اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے والد کی استطاعت ہے کہ وہ سلامی میں مجھے کار دے سکیں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''میرے ابا کی حیثیت تو ہوائی جہاز دینے کی ہے۔ کیا آپ کے ابا کی حیثیت ایئر پورٹ بنانے کی ہے؟''

باادب بانصیب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے۔ اے آدم کے بیٹے! اگر ابتدائے صدمے کے وقت تو صبر کر لے اور حصول ثواب کی نیت کرے تو میں تیرے لیے جنت سے کم ثواب پسند نہیں کروں گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز،

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی پیچھے کھڑے ہو کر نماز شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہیں تھا کہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں شامل ہو گیا ہوں۔ آپ نے سورۂ بقرہ شروع فرما رکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ سورہ ختم کر کے آپ رکوع کریں گے لیکن آپ پڑھتے ہی رہے۔

حضرت سنان راوی کہتے ہیں کہ میرے علم کے مطابق حضرت حذیفہ نے یہی فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعت نماز پڑھی۔ حضور کا رکوع قیام کی طرح لمبا ہوتا تھا۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے (نماز کے بعد) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

میں نے عرض کیا: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا، اب تک میری کمر میں درد ہو رہا ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر مجھے پتا چل جاتا کہ تم میرے پیچھے ہو تو میں نماز مختصر کر دیتا۔"

اونچی آواز سے دعا کرنا اور آمین کہنا،

حضرت قیس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت زید بن ثابت مدنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کسی چیز کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فرمایا۔

"تم جا کر یہ بات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھو کیونکہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور فلاں آدمی ہم تینوں مسجد میں دعا کر رہے تھے اور اپنے رب کا ذکر کر رہے تھے۔

اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ ہم خاموش ہو گئے۔ فرمایا۔

"جو تم کر رہے تھے اسے کرتے رہو۔"

چنانچہ میں نے اور میرے ساتھی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پہلے دعا کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری دعا پر آمین کہتے رہے۔ پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دعا کی۔

"اے اللہ! میرے ان دو ساتھیوں نے جو کچھ تجھ سے مانگا، میں وہ بھی تجھ سے مانگتا ہوں اور ایسا علم بھی مانگتا ہوں جو کبھی نہ بھولے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ دوسی نوجوان (یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) تم دونوں سے آگے نکل گئے۔"

تین دُعائیں،

حضرت جامع بن سواد ؒ کے ایک رشتے دار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب ؓ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ تین دُعائیں ایسی ہیں کہ جب میں وہ مانگوں تو تم ان پر آمین کہنا۔

"اے اللہ! میں کمزور ہوں مجھے قوت عطا فرما، اے اللہ! میں سخت ہوں، مجھے نرم کردے۔ اے اللہ! میں کنجوس ہوں مجھے سخی بنادے۔"

فرشتوں کے ذریعے مدد،

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں، حضرت ابواسیدؓ نے بینائی جانے کے بعد فرمایا۔

"اے میرے بھتیجے! میں اور تم اگر میدان بدر میں ہوتے اور اللہ تعالیٰ میری بینائی واپس کردیتے تو میں تمہیں وہ گھاٹی دکھاتا جہاں سے فرشتے نکل کر ہمارے لشکر میں آئے تھے اور اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔"

حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "حضرت جبرائیل علیہ السلام جنگ بدر کے دن حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکل وصورت پر اُترے تھے۔ انہوں نے سرپر زرد رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی جس کا کچھ کپڑا ان کے چہرے پر بھی تھا۔"

شریف آدمی کی پہچان،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

"شریف آدمی کی پہچان یہ ہے کہ جب اس سے کوئی سختی کرے تو نرمی سے پیش آئے اور جب اس سے نرمی کرے تو نرم ہوجائے اور کمینے کی شناخت یہ ہے کہ جب اس سے کوئی نرمی کرے تو سختی سے پیش آئے اور جب کوئی سختی کرے تو ڈھیلا ہوجائے۔"

نصیحت،

ایک شخص حضرت علیؓ کے پاس گیا اور کہا۔

"مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔"

حضرت علیؓ نے کہا۔

"کوئی چیز ملے تو خوش نہ ہو، چلی جائے تو غم نہ کر، انسانوں کا سب سے بڑا خیر خواہ وہ ہے جو انہیں اللہ کی رحمت سے مایوس اور گناہ پر جری نہ ہونے دے۔"

صالح حکمران کی برکت،

سیدنا عمر بن عبدالعزیز ؒ مسند خلافت پر جلوہ فرما ہوئے تو پہاڑوں کے دامن میں رہنے والے چرواہے نے پوچھا۔

"مسلمانوں پر یہ کون صالح، پاکیزہ خصلت خلیفہ مقرر ہوا ہے؟"

راوی نے پوچھا۔ "یہ بات تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوئی؟"

چرواہے نے کہا "جب کوئی نیک اور صالح حکمران مسند نشین ہوتا ہے تو شیر اور بھیڑیے ہمارے جانوروں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔"

باتیں اچھے لوگوں کی،

- گیدوں میں بھرنے والے آوارہ لوگ سنجیدہ افراد کے لیے بڑی سبق آموز نصیحتیں ہیں۔
(اردن ایڈمن)
- زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی، محبت اسے تار اور سوئی کے بغیر سی لیتی ہے۔
(علامہ اقبال)
- ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو۔
(خلیل جبران)
- جو گھر حاجت مند کو روٹی کا ایک ٹکڑا اور ضرورت مند کو ایک بستر کی جگہ دیتے ہیں بخل سے کام لے، وہ بربادی کے قابل ہے۔
(خلیل جبران)
- خاموش انسان خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔ خاموشی خود ایک راز ہے۔
(واصف علی واصف)

نادیہ یاسر۔ گوجرخان

ہاتھا پائی پر اُترنے والا،

دو چینی مزدور ایک ہوٹل میں کھڑے بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ ایک غیر ملکی کو حیرت ہوئی کہ ابھی تک ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی۔ ایک چینی نے کہا۔

"جب کوئی شخص ہاتھا پائی پر اُتر آئے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس دلیل نہیں رہی ہے۔"

(فرینکلن روز ویلیٹ)

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قصہ،

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قصہ ہے کہ ان کو کسی نے بعد وفات خواب میں دیکھا۔ پوچھا۔

"آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟"

فرمایا: "مجھ سے سوال ہوا تھا کہ ہمارے واسطے کیا لائے؟"

میں نے سوچا کہ اور اعمال تو میرے ناقص ہیں۔ ان کا تو کیا نام لوں، البتہ میں مسلمان ہوں اور بحمد للہ توحید میری کامل ہے۔ اس کو پیش کر دوں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں۔ ارشاد ہوا۔

"وہ دودھ والی رات یاد نہیں؟"

یہ ایک واقعے کی طرف اشارہ تھا کہ ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ نے دودھ پیا تھا۔ اس کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔ تو آپ کے مُنہ سے نکل گیا۔

"دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا۔"

اس پر مواخذہ (پکڑ) ہوا کہ تم نے درد کو دودھ کی طرف منسوب کیا۔ کیا یہی توحید ہے، جس کو تم ہمارے واسطے لائے ہو کہ دودھ کی طرف درد کی نسبت کرتے ہو؟"

حضرت بایزید بسطامیؒ یہ سُن کر گھبرا گئے اور عرض کیا "الٰہی! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

ارشاد ہوا۔ "راہ پر آ گئے تو جاؤ۔ اب ہم تم کو ایسے عمل سے بخشتے ہیں جس پر تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ اس سے بخشش ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو سردی میں اکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم کو اس پر رحم آیا اور اپنے لحاف میں لا کر سُلا لیا۔

اس بچے نے دُعا کی "اے اللہ! اس کو ایسے ہی راحت دیجیے جیسا اس نے مجھے راحت دی۔ جاؤ ہم تم کو اس بلی کے بچے کی دُعا سے بخشتے ہیں۔"

سارا تصوف دھرا رہ گیا۔ سارے مراقبے اور مجاہدے رکھے رہ گئے۔ اور ایک بلی کے بچے کی سفارش سے بخشے گئے۔

جیسے لفظوں سے لفظ ملتے ہیں،

- خوشی انسان کو اتنا نہیں سکھاتی جتنا غم سکھا دیتا ہے۔
- سچائی ایک ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر شہد سے بھی میٹھی ہے۔
- گناہوں پر نادم ہونا انہیں مٹا دیتا ہے جبکہ نیکیوں پر مغرور ہونا اُن کو تباہ کر دیتا ہے۔
- تمہارا بہترین دوست وہ ہے جو تمہیں تمہاری کوتاہیوں سے آگاہ کرے۔

سائرہ احسان۔ لاہور

سچ کا حاصل،

- آپ کا اصل ساتھی اور آپ کا صحیح تشخص کرنے والا آپ کے اندر کا انسان ہے۔ اسی نے عبادت کرنا ہے اور اسی نے بغاوت۔ وہی دُنیا والا بنتا ہے اور وہی آخرت والا۔ اسی اندر کے انسان نے آپ کو جزا و سزا کا مستحق بنانا ہے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کا باطن ہی آپ کا بہترین دوست اور وہی بدترین دُشمن۔ آپ خود ہی اپنے لیے دشواریٔ سفر ہیں اور خود ہی شادابیٔ منزل بھی۔
- ایمان ہمارے خیال کی اصلاح کرتا ہے۔ شکوک و شبہات کی نفی کرتا ہے۔ وسوسوں کو دل سے نکالتا ہے۔ ایمان ہمیں غم اور خوشی دونوں میں اللہ کے قریب رکھتا ہے۔ ہم ہر آزمائش میں پورے

رضیہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

پہلا خط جہانیاں سے زینب نور کا ہے، لکھتی ہیں

پچھلے ایک ہفتے سے میں ملتان میں آپی کے پاس ہوں اور تب سے ہی یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ اب کی بار خاصی آسانی سے بزم شعاع میں شرکت کر سکوں گی۔ اللہ اللہ کر کے یکم آئی، اسے ہماری قسمت کہیے یا کچھ بھی، شمارہ نہ یکم کو ملا نہ دو کو۔ تین کو بھائی (بہنوئی) رات کو گیارہ بجے کام سے لوٹے۔ چار کو صبح صبح جانا تھا اور رات گئے واپسی ہونا تھی بھائی کی۔ ہماری لسوڑی جیسی شکل دیکھی تو بھائی کو ترس آ گیا۔ یوں چار جولائی کو بے چارے بھائی اتنی دور سے چلچلاتی دھوپ میں دوپہر دو بجے اپنا کام چھوڑ کر اپنے بغیر چھت کے لوڈر پر صرف ایک شعاع دینے آئے۔

''یہ لو میری بہن اب خوش؟'' اور ان ہی قدموں پہ واپسی چلے گئے۔ کہنے کو تو ایک شعاع دے گئے مگر مجھے لگا وہ جو کہتے تھے کہ تم لوگ میری سگی بہنیں ہو، اس بات کا ثبوت بھی دے گئے اور ساتھ میں مان اور خلوص کی رنگا رنگ تتلیاں بھی، اللہ پاک میری آپی اور بھائی کو ڈھیروں ڈھیر خوشیاں عطا کرے۔ آمین

اب آتے ہیں شعاع کی طرف، حمد و نعت اور قربانی کے مسائل..... خوب اعلا، بہترین۔

کہانیوں میں سب سے پہلے ''عسر یسرا'' پڑھی حسنہ جی آئندہ اتنی چھوٹی قسط مت دیجیے گا۔ خیر چھوٹی لکھی مگر خوب لکھی۔ ''شام کی حویلی'' کچھ بھی نیا نہ تھا۔ شک مجھے پہلے ہی تھا کہ یہ کشف سونیا کی بیٹی ہے۔ زینب کو بے وجہ ہی سزا مل رہی ہے۔

خزاں رسیدہ پتے، عابدہ یونس کی ہے یا مصباح یونس کی، عنوان بالکل بھی میل نہ کھاتا تھا کہانی سے عابدہ یا مصباح! معذرت کہانی کچھ خاص نہ لگی۔

افسانے قریباً سب ہی اچھے تھے۔ دردہ بخاری اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے سب سے اچھے لگے۔ رشتوں میں توازن..... آج کے دور میں شاید ہی کسی کو رکھنا آتا ہو۔ ''شمع کی لو'' اچھا تھا مگر پہلا پیراگراف۔ ماں بیٹی کے درمیان ایسی بے جھجک گفتگو نہیں ہونی چاہیے۔ ہر رشتے میں ایک پردہ ہوتا ہے۔ اور اس پردے میں بلا کا حسن۔ ''اب یہ ملنا ملانا ختم کر کے سیدھا یہاں بلا.....'' ماں کے اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے کچھ خاص پابندی نہ لگائی تھی بیٹی پہ۔

''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' م۔ ح افف ایسی شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ م۔ ج کی یہ بات مجھ ناقص العقل کو ناگوار سی لگی۔ ''تعلیم ہمارے گھر کی لونڈی'' پیاری بہنا، تعلیم تو سر کا تاج ہوتی ہے، آنکھوں کا نور ہوتی ہے۔ یہ لونڈی کب سے بننے لگی۔ ہم سے پوچھ کر دیکھیں۔

ہماری تائی، چچی، پھپھو، دور و نزدیک کے تمام رشتے داروں کی خواتین کو اکٹھا کر لیں۔ کوئی عورت تعلیم یافتہ تو کیا قرآن پاک تک پڑھی ہوئی نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کے بعد ہمارے والدین کا احسان کہ میٹرک کے بعد ایف اے (گھر بیٹھے ہی سہی) کی بھی اجازت دے دی۔ اور جب بے چاری چھوٹی جڑواں کی باری آئی، وہ اکیڈمی ہی بند ہو گئی جہاں سے ہم نے میٹرک کیا تھا۔ میٹرک تو اوکھے سوکھے کر لیا۔ آگے کوئی آثار نہیں۔ دونوں بڑی آپیوں نے پرائمری تک پڑھا ہے اور ہم دو بہنوں نے

الیف اے کیا ہے۔ باقی کوئی بھی لزن مڈل سے آگے تک نہ جاسکی۔

جب امی بیاہ کر آئیں تو دادا ابو بہت خوش رہنے لگے اور اکثر ہی اٹھتے بیٹھتے کہتے کہ ''اللہ تیرا شکر ہے میرے گھر میں بھی کوئی قرآن کھولنے والی آئی۔'' امی بس قرآن پاک پڑھی ہوئی ہیں۔ اردو پڑھنی آتی ہے اس لیے اسلامی کتابیں پڑھتی رہتی ہیں اور ماشاء اللہ باشعور خاتون کے روپ میں ڈھل گئیں۔

ادھر آپی کے پاس ہی ہماری ایک پھپھو رہتی ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں میری ہی ہم عمر ہیں۔ ایک دن کہنے لگیں۔

''جب پہلے پہلے آپ لوگ آتے تھے ناں تو ہم سمجھتے تھے کہ آپ سب پڑھی لکھی ہو، ہمیں منہ ہی نہیں لگاؤ گی، نخرے ناک پہ چڑھے ہوں گے مگر جب آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں چاول کھائے تو ہم حیران رہ گئے۔''

اور ہم ان کی بات پہ حیران..... وہ بھی ناخواندہ ہی ہیں۔ توجہ ملتی تو شاید، مگر توجہ دے کون؟ سب کی زبان پہ ایک ہی بات ''پڑھ لکھ کر کون سا افسر لگ جانا ہے، ماجھنے تو بھانڈے ہیں۔'' چلو جی بات ختم۔

ہمارے بھائی خاندان کے پہلے لڑکے ہیں جنہوں نے ایم اے کیا ہے اور اب پیشے کے اعتبار سے ٹیچر ہیں۔

محنت مزدوری کرنے والوں کے بچے بھی محنت مزدوری ہی کریں گے۔ تو رفع کرو پڑھائی وڑھائی کو۔'' ایسے ایسے ڈائیلاگ سننے کے بعد بندہ بھلا کیا کہے کسی کو۔

''خط آپ کے'' محفل کی ڈیسنٹ پرسنالٹیز (ناہید اسماعیل، ثمینہ اکرم، کوثر خالد) غائب ہیں۔ بس سلمیٰ مسرت اور زرینہ خانم نے حاضری دی ہے، کرن بخاری اور باقی ملتان والیوں کہاں رہتی ہو سب۔

حمیرا گل، فہمیدہ جاوید، صدف ناز انصاری کرن بخاری و دیگر..... آپ کو ملتان کے بازاروں میں ہر چہرے پہ کھوجتی ہوں۔ اب کی بار آپی نے کپڑے خریدنے تھے سو حسین آگاہی بھی گھوم آئی اور حرم گیٹ بھی.....

''چلو تمہیں چیز اپ بھی دکھاتے ہیں'' آپی نے کہا اور پھر ہم نے زندگی میں پہلی بار کوئی شاپنگ مال بھی دیکھ لیا۔ بھئی سچ کہوں تو ہم نے دنیا دیکھی ہی آپیوں کی شادی کے بعد ہے۔ کچھ ابو نرم مزاج ہو گئے۔ بندشیں کم ہو گئیں۔ کچھ آپیاں دعوتوں کے بہانے عید بقرعید پہ بلا لیتی ہیں۔ اب تو ہم نے ملتان کا قلعہ، چناب پارک اور جھیل بھی دیکھ لیے ہیں۔ جب میں نے پہلی بار ملتان میں لڑکیوں کو ڈرائیو کرتے اور بغیر دوپٹے کے گھومتے دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی اور ہی دنیا سے آئی ہوں۔

خیر..... چھوڑیے ناں..... اپنی حیرت شیئر کرتے کرتے آپ کو بور کرنے لگ گئی۔ امی صحیح کہتی ہیں، زینب کو فضول بولنے کی عادت نہیں، بیماری ہے۔ نہ صرف بولنے کی بلکہ اونچا بولنے کی بھی..... اور ہنسنے کی بھی.....

اقراء سرور ٹھیک کہا آپ نے، یہ ڈاکٹرنی خود واقعی کسی کو بھی پاگل نہیں کرتی۔ ہم بھی پینڈو ہیں اور اس بات پہ ہمیں شرمندگی نہیں فخر محسوس ہوتا ہے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں.....! ثانیہ بلال کہاں ہو؟ تیز دھوپ ہے۔ ہاتھوں کا چھجا بنا کر دیکھ رہی ہوں پھر بھی نظر نہیں آ رہیں۔ فائزہ بھی تو ایسی پپا جی کو پیاری ہوئیں، ہم سب کو بھول ہی گئیں۔ کوئی بات نہیں۔

تمام قارئین سے ایک بات ہم سب کے خطوط پوری توجہ سے پڑھے جاتے ہیں، چاہے وہ شائع ہوں یا نہ ہوں۔ ثبوت ہے میرے پاس مارچ میں میں نے اپنے ابو کی طبیعت کی ناسازی کا ذکر کیا تھا۔ خط لیٹ ہو گیا اور شائع نہ ہو سکا۔ ڈیڑھ ماہ بعد اتفاق آپی سے بات ہوئی تو انہوں نے فوراً ابو کا حال دریافت کیا۔ حیران..... واقعی آپ کی محبت اور خلوص..... خالص ہے۔

ج: پیاری زینب! دلچسپ اور مزے دار خط لکھنے کے لیے شکریہ۔ آپ کا خط بھی اچھا خاصا افسانہ ہی ہے۔ آپ کا افسانہ ''دن بچپن کے'' جولائی کے خواتین میں شامل ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کے خاندان میں دنیاوی تعلیم نہ سہی دینی تعلیم کا بھی رواج نہیں ہے۔ قرآن پاک تو دین اور دنیا کو سنوارنے اور زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔

خزاں رسیدہ پتے مصباح یوسف نے لکھا تھا۔

حمیرا شفیع صادق آباد سے شریک محفل ہیں

فہرست کا صفحہ پلٹا تو اکٹھے چار مکمل ناول اور چھ افسانے دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ پھر معمول کے مطابق ''پہلی شعاع'' تک پہنچے۔ رضیہ آپی! آپ نے شدید گرمی اور لوڈ شیڈنگ سے متعلق خوب کہا۔ ایک مزے دار واقعہ یاد آ گیا۔ چند دن پہلے ہمارے گھر ایک کزن صاحب تشریف لا رہے تھے۔ ہم دعوتی کھانے پکا کر انتظار کرتے رہے مگر مہمان نہ پہنچے۔ تشویش سے فون کیا جواب ملا ''ابھی آ رہا ہوں۔''

ساری دوپہر ڈھل گئی۔ وقفے وقفے سے فون کرتے رہے۔ جب کرتے جواب ملتا ابھی آ رہا ہوں۔ شام کے وقت ہانپتے کانپتے مہمان تشریف لائے۔ سر سے پاؤں تک پانی میں بھیگے ہوئے۔ بالوں اور کپڑوں جوتوں سے پانی ہی پانی ٹپک رہا تھا۔ ہائے اللہ جی! یہ کیا ہوا.....؟ نہ آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ بارش کے آثار۔

مہمان کے کچھ اوسان بحال ہوئے تو بتانے لگے کہ آپ کے شہر جب بس سے اترے تو راستے میں نہر کنارہ نظر آیا۔ بس طبیعت مچل گئی۔ رکشے والے کو بیچ راستے میں ہی رکوا کر کرایہ تھمایا اور کپڑے جوتوں سمیت نہر میں کود گئے۔ اب شام تک نہر میں ہی تیرتے رہے تھے۔

''جب تجھ سے ناتا جوڑا'' میں بہن م۔ ج کے حالات پڑھ کر دکھ ہوا۔ بھینسوں کا ڈیرا اور باتھ روم ندارد۔ میکے اور سسرال کے ماحول میں غیر معمولی تضاد بچیوں کے لیے بہت مشکلات کھڑی کر دیتا ہے۔

''عید قربان اور آپ'' میں تسنیم کوثر اور سلمیٰ مسرت کی بڑی عید کے حوالے سے مصروفیت اچھی لگی۔

اس بار شاہین آپا وہاج علی، انعمتہ اور نازش جہانگیر کو محفل میں لے کر آئیں۔ تینوں کی گفتگو دلچسپ رہی۔ مونا شاہ کی پیام عید میں تایا تائی کی لڑائی خوب رہی۔

فرح بخاری کی ''کرپال سنگھ کی ڈائری'' ایک دل سوز افسانہ تھا۔ وردہ بخاری کی ''ماں جایا'' اور شازیہ کی

اقراء سرور، مدیحہ پٹانی، زوبیہ مظہر اور ہانیہ ہارون کا تبصرہ شاندار رہا آپی! میری تمام بہنوں سے درخواست ہے کہ وہ تحریروں پر مثبت اور تعمیری تنقید کیا کریں۔ کسی بھی رائٹر کی تحریر کو ایک دم فضول یا ایویں سی کہنا اخلاقی لحاظ سے بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ آپ تحریر میں موجود جھول یا خامیوں کی نشاندہی ضرور کریں تاکہ رائٹر کو زیادہ لکھنے میں رہنمائی حاصل ہو۔

ج: پیاری حمیرا! بہت اچھی بات کی ہے آپ نے، بلاوجہ کی تنقید سے رائٹر کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔۔

ثمینہ اکرم نے بہار کالونی کراچی سے محفل کو رونق بخشی ہے لکھتی ہیں

کاغذ قلم سے رشتہ ٹوٹے ایک عرصہ ہو گیا، ایسا لگتا ہے جیسے کہ لفظ خفا ہوں مجھ سے، خیالات کا ہجوم بیکراں، بھاگتے دوڑتے الفاظ..... کوئی سرا ہاتھ ہی نہ آتا تھا، میں تو لکھنا ہی بھول گئی ہوں جیسے..... پھر ایک خوب صورت گلابی شام 28 جون کو کسی مہربان دوست کا فون آیا، نام جان کر سماعتوں کو یقین دلانا مشکل ہو گیا، دل تھا کہ جیسے ابھی سینے سے باہر آ جائے گا (یہ میری سچی قلبی کیفیت ہے) ان کا محبت بھرا لہجہ، پرخلوص اصرار..... میری طبیعت کی طرف سے تشویش، اور پھر میری خیریت جان کر اظہار اطمینان یہ سب باتیں محرک بنیں، ثمینہ اکرم کو پھر سے لکھنے کے لیے ہمت عطا کرنے کی، آخر کو پیاری امثل سے کیا ہوا وعدہ بھی تو وفا کرنا تھا۔ (پیاری امثل جی بہت بہت شکریہ۔ سدا خوش رہیں۔ آمین)

وہ سب قارئین جو میری طویل غیر حاضری کی وجہ سے تشویش میں مبتلا تھیں اور میرا پوچھتی رہتی تھیں ان سب کو اور باقی سب کو بھی میرا محبت بھرا سلام، میں بفضل خدا تعالیٰ بالکل خیریت سے ہوں۔

جولائی کا شعاع یکم جولائی کو ہی مل گیا تھا۔ ماڈل کا گیٹ اپ + جیولری بہت پسند آئی، رسالہ کھولا تو عید

سروے پر نظر پڑی، ہیں؟ یہ کب آیا؟ جون کا رسالہ پڑھا مگر سروے کے سوالات پر نظر تک نہ پڑی، خود فراموشی کا عالم دیکھا نہ جائے، اپنی بے خبری اور عدم شرکت پر بڑا قلق ہوا۔ ایک مزے کی بات بتاؤں؟ یہ بات بھی مجھے ابھی پتا چلی کہ پیارے ڈائجسٹ 80 روپے کے ہوگئے ہیں (شکریہ فوزیہ ثمر بٹ) میں تو معیز بھائی (ہاکر) کو ابھی تک پرانی قیمت کے حساب سے ہی تینوں ڈائجسٹ کے پیسے ادا کر رہی ہوں اور وہ بے چارے شریف آدمی خاموشی سے رکھ بھی لیتے تھے۔ اب آتے ہیں جون کے تبصرے کی طرف.....

شمارے میں سب سے پہلے مرکز نگاہ بننے والا ناول ''عمر یسرا'' ہے پہلی قسط سے ہی پسندیدگی کی مسند پر بیٹھا ہے۔ ''حسنہ حسین'' آپ لکھتی ہو کہ سحر کرتی ہو۔

''شام کی حویلی میں'' اب کافی زیادہ دلچسپ ہوگیا ہے۔ کشف تو انتہا درجے کی خود غرض لڑکی ہے۔ میر منصور کی طرح.....

''خزاں رسیدہ پتے'' اس موضوع پر ہم پہلے بھی بہت سی تحاریر پڑھ چکے ہیں مگر ایک تو لائٹ نہیں تھی پھر کرنے کو کوئی کام بھی نہیں تو اچھا ٹائم پاس ہوگیا اس ناول کے ساتھ سلسلہ ''خط آپ کے'' بہت دلچسپی سے پڑھا، ماشاء اللہ موسٹ فیورٹ سلسلہ بنتا جا رہا ہے یہ تو۔ کوثر خالد کیسی ہیں آپ؟ کافی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی؟ مکمل ناول ''تلافی'' نعیمہ ناز کا اچھا لگا عمیمہ کی سمجھ داری پسند آئی۔ عید قرباں قریب تر ہے۔ ہر طرف جانوروں کی بہار ہے اس سال تو قربانی عام آدمی کی پہنچ سے بھی دور ہے۔ ہمارے علاقے بہار کالونی میں 9 - 9 لاکھ کے جانور آئے ہوئے ہیں۔ قربانی کرنے کا جذبہ ہے یا کچھ اور 25 لاکھ تک کا جانور لوگوں کے گھروں کے سامنے کھڑا ہے وی آئی پی پروٹوکول ہیں۔ یہ دیکھ کر غریب کے بچے تو اپنے والدین سے ضد کریں گے نا کہ ہم کو بھی گائے یا بکرا لینا چاہیے قربانی کے لیے۔ میری درخواست ہے صاحب استطاعت لوگوں سے کہ بے شک قربانی کریں مگر دکھاوا مت کیجیے۔

''اس ماہ کی مسکراہٹیں'' اسود کو بہت پسند آئیں، اشعار پڑھے خالدہ جیلانی یاد آئیں بہت۔ ''دوپہری کے گیت'' سدرۃ المنتہیٰ کا ناول پڑھا مگر مجھے اینڈ میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ افسانوں کی طرف آئے تو دیکھا ایک سے بڑھ کر ایک لاجواب کہانی۔ مجھے افسانوں میں سب سے زیادہ ''ہم تم اور چاند''۔ ''انا'' اور ''ماں جایا'' پسند آئے۔ ''یار دلدار'' کی کمی بہت محسوس ہوئی۔

ج: پیاری ثمینہ! آپ کی آمد سے دلی مسرت ہوئی۔ ہم اور ہمارے قارئین سخت تشویش میں مبتلا تھے، پچھلے خط میں آپ نے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا تھا اس لیے بھی تشویش تھی۔

آپ سروے میں شامل نہ ہوسکیں اس کا ہمیں بھی افسوس ہے کیونکہ خاص موقعوں پر سروے میں آپ کا نام دیکھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ اگر سروے میں آپ کا نام نہ ہو تو کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور آپ اسی طرح ہماری محفل کو رونق بخشتی رہیں۔ آمین

خزاں رسیدہ پتے مصباح یونس نے لکھا تھا سہواً عابدہ یونس شائع ہوگیا۔

رضوانہ وقاص نے کہ لاں ہری پور سے

شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

آپ میرا خط شائع کرتی ہے اور نہ ہی کوئی شعر اور بھی جو کچھ لکھ کر بھیجوں۔ کیوں جی مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے۔ ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' وہ بھی لکھ کر بھیجا ہے۔ آپ جگہ ہی نہیں دے رہیں کیوں جی۔ ماڈل بہت ہی پسند آئی۔ جب سے میں بیمار ہوئی ہوں۔ میں نے جیولری پہننا چھوڑ دی ہے۔ تنگ ہوتی ہوں لیکن ماڈل کو دیکھ کر خوش ہوگئی جی۔ اب آتے ہیں پہلی شعاع کی طرف۔ بے روزگاری کا تو بہت ہی بڑا مسئلہ ہے۔ اوپر سے گرمی ہمارے گاؤں میں تو مہینہ ہوگیا کہ بجلی کا کام ہو رہا ہے۔ صبح سات بجے لائٹ بند ہوتی ہے۔ تو پہلے دو بجے چھوڑ دیتے تھے لیکن اب دیکھ دیکھ کر بندہ تنگ ہو جاتا ہے کہ کب بجلی آئے گی۔ اب پہلے جیسی عیدیں نہیں رہیں۔ جیسے جیسے بڑا ہونا شروع ہوئے۔ عید کا بھی مزہ نہیں رہا اب، بچوں

کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ان کی عیدیں اچھی گزریں۔ انجوائے کریں۔ (آمین)

''حمد و نعت'' دونوں ہی اچھی۔ ''پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں'' بہت ہی اچھی، یہ جو پیارے نبیؐ کی باتیں ہوتی ہیں ناں میں اپنے ابو کو پڑھ کر سناتی ہوں۔ وہ پڑھے ہوئے نہیں ہیں نا۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ م۔ ح آپ کی شادی کا احوال پڑھا۔ والدین کو ٹھیک ہے بچیوں کی شادی جلدی کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن بندہ سوچ سمجھ کر دیتا ہے رشتہ۔ چلیں جی شادی کی شروع کے دن آپ کے مشکل میں گزرے۔ اب اچھے ہو گئے۔ ''عید قربان اور آپ'' سب کے تبصرے پڑھ کر اچھا لگا۔ میں نے اس میں بھی لکھا تھا۔ لیکن مجھے اس میں بھی جگہ نہیں ملی۔ وہاج علی کا انٹرویو، پڑھ کر اچھا لگا مجھے یہ فنکار پسند ہے۔ اور ان کا ایک ہی ڈرامہ دیکھا ہے عہد وفا۔ انعمتہ نام مجھے بہت پسند ہے۔ چلیے نام کے معنیٰ کا بھی پتا چل گیا۔ شاہین آپا جو انٹرویو دینا پسند نہیں کرتیں ان کے انٹرویو نہ لیا کریں۔ چھوڑ دیں نخرہ کرنے والی کو۔ ''شام کی حویلی'' پڑھا پلیز اس کے صفحات بڑھائیں اب موحد کشف کو جدا نہیں کرنا۔ حیدر نے ثمینہ کو طلاق دے کر اچھا کیا۔ جان چھوڑ گئی حیدر کی، مجھے ایسی لڑکیاں سخت زہر لگتی ہیں۔ جو اپنا شوہر چھوڑ کر اپنی دوستوں کے شوہر کے پیچھے ہو جاتی ہیں۔

''خط آپ کے'' تسلی مسرت مبارک ہو آپ کو پوتا پوتی کی بہت بہت۔ اقراء سرور آپ کی بھانجی کا سن کر افسوس ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے بھانجی کو۔ میں سب کے خط پڑھتی ہوں لیکن افسوس مجھے میری کسی بہن دوست نے یاد نہیں کیا جی۔ کیا میں اتنی بری ہوں۔ کوئی مجھے یاد نہیں کرتا۔ معافیہ ارشد اس سے پہلے میں نے بھی یہی ریکویسٹ کی تھی کہ شعاع کے پہلے صفحے پر ماڈل میں کسی اور کی تصویر ہو۔ مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں شکر ہے میرے شوہر میرے ساتھ ہیں، وہی کتابیں لا کر دیتے ہیں اور خط بھی وہی پوسٹ کرتے ہیں۔ خط لکھنے کا مشورہ بھی انہوں نے ہی دیا کہ بیٹھے بیٹھے تنگ ہو جاتی ہوں۔ ''آئینہ خانہ'' مجھے پسند نہیں۔ مہندی کے ڈیزائن جی یہ بہت پرانے ہیں نئے ڈیزائن دیا کریں نا پلیز۔ آخر میں سب بہنوں، دوستوں سے دعا کی درخواست کہ اللہ پاک مجھے جلد از جلد ٹھیک کر دیں۔ اب بہت تنگ ہو گئی ہوں۔

ج: پیاری رضوانہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے خط شامل نہ ہو سکے۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ سب بہنوں کے خط شامل ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے لیٹ ملے ہوں یا ملے ہی نہ ہوں، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خطوط کے ڈھیر میں کچھ خط ہماری نظر سے چوک جاتے ہیں۔ ایک بار پھر معذرت۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ سے نوازے۔ قارئین بھی درخواست ہے کہ بہن رضوانہ کی صحت کے لیے دعا کریں۔

رضوانہ جی! آپ سے کس نے کہا کوئی آپ کو یاد نہیں کرتا۔ آپ بہت اچھی ہیں اور ہم آپ کو یاد بھی کرتے ہیں۔

صدف ناصر گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں

''پہلی شعاع'' میں حاضر ہو کر دل بے حد بوجھل ہو گیا۔ آپ لوڈ شیڈنگ کی بات کرتے ہیں بجلی کے بل ملاحظہ فرمائیں۔ لائٹ آتی نہیں اور جب آتی ہے تو جن جن گھروں میں سارا دن میں ایک پنکھا اور ایک لائٹ جلتی ہے وہاں پانچ ہزار سے کم بل نہیں آ رہے۔ اصل ''جنگوں'' کا مقام تو یہ ہے۔ ''پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں'' قربانی سے متعلق سیر حاصل معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ کم فہم لوگوں کے لیے بہترین سلسلہ ہے۔

''بیٹے کر سیکھ'' بالآخر ''آمنہ زریں'' کو ترس آ گیا ہم پر۔ ہر ہر لفظ باکمال لکھتی ہیں بالخصوص!

''کہنے کا فن جب کہانی کی صورت گری میں ظاہر ہوتا ہے تو پڑھنے والا اپنی حیرت کو لیے..... خوشی خوشی اس ونڈر لینڈ میں داخل ہو جاتا ہے۔ تھینکس آلاٹ آمنہ۔

''ناتا جوڑا'' م۔ ح بہن سوالات میں الجھے بغیر سب جواب دے گئیں۔ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دوسری بہن ح۔ ص کا ناتا بھی شاندار ماشاء اللہ۔ یہاں بات پھر گھوم پھر کر ''مقدر'' پر ہی آ جاتی ہے۔ والدین کے فیصلے اپنی جگہ مقدر بہر حال، اپنی جگہ۔

کے۔خوشی سے کھل اٹھے۔جزاک اللہ۔

شاہین رشید نے خوش کردیا۔وہاج علی سے ملاقات کروا کے مگر غصہ دلا دیا''لالچی''لوگوں کے مطالبات بتا کر۔ کیا بات ہے جی انٹرویو کے پندرہ ہزار۔تو''شاہین''آپ کیوں انٹرویو لینا چاہتی ہیں ان کے۔آپ ہماری ملاقات ہماری رائیٹرز سے اور ادارہ کے اسٹاف سے کروایا کریں پر ہماری سنتا کون ہے بھلا؟(افسوس)

''عمر سیرا''اردگرد سے بے نیاز ہوکر پڑھ رہے تھے کہ''باقی آیندہ''دیکھ کر مزا کرکرا ہوگیا۔مگر شعاع، خواتین پڑھتے سترہ، اٹھارہ سال ہوگئے پر آج تک وہ ''ناگزیر وجوہات''نہ جان پائے جن کی بنا پر''رائیٹرز'' قسط نہیں لکھ پاتیں۔شاید کبھی ہم جان پائیں۔''تلافی'' نعیمہ ناز سلطان لے کر آئی ہیں۔اس مرتبہ اداس اداس تحریر ہے نعیمہ کے انداز سے ہٹ کے۔اور بہرحال شاندار تحریر ہے۔

''دوپہری کے گیت''کوسوں میل سر کے اوپر سے گزر گئی۔ایسا بھی تو ہوسکتا تھا آپ''بقرعید''کے حوالے سے شاندار سا ناول دیتے۔اسی طرح''خزاں رسیدہ پتے''میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔رائیٹر شاید مصباح یونس ہیں عابدہ یونس غلطی سے لکھا گیا۔

''افسانے''ہماری اپنی کہانیاں ہمارے اپنے کردار!سبھی سچے ہوتے ہیں افسانے''کرپال سنگھ کی ڈائری''بہترین تحریر، بہترین تاریخ فیصل آباد کی۔مزا آ گیا اور کرپال سنگھ کے احساسات پر آنکھیں بھر آئیں۔ واقعی وطن تو ہمارے اندر بستا ہے ناں!نیاز محمد نے اچھا فیصلہ کیا روایتی ہٹ دھرمی چھوڑ دی۔

حمیرا شفیع ہم تم اور چاند کے ہمراہ تشریف لائی ہیں۔بہت اچھی تحریر مگر صرف''عیدالفطر''تک ہی ختم ہوگئی۔

''ماں جایا''پڑھ کر جب بہت روئے تو سوچا نہ ہی پڑھتے تو اچھا تھا۔بہت اچھی مگر بہت اداس تحریر۔

''قرۃ العین خرم''تحریر''انا''لے کر آئیں۔پراثر تحریر۔انا کا مارا انسان بھلا کب کسی کا ہوا ہے۔''پیغام عید''

ادا کیا کہ تحریر میں بکرے تو دکھائی دیے۔ورنہ پوری تحریروں میں ڈھونڈے سے بھی بکرے، قصائی، بکرا منڈیاں، گوشت وغیرہ کچھ بھی نہیں ملا۔مانا کہ''لاک ڈاؤن''اور''کرونا''سے ملکی حالات اور''عیدیں''متاثر ہوئی ہیں مگر لگتا ہے''تحریریں''کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی ہیں۔ماشاء اللہ سے تحریروں میں سب کچھ ہے بس اک عید کی کمی ہے۔

حیرت کے جھٹکے ہمیں تب لگتے ہیں جب قاری بہنیں اپنے پوتی، پوتیوں اور نواسے، نواسیوں کا ذکر کرتی ہیں۔میری طرف سے ایسی تمام بہنیں بے حد تعریف کی حق دار ہیں بھئی جواب بھی ماشاء اللہ سے نہ صرف ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔بلکہ بہترین تبصرے بھی باقاعدگی سے بھیجتی ہیں۔زوبیہ مظہر کی ممانی مصباح کا پیغام کہ جون جولائی میں''چھپا کے چھپی''جیسی تحریریں دیا کریں۔ہم بھی سو فیصد متفق ہیں مگر تمام گمشدہ رائیٹرز کے نام یہ شعر.....

ان کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا

فرزانہ کھرل، ثمرہ بخاری، فائزہ افتخار، سحرش خان بھٹو(گوری تجھ پہ ہنستا چاند)مریم عزیز سب واپس آجائیں۔

اور اس ماہ کی''شاکنگ''نیوز''مہندی کے ڈیزائن'' جی ہاں''شعاع''میں ہی حاضر خدمت ہیں۔بھلا یہ معجزہ کیونکر ہوا؟(ہاہاہا)آج سے دس پندرہ سال پیچھے جائیں تو''عید نمبر''میں لازمی مہندی کے ڈیزائن ہوتے تھے شمارے میں۔اب کافی عرصہ بعد جا کے آپ کو''خوب صورت ماضی''یاد آیا۔شکریہ بہت بہت۔

مجموعی طور پر''شعاع''بہت اچھا رہا۔ماسوائے دو عدد ناولز کے۔ادارہ اور رائیٹرز سے دلی التماس ہے کہ ہلکی پھلکی کہانیاں زیادہ سے زیادہ شامل اشاعت فرمائیں۔ کیونکہ''حوادث زمانہ''سے تنگ ہماری اولین اور واحد خوشی اور سکون ہمارے ڈائجسٹ ہی ہیں۔

ج:پیاری صدف!آپ سے ہمیشہ بہت اچھے

مایوس نہیں کیا، ہمیشہ ہی بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ بہت شکریہ، آپ کا خیال درست ہے، خزاں رسیدہ پتے مصباح یونس نے ہی لکھا تھا، سہواً عابدہ یونس کا نام شائع ہو گیا۔

اسلام آباد سے فرحانہ مہناز شریک محفل ہیں

فل گرمی میں اپنا عید سروے بھیجا شعاع میں نہ پا کر مایوسی ہوئی (ایک کہانی شعاع اور دو خواتین میں بھیجی تھیں۔ خواتین ادارہ نے زیر غور کہا پلیز آپ بھی بتائیں۔ کہانی کا نام تھا تقدیروں کے فیصلے)

''عریسرا'' بہت ہی پاور فل ناول ہے حسنہ حسین اچھا لکھ رہی ہیں۔ نعیمہ ناز ''تلافی'' نعیمہ ناز جی کیا بات ہے اس دفعہ عید کی تیاریوں میں شاید آپ ناول پر گرفت اچھی نہیں رکھ سکیں۔ بس مناسب تھا۔ ''دوپہری کے گیت'' سدرہ جی آپ کی فرحانہ کافی اسٹیٹ فارورڈ اور کانفیڈنٹ تھی جبکہ ہم تو اپنی بات فراز صاحب کو بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتے۔ خزاں رسیدہ پتے اچھی اسٹوری تھی۔ لیکن برہان کا کردار پاور فل نہیں تھا۔ ویسے ریحانہ جی آپ کہاں غائب ہیں اور صائمہ گل بھی باقی سارے افسانے اچھے لگے سب نے بہت اچھا لکھا خاص کر فرح بخاری ''کرپال سنگھ کی ڈائری'' میں لائل پور کی سیر کرائی۔ جو ہم نے پہلے بھی بہت کی ہوئی ہے لیکن آپ کو پڑھتے ہوئے مزہ آیا۔

جب مجھ سے ناتا جوڑا، بہن م۔ ح آپ کے حوصلے کو سلام۔ ''عید قرباں اور ہم'' سب نے بہت اچھا لکھا خاص کر اقصیٰ ماہ نور نے دلچسپ لکھا۔ مہندی کے ڈیزائن بہت پسند آئے۔ آخر میں آپی جی جہاں اتنی مہنگائی ہے وہاں دس روپے بڑھانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم تو اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ لیکن ہمارے پوسٹ آفس والوں نے ٹکٹ زیادہ مہنگی کر دی ہے اور کبھی کبھی تو چائے کا خرچا بھی لے لیتے ہیں ہم سے۔ لیکن شعاع کی محبت میں برا نہیں لگتا۔

ج: پیاری فرحانہ! آپ نے تین کہانیوں کا لکھا ہے جس کے بارے میں ہم نے ''قابل غور'' لکھا تھا۔ ہم نے اسٹاف سے کہا ہے کہ آپ کی کہانیاں تلاش کریں۔

یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ آپ نے سروے کے جوابات بھیجے جو شائع نہ ہو سکے۔ آئندہ خیال رکھیں گے کہ آپ کے خط اور دیگر تحریریں ضرور شامل ہوں۔

ٹکٹ ہی کیا ہر چیز کی قیمت میں دو سو گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس حکومت کا بس چلے تو سانس لینے کی بھی قیمت وصول کرے۔

معافیہ شہباز ڈسکہ ضلع سیالکوٹ سے لکھتی ہیں

جون کا شمارہ اتنی بڑی خوش خبری لایا کسی کے توسط سے پتا چلا کہ خط شائع ہوا مگر کرن میں، یہ سن کر فوراً نیوز پیپر والے سے کہا کرن لیتا آئے۔ آج بارہ بج کے نہیں دے رہے۔ خدا خدا کر کے شمارہ آیا تو چھلانگ خطوط پہ لگائی اور پھسل گئے کیونکہ خط ندارد تھا پھر شوہر نے کہا شعاع دیکھ لو جو پہلے ہی مل چکا تھا اور ابھی خط پڑھے نہیں تھے پھر کیا شعاع کے خطوط کے بیچوں بیچ شہباز کی اہلیہ کا نام غلط جگمگا رہا تھا، میرا صحیح نام معافیہ ہے۔ خط کی خوشی اتنی کہ پورے اسٹاف کو بتایا، مبارک باد وصول کی اور اب بہن سعدیہ آنے والی ہے اسے دکھاؤں گی۔ بتایا تو ہے کیونکہ شعاع واحد چیز تھی جو کہ ہم گھنٹوں، ڈسکس کرتے تھے۔ شعاع سے اور بہت کچھ سیکھا ہے لیکن کبھی غصہ آیا ہو اور مظلوم ہیروئن کو پڑھیں تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور شوہر کی خدمت۔ شعاع میں کتنے رائٹرز آئے اور چلے گئے مگر یہ قدیم جسم کی طرح نئے خون کو شامل کرتا رہتا ہے، اسی لیے زندہ اور تازہ ہے اللہ اسے ایسے ہی کامیاب کرتا رہے اب میری بیٹی بانی مجید صاحب کا پھول پڑھتی ہے اور میں خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ اگلی دفعہ اپنے اسکول کا۔ گاؤں کے ایک اسکول کا جس کے اسٹوڈنٹ بہت سی جگہوں پہ ملک کا فرض چکا رہے ہیں تعارف بھیجوں گی تاکہ لوگ جان سکیں اب گاؤں بھی ملکی ترقی میں رکاوٹ نہیں بلکہ ملکی ترقی کا حصہ ہیں۔ گاؤں سے خط پہنچانا بہت مشکل ہے۔

قدر دان ہے۔ ابو کے گھر کوئی میڈیا کی خاص سہولت نہیں تھی سوائے ڈائجسٹ اور میگزین یا کتاب کے۔ دستک اور آئینہ خانے میں بہت کم پڑھتی ہوں۔ قد آور شخصیات کے انٹرویوز۔ راحت جبیں اور فرحت کے ہیرو اور منظر نگاری سعدیہ عزیز آفریدی کا رومانس نبیلہ ابر کی سچائی، عمارہ کا دینی رجحان۔

اب تو سب امی کے گھر کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ چھٹی دوپہروں میں لوڈشیڈنگ سردیوں کی طویل راتوں میں کہاں اس کا ساتھ نہیں تھا ایک دفعہ 2005ء کی بات ہے شاید، سعدیہ عزیز کی کہانی ''سبز رتوں کے گلاب'' پڑھتے انڈہ اور چائے بناتے چائے میں مرچیں ڈال دیں اور پھر امی سے جو خاطر ہوئی مت پوچھیے۔

ج: پیاری معافیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا نام غلط شائع ہو گیا۔ اکثر بہنوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ ان کے نام درست شائع نہیں ہوتے، اس میں کسی حد تک ہماری بہنیں بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ اپنا نام صاف نہیں لکھتیں، ہم ناموں میں املا کی تصحیح نہیں کرتے جیسے نام لکھے ہوتے ہیں اسی طرح شائع کر دیتے ہیں۔ اب اسی خط میں آپ نے اپنا نام معافیہ شہباز لکھا ہے۔ اگر آگے خط میں آپ شہباز نہ لکھتیں تو ہم شہبار ہی شائع کرتے۔

اقصیٰ ماہ نور ہراج اور طیبہ عروج ہراج نے دادووالا تلمبہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

نامے میرے نام میں اپنا خط ڈھونڈا جو کہ جلدی سے مل گیا اور ماتھا ٹھنکا۔ ارے یہ کیا آپ نے ہم دونوں بہنوں کے نام چار بنا دیے ہیں۔ پورے نام یہی ہیں۔ یعنی کہ الفت زہرہ ہراج (بڑی سسٹر) اقصیٰ ماہ نور ہراج (مابدولت) خط ہم اکٹھا لکھتی ہیں، سب سے پہلے اپنا من پسند ناول عمر یسرا پڑھا۔ واہ لکھنے کا دل کش انداز۔ بے حد متاثر کن اور ایمان افروز کہانی۔ الفاظ نہیں ملتے ''عمر یسرا'' کی تعریف کے لیے حسنہ حسین جی۔ مکمل ناول میں خیمہ نار کا تلاش پسند آیا۔ سدرۃ آپی کا ناول بھی زبردست تھا۔ افسانوں میں مونا شاہ قریشی کا پیام عید مزاح سے بھرپور تھا۔ پسند آیا۔ انٹرویو سب اچھے لگے۔ غزلوں میں خمار بارہ بنکوی کی غزل دل کو بھائی۔ باتوں سے خوشبو آئے میں سب سے اچھی بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ لگی۔ کھلتا کسی پہ میں زرینہ خانم کا شعر واہ واہ کے قابل لگا۔ نامے میرے نام میں اقراء سرور، مدیحہ پتافی اور الفت زہرہ ہراج کے خط قابل داد لگے۔ (الفت زہرہ جی زیادہ غصہ نہ کیا کرو) اعتذار میں نور القلوب کی قسط نہ لکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کمی بہت محسوس ہوئی تنزیلہ کی۔ تاریخ کے جھروکے میں فرزانہ کا حجاج والا واقعہ بیسٹ تھا۔ موسم کے پکوان پر ایک نظر ماری اور مہندی کے ڈیزائن پر نظر ٹھہر گئی۔ سب ڈیزائن بہترین۔ دل خوش ہو گیا۔

ج: اقصیٰ اور طیبہ! ہم نے اس بار آپ کو چار نہیں دو ہی بہنیں لکھا ہے اچھا ہوا آپ نے وضاحت کر دی۔ نام غلط شائع ہو تو خط شائع ہونے کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔

الفت زہرہ ہراج، عائشہ اللہ یار ہراج
داؤدوالا، تلمبہ سے شریک محفل ہیں

میری عادت ہے شعاع کو ایک ہی نشست میں پڑھنے کی ایک ہی دفعہ سارا شعاع تسلی سے پڑھتی ہوں۔ میری پڑھنے کی۔ رفتار بہت تیز ہے سارا شعاع پڑھ کر ہی اٹھتی ہوں انٹرویو میں وہاج علی سے ملاقات سو سو رہی اس کے بعد جب تجھ سے ناتا جوڑا سلسلہ پڑھا۔ واقعی اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں جیسے ہر سسرال برا نہیں ہوتا کسی جگہ سسرالی رشتہ دار بہت مہربان ہوتے۔ جیسے میری والدہ مرحومہ کا سسرال انتہائی مخلص تھا میری دادی جان میری امی پہ جان دیتی تھیں اور پھوپھو، چچا اور دادا سب ہی مہربان اور مل جل کر رہے۔ مجھے خود اس لیے جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے۔ انسان دکھ سکھ میں ساتھ ہوتا ہے اور بچے بھی دادی، دادا، چچا، پھوپھو کے لاڈ انجوائے کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنا فیورٹ ناول شام کی حویلی پڑھا۔ زینب

آئی بہت معصوم ہیں۔ مکینہ نعیم نے اپنے لیے کی سزا پائی، اس کے بعد عسر یسرا پڑھا شکر ہے جنہ مل گئی اب تو فارس سکون سے سوئے گا ناں، تین مکمل ناول دیکھ کر آنکھیں چمک اٹھیں۔ واؤ نعیمہ ناز کا تلافی بہت سبق آموز تھا۔ عمیمہ نے شیراز کو چن لیا ٹھیک کیا۔ عابدہ یونس کا نام ''خزاں رسیدہ پتے'' ناول پہ لکھا تھا، فہرست پے مصباح یونس تھا۔ یہ ضرور بتایئے گا کہ اصل نام کیا ہے۔ ناول شاندار تھا اور سدرۃ المنتہیٰ ''دوپہری کے گیت صحرائی'' کہانی اچھی لگی۔ خط آپ کے میں سب بہنوں کے خط اور آپ کے جوابات پسند آئے۔

ج: پیاری الفت اور عائشہ! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اچھے بھی، برے بھی۔ یہ دنیا اچھے لوگوں کے دم سے ہی چل رہی ہے۔ جن گھروں میں آپس میں میل ملاپ اور محبت ہوتی ہے۔ ان ہی گھروں میں رونق اور برکت ہوتی ہے۔

ناول خزاں رسیدے پتے مصباح یونس نے لکھا تھا۔

شعاع آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔

گلشن شفیع گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں

29 جون کو شعاع ملا۔ سب سے پہلے پہلی شعاع میں آپ نے سچ کہا۔ پورا ملک گرمی سے بے حال ہے اللہ رحم کرے۔ تنویر پھول کی پھول جیسی حمد دل میں اتر گئی۔ پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں قربانی کے بارے میں احکامات سے ذہن و دل کو روشن کیا۔ آمنہ زریں کی کھڑکی میں جھانکا اچھا لگا۔ ویسے آمنہ لکھتی کیوں نہیں ہیں۔ مطلب افسانے ناول وغیرہ۔ ''عید قرباں اور آپ'' میں سب بہنوں کی حاضری زبردست تھی۔ ارم کمال کا بادامی قورمہ پسند آیا۔ وہاج علی میرے بھائی وقار کے جیسی شکل، عہد وفا میں اچھا کام کیا۔ ''شام کی حویلی'' ایبٹ آباد زبردست نظارے شکر ہے میں نے بھی ایبٹ آباد دیکھا ہے اور شکر کہ کشف بھی کچھ نرم ہوئی۔ حسنہ حسین کہاں کی رہنے والی ہیں؟ اللہ نے آخرکار جنت کے پاؤں کے نیچے جنت رکھ دی بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نعیمہ ناز نے تلافی میں بہت اچھا سبق دیا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے دوپہری کے گیت میں نے دوپہر میں ہی سنے بہت اچھے لگے ماشاء اللہ زور قلم اور زیادہ۔ ''خزاں رسیدہ پتے'' اچھی کوشش تھی۔ افسانوں میں نمبرون ''ماں جایا'' وردہ بخاری مبارک ہو، اللہ سب بھائیوں کو ایسے ہی آنکھیں کھلی رکھنے کی توفیق دے۔ کرپال سنگھ کی ڈائری فرح بخاری نے اچھا لکھا۔ فیصل آباد میرا ننھیال ہے، آٹھ بازار خوب گھومے ہیں۔ خمار بارہ بنکوی کی غزل سیدھی ٹھاہ کر کے لگی دل میں۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں میں ورزش کے اثرات ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ باتوں سے خوشبو آئے، اسم اعظم سے زبردست خوشبو آئی۔ کھلتا کسی پہ کیوں فضہ بلال بازی لے گئیں۔ خط آپ کے اقرا کالی کوٹھری کے بعد بھی کچھ لکھونا۔ اللہ تمہیں خوشیاں دے۔ فوزیہ ثمر بٹ میری ہمسائی ہیں۔ مطلب میں گوجرانوالہ وہ گجرات۔ فوزیہ کیسی ہو؟ ہر وقت غصے میں کیوں رہتی ہو، بتانا ضرور۔ تاریخ کے جھروکے تاجر کی عیاری اچھا تو یہ بنیادی وجہ تھی انگریز کی برصغیر پر قابض ہونے کی۔ یہ سارا فساد شاہ جہاں سے شروع ہوا۔ موسم کے پکوان میرے میاں اچھے کھانے کے بے حد شوقین ہیں۔ خالدہ جیلانی کی بدولت میں نے شعاع سے بہت سے پکوان سیکھے۔

☆ پیاری گلشن! یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کے سوالات کے جواب حاضر ہیں۔

1۔ عمیرہ احمد اور صائمہ اکرم کے بچے نہیں ہیں۔

2۔ فرح بخاری بھکر میں اور حسنہ حسین سعودی عرب میں رہتی ہیں۔

3۔ نیلوفر عباسی کی کتاب آپ کو لاہور سے مل سکتی ہے۔

4۔ نگہت سیما اور فرحت اشتیاق شادی شدہ نہیں ہیں۔

5۔ عنیزہ سید ڈسکہ چھوڑ کر لاہور شفٹ ہو گئی ہیں۔ وہ ہاؤس وائف ہیں۔

☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/80 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کر سکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/960 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030" کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ارمینا رانا خان

ارمینا رانا ایک عالمی شہرت یافتہ اداکارہ ہیں بہت زیادہ کام نہیں کیا مگر اپنی انفرادی شخصیت اور چند مقبول سیریلز اور ماڈلنگ کی وجہ سے شہرت پائی۔ آج کل نئے آنے والے فنکار سیدھے منہ بات نہیں کرتے تو ان سے کیا توقع..... مگر میسج پر دو چار سوالوں کے جواب مل ہی گئے۔ باقی ان کے بارے میں جو کچھ جاننا چاہتے ہیں، اس کے لیے ''گوگل'' کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

ارمینا رانا 30 مارچ 1987 میں کینیڈا میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم کینیڈا سے ہی حاصل کی۔ البتہ بی اے کی ڈگری برطانیہ کے شہر مانچسٹر سے حاصل کی..... اور اسی شہر سے ماڈلنگ کا آغاز کیا۔ ارمینا رانا خان کے بارے میں ہم آپ کو بتائیں کہ ان کی اصل وجہ شہرت ملکی اور غیر ملکی فیشن شوز کے لیے کی گئی ماڈلنگ ہے۔

''کیا حال ہیں؟''

اللہ کا شکر ہے۔

فلمی کیریئر کا آغاز کب ہوا؟

میرے فلمی سفر کا آغاز ''دبئی'' سے ہوا۔ کمرشلز کی وجہ سے پاکستان میں بھی شہرت ہوئی اور دیگر ممالک میں۔ اس شہرت کی بنا پر 2011ء میں ''عابس رضا'' اور انجم شہزاد نے رابطہ کیا۔ ایک سٹ کام کے لیے مجھے بک کیا اور اس کی تمام تر ریکارڈنگ ''دبئی'' میں ہوئی۔ اس سٹ کام میں میں نے انڈیا کی معروف فنکارہ فریدہ جلال اور پاکستان کے سینئر فنکار طلعت حسین کے ساتھ کام کیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ دیگر فنکاروں میں ''عامر قریشی''، ''عائشہ گل''، ''ایاز احمد'' اور ''جاناں ملک'' شامل تھیں۔ ان سب فنکاروں کے ساتھ اور خاص طور پر سینئر فنکاروں کے ساتھ کام کر کے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

''گزشتہ دنوں آپ کا سیریل ''محبتیں چاہتیں'' بہت مقبول ہوا۔ اس میں آپ کا منفی یعنی نیگیٹو رول تھا۔ تو کیوں کیا آپ نے نیگیٹو رول؟''

''بس ایسے ہی..... پوزیٹو رول تو بہت کر لیے تھے تو دل چاہا کہ نیگیٹو بھی کر کے دیکھوں..... بہت مزے کا کردار تھا اور مجھے کر کے بہت مزا آیا۔ میں نے یہ رول لیتے وقت یہ بھی سوچا کہ دیکھوں تو سہی لوگوں کا کیا ردعمل آتا ہے۔ پسند کرتے ہیں یا ناپسند۔''

''پھر کیا رسپانس ملا؟''

''ہاہاہا..... سچ بتاؤں ..... ملا جلا رجحان تھا۔ ویسے میری پرفارمنس کو سب نے ہی بہت پسند کیا۔ اور میں نے بھی بہت محنت کی..... اپنے آپ کو جتنا نیگیٹو کر سکتی تھی میں نے کیا۔''

''ایک فنکار کو کس طرح کے کردار کرنے چاہئیں؟''

''ایسے جس میں اس کی شخصیت نظر نہ آئے۔ بالکل مختلف جیسے ''محبتیں چاہتیں۔'' کا کردار تھا۔ یہ کردار آفر ہوا تو مجھے لگا کہ اس کو کر کے مزا آئے گا۔ کیونکہ اس کردار کے کئی شیڈز تھے۔''

''اتنے گیپ سے کیوں آتی ہیں؟''

''جب پاکستان آتی ہوں اور کوئی کردار آفر ہوتا ہے تو کر لیتی ہوں۔ ورنہ مجھے کوئی ایسا کردار آفر

''کبھی انکار کی نوبت آئی؟''

''یہ انکار ہی تو ہے کہ بقول آپ کے گیپ آرہا ہے..... بہت سے رول ایسے ہوتے ہیں جن میں کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ محض اپنے آپ کو ضائع کرنے والی بات ہے۔ اس لیے پھر انکار ہی کی گنجائش بنتی ہے۔ اگرچہ ہمیں کہا جاتا ہے کہ آپ لیڈ رول ہو یا سیکنڈ لیڈ رول ہو۔ لیکن جب کردار پڑھو تو اس کے اندر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کہ بس آیا۔ کھڑا ہوا۔ دو چار ڈائیلاگ بولے اور چلا گیا تو ایسے کردار کرنے سے میں انکار کر دیتا ہوں۔ میرا ماننا یہ ہے کہ بھلے بندہ کم کام کرے مگر اچھا اور معیاری کرے۔''

''فیوچر میں اداکاری ہی ہوگی یا کچھ اور بھی؟''

''کس کا قول ہے کہ اپنے فیوچر پلان کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤ..... تو بس اس لیے میں بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ بتاؤں۔''

''آج کل والدین بچوں کے ہاتھ میں موبائل فون دے کر کھانا بھی کھلا رہے ہوتے ہیں اور اپنی جان بھی چھڑا رہے ہوتے ہیں۔ کیا اچھا رجحان ہے؟''

''بالکل بھی اچھا رجحان نہیں ہے اور میں تو اس کے ہی خلاف ہوں۔ بچوں کے ہاتھ میں موبائل انہیں ایجوکیٹ کرنے کے لیے دیا جائے بس..... مگر واقعی والدین اس بات کو سمجھتے نہیں ہیں۔''

''کھانے میں کون سا کھانا اہتمام کے ساتھ کھاتے ہیں۔ یہ ذرا فیلڈ سے ہٹ کر سوال ہے؟''

''ہاہاہا..... اور ہے بھی مزے دار سوال۔ تمام کھانوں میں میرا پسندیدہ کھانا دال چاول ہے۔ اس کے ساتھ ٹماٹر کی چٹنی اور پاپڑ ضرور ہونے چاہئیں۔ اس علاوہ پھر مجھے ''اسٹیک'' بہت پسند ہیں۔''

''لڑکیاں تو آئینے کو بہت وقت دیتی ہیں۔ اور آپ؟''

''میں بھی آئینے کو کافی وقت دیتا ہوں۔ کیونکہ ہمارا تو کام ہی ایسا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آئینہ

دیکھنا پڑتا ہے اور جب شوٹنگ ہوتی اور گھر پر ہی ہوتا ہوں تو پھر بے چارا آئینہ ہمیں دیکھنے کو ترستا ہوگا۔ ہاہاہا۔''

ٹی وی شوز پسند ہیں یا ٹی وی ٹاک شو..... اور جو ان پروگراموں کو کرتے ہیں، ان میں کون پسند ہے؟

''ٹی وی ٹاک شو میں دیکھتا نہیں۔ اس لیے ان پروگراموں میں جو بنکر آتے ہیں، ان کے بارے میں بھی میں نہیں جانتا۔ البتہ ٹی وی شوز بھی کبھار دیکھ لیتا ہوں۔ اور ان میں مجھے فہد مصطفیٰ پسند ہیں..... اچھا شو کرتے ہیں وہ۔''

''شو کرنے کو ملے تو؟''

''ہاں..... کیوں نہیں ضرور کروں گا۔''

''شوبز کے علاوہ آپ کی مصروفیات؟''

''کوئی خاص نہیں..... بس کاروں کی ڈیلنگ کا کام کرتا ہوں، سمجھ لیں کہ یہ میرا سائیڈ بزنس ہے۔''

روئیدعالم

''کیا حال ہیں؟''

''جی اللہ کا شکر ہے۔''

''کیا مصروفیات ہیں؟''

''بس ٹی وی کی ہی مصروفیات ہیں اور تو کچھ

خاص نہیں ہیں۔"

"اسکرین پر نظر نہیں آرہے آج کل؟"

"ایسا نہیں ہے کہ میں بالکل غائب ہوں۔ کچھ چیزیں آن ایئر ہیں مختلف چینلز سے۔ کچھ ریپٹ میں چل رہی ہیں۔ تو اسکرین سے غائب نہیں ہوں۔ اور پھر میں نے خود بھی تھوڑا گیپ دیا تھا۔"

"دیا تھا؟ مطلب اب نہیں..... گیپ کیوں دیا تھا؟"

"اس لیے کہ کچھ چیزیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اس لیے گیپ دیا۔ لیکن ایک کام میرا آنے والا ہے جو بہت اچھا ہے اور آپ لوگ دیکھیں گے تو پسند کریں گے۔ کچھ پروجیکٹس ہاتھ میں ہیں، ان کو پڑھ رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں..... بس فیصلہ کرنا باقی ہے۔"

"رولز کے لیے کوئی خاص ڈیمانڈز ہوتی ہیں آپ کی؟"

"جی بالکل مجھے وہ ہی رولز پسند ہیں جو چیلنجنگ ہوں جن کو کرنے میں مزا آیا۔ "جو تو چاہے" میں میرا کردار بہترین تھا۔ ناظرین نے پسند بھی کیا تھا۔ تو بس ایسے ہی چیلنجنگ رولز کی ڈیمانڈ ہوتی ہے اور پھر یہ کہ جو بھی رول ہو، اس پر ورک کروں۔ ریسرچ کروں اور پھر اسے لے کر لوگوں کے سامنے پرفارم کرے اور لوگ "واہ" کریں۔"

"کوئی ایسا کردار کیا جو اب تک کیے گئے تمام کرداروں پر بھاری ہو؟"

"اگر آپ کا مطلب ہے کہ کوئی ایسا جو ناقابل فراموش ہو تو ابھی تک ایسا رول نہیں ہے اور ایسا رول کرنا تو گویا اداکاری کا اینڈ، مطمئن ہونے والی بات نہیں ہو اکہ جس کے لیے میں سوچوں کہ مجھے پاکستان جانا چاہیے۔"

"آئندہ بھی نیگیٹو رول کریں گی؟"

"اگر اچھا رول ملا تو ضرور کروں گی۔ ورنہ عام رول کر کے اپنے آپ کو ضائع کرنے والی بات ہے۔ کردار وہ ہو جو خود کے دل کو بھی اچھا لگے۔"

"انگلینڈ میں کیا مصروفیات ہیں؟"

"میں اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانے میں مصروف ہوں۔ اور اپنے پروڈکشن ہاؤس کے ذریعے میں نئے ٹیلنٹ کو متعارف کراؤں گی۔ مجھے ہمیشہ سے ہی کچھ یونیک قسم کا کام کرنے کی عادت ہے۔ اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا بھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

خواتین اور دوشیزاؤں کے لیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اگست 2021

کے شمارے کی ایک جھلک

- فرزانہ کھرل کا ناول وہ میرے کیسری پھول
- قرۃ العین ہاشمی کا مکمل ناول ''درنایاب''
- جبیں چیمہ کا ناولٹ ''تقدیر بدلتی ہے''
- عندلیب زہرا، ریحانہ چوہدری، شازیہ الطاف ہاشمی
- عنبرین ابدال اور ملیحہ صدیقی کے افسانے
- راحت جبیں اور عفت سحر کے ناول
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ نازیہ رزاق سے ملاقات
- اداکارہ طوبیٰ صدیقی سے باتیں
- باصلاحیت فنکار جنید اختر سے باتیں
- ''کرن کرن روشنی'' احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اگست 2021 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

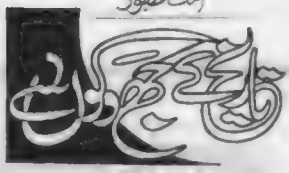

حوصلہ

جب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا تو دربار دہلی کی طرف سے ان دنوں میر منور گورنر مقرر تھا۔ اس بے چارے نے پہلے تو دہلی میں امداد کے لیے بہت سی عرضیاں بھیجیں لیکن جب کوئی بھی جواب نہ آیا تو ناچار اپنی ہی مٹھی بھر فوج سے احمد شاہ کا مقابلہ کیا مگر احمد شاہ نے میر صاحب کو شکست دے کر شالا مار باغ میں آ مقام کیا۔ اب ان کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ناچار خود ملنے گئے۔ احمد شاہ ان کی بہادری اور جرات دیکھ چکا تھا۔ عزت کے ساتھ بٹھا کر پوچھا۔

احمد شاہ: میر صاحب! آپ نے لڑائی سے پہلے ہی اطاعت کیوں نہ قبول کی؟

میر منور: صرف اس لیے کہ جو میرا آقا ہے اس کی مرضی کے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

احمد شاہ: پھر آپ کے مالک نے آپ کی امداد کیوں نہ فرمائی؟

میر منور: اس نے خیال کیا ہوگا کہ امداد کے بغیر بھی میں آپ سے بخوبی نبٹ لوں گا۔

احمد شاہ: اچھا اگر آپ فتح پاتے تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟

میر منور: میں آپ کو لوہے کی ایک بند گاڑی میں بٹھا کر دہلی بھیج دیتا۔ وہاں بادشاہ سلامت آپ کی بابت جو چاہتے خود حکم دیتے۔

احمد شاہ: اچھا اب کہ خدا نے مجھے فتح مند کیا ہے مجھے آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟

میر منور: اگر آپ قصائی ہیں تو قتل کر دیجیے۔ ڈاکو ہیں تو لوٹ لیجیے۔ سوداگر ہیں تو جرمانہ کر دیجیے۔ بادشاہ ہیں تو معاف فرما دیجیے۔

میر صاحب کی راست بازی اور حاضر جوابی سے احمد شاہ اتنا خوش ہوا کہ سوا لاکھ کا خلعت دے کر اپنی طرف سے بھی انہی کو بدستور پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا اور کچھ سالانہ خراج پر صلح کر لی۔ واقعی حوصلہ اور صداقت بڑی چیز ہے۔

حسن طلب

روم کا شہنشاہ کیٹو اپنے پڑوسی ملک پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر مجلس شوریٰ ..... اسے جنگ کی اجازت دینے پر رضامند نہیں تھی۔ مجلس کو راضی کرنے کے لیے جب اس کے تمام زبانی حربے بے سود ہوئے تو اس نے تین خوش رنگ ناشپاتیاں ایک تھیلے سے نکال کر مجلس کے سامنے رکھ دیں۔ ارکان نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''یہ ناشپاتیاں کس ملک میں پیدا ہوتی ہیں؟''

شہنشاہ نے جواب دیا۔ ''کارتھیج میں جو یہاں سے صرف تین دن کی مسافت پر ہے۔'' یہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور مجلس شوریٰ نے جنگ کی اجازت دے دی۔

شبانہ چوہدری۔ حافظ آباد

چار مہینے اور چار دن کی بادشاہی

وہ جو کہتے ہیں۔ ''چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے یہ مثل بہادر شاہ پر بالکل صادق آئی۔ 11 مئی 1857ء کو دلی انگریزوں کے قبضے سے نکلی اور بہادر شاہ کے قبضے میں آئی 14 ستمبر 1857ء کو پھر بہادر شاہ سے چھن کر انگریزوں کے قبضے میں آ گئی۔

وسیمہ اشرف، صائمہ اشرف، ایبٹ آباد

روشن مثال لوگ

سلطان شہاب الدین غوری جیسے عظیم اور بے باک شخص ہماری تاریخ کے زندہ اوراق ہیں۔ یہ عظیم الشان شخصیت جب راجپوتوں سے لڑائی میں کچھ افراد

کے مقابلے سے منہ موڑنے اور میدان جنگ سے بھاگنے کی وجہ سے شکست سے دوچار ہوئی تو محمد غوری کو اسلام کی اس بیٹی پر بہت دکھ پہنچا۔

اس نے قسم کھائی کہ جب تک میں اپنی ہزیمت کو نصرت میں تبدیل نہیں کروں گا۔ نہ پلنگ پر سوؤں گا۔ نہ لباس فاخرہ کو ہاتھ لگاؤں گا۔ نہ گوشت اور نہ ہی کوئی شاہی طعام چکھوں گا۔

پورے ایک سال کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے اسے فتح سے ہمکنار کیا تو اس نے اپنی فوج کے سامنے جنگی لباس اتارا۔ فوج یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا تن ایک خون آلود اور بوسیدہ لباس سے ڈھکا ہوا ہے۔

محمد غوری نے انہیں بتایا۔ ''یہ وہ لباس ہے جسے میں نے گزشتہ جنگ میں پہن رکھا تھا اور آج تک مسلسل وہ لباس پہنے ہوئے ہوں۔ میں جب بھی لباس پر نظر ڈالتا تو اپنی ہزیمت کی یاد تازہ کرتا اور انتقام کے انگاروں پر لوٹ جاتا اور آج اللہ تعالیٰ کے بے پایاں شکر کے ساتھ اپنا یہ پرانا لباس اتارتا ہوں۔''

چاند سلطان عروج۔ کراچی

سخاوت

سلطان نورالدین ایوبی کا اونٹ گم ہوگیا۔ اس نے منادی کرائی۔ ''جو شخص اونٹ کو ڈھونڈ لائے گا اسے انعام بھی دوں گا اور وہ اونٹ بھی۔''

کسی نے پوچھا کہ اس کا فائدہ، سلطان نے جواب دیا۔ میرا پہلا مقصد وہ لذت حاصل کرنا ہے جو گمشدہ چیز کو پانے سے ملتی ہے۔ دوسرا بخشنے کی لذت اور تیسرا ڈھونڈنے والے کو اجرت۔

(حنا کلیم۔ فیصل آباد)

مقام

خلیفہ متوکل نے درباریوں سے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے۔ مسلمان عثمانؓ سے کیوں ناراض ہو گئے تھے؟'' حاضرین نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ تو خلیفہ نے ان اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس ناراضگی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جب صدیق اکبرؓ خلیفہ ہوئے تو وہ میز پر حضور کے مقام سے ایک سیڑھی نیچے کھڑے ہوئے۔ پھر عمرؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ سے نیچے کھڑے ہوئے۔ مگر عثمانؓ خلیفہ ہوتے ہی منبر کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ مسلمان ان کے طرز عمل کو برداشت نہ کر سکے۔'' حاضرین نے خلیفہ متوکل کی اس نکتہ طرازی کی بہت تعریف کی۔ مگر عباد نامی ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ اور ادب سے بولا۔ ''امیر المومنین'' آپ پر عثمانؓ کا بہت احسان ہے۔ اگر وہ منبر پر خطبہ نہ دیتے تو حضرت عمرؓ کے مقام سے نیچے کھڑے ہوتے۔ یہ سلسلہ بعد میں آنے والے خلفاء تک جاری رہتا۔ تو آج آپ کو ''جلولہ'' کے کنویں میں اتر کر خطبہ دینا پڑتا۔'' اس حاضر جوابی پر درباریوں کے ساتھ خلیفہ بھی ہنسنے لگا۔ ''جلولہ'' ایک مقام ہے۔ جہاں ایک بہت گہرا کنواں مشہور تھا۔

(شبنم رومی۔ حافظ آباد)

موسیقی کی قبر

تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے موسیقی کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

تخت نشینی کے گیارہویں برس اورنگ زیب عالمگیر نے شاہی دربار کے تمام موسیقاروں کو برخاست کر دیا۔ مشہور ہے کہ اس موقع پر شاہی فنکاروں نے ایک نقلی جنازہ کیا اور روتے پیٹتے شاہی نشست گاہ کے سامنے سے نکلے بادشاہ نے دریافت کیا، کون مر گیا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''راگ مر گیا ہے اور ہم اسے دفنانے قبرستان جا رہے ہیں۔''

اورنگ زیب سمجھ گیا۔ اور اس نے مسکرا کر کہا۔ ''قبر گہری کھودنا۔''

(ناہید اسمٰعیل، شاہین اسمٰعیل۔ کراچی)

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

☆☆

شائستہ نصر اللہ کوئلہ جام ضلع بھکر

س: شعاع کے ساتھ تعلق کب سے ہے؟

"شعاع کے ساتھ تعلق زیادہ پرانا نہیں ہے۔ 2018 میں کزن سے لے کر پڑھنا شروع کیا ہے۔"

س۔ دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟

"دن کا آغاز فجر سے ہی ہو جاتا ہے نماز پڑھ کر ناشتہ کرتی ہوں پھر ابو اور بھائی کو آفس بھیج کر صفائی کرتی ہوں کپڑے دھوتی ہوں اور پھر رسالے پڑھنا ساتھ ڈانٹ سننا اور شام کو آٹا گوندھ کر روٹی بناتی ہوں۔"

س۔ بارش کیسی لگتی ہے؟

"سردیوں میں کوفت اور گرمیوں میں مزا آتا ہے۔"

س۔ اپنی خوبیاں اور خامیاں؟

"عشرت سے پوچھا تو اس نے کہا احساس کرتی ہو۔ کسی کا بھی دکھ برداشت نہیں کر سکتیں۔ بہت باتونی ہو۔ بھابھی اور باجی کا کہنا ہے کہ بے موقع بات کر کے معاملہ بگاڑ دیتی ہوں۔ سلمیٰ کا کہنا ہے کہ غصہ جب آتا ہے تو پھر بس۔ کسی کام کے لیے منع نہیں کرتی ہو۔"

س۔ شعاع کی پسندیدہ تحریر؟

"پسندیدہ تحریر عجب تاب، نازنین اور سفر بہترین تحریریں ہیں اور مصباح علی سید اور فرزانہ کھرل کی ہر تحریر پسند ہے۔"

س۔ پسندیدہ کتاب اور شعر؟

"پسندیدہ کتاب قرآن مجید اور ٹوٹا ہوا تارا ناول ہے۔"

ہزاروں منزلیں ہوں گی ہزاروں کارواں ہوں گے
نگاہیں ہم کو ڈھونڈیں گی نجانے ہم کہاں ہوں گے

وہ فرد ہی کیا جو ڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہو

عروج فاطمہ خیر پور میرس

1۔ شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟

"2018ء میں جب میں نائنتھ کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی اس سے پہلے کورس کی کتابیں پڑھتی تھی، کیونکہ مجھے اس سے پہلے غیر نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ پھر دو ہزار اٹھارہ کے بعد سے شعاع اور کرن میں دلچسپی بڑھ گئی۔ پہلے میری چچی اور میری کزنز وغیرہ پڑھتی تھیں تو میں ان سے لے کر پڑھتی لیکن اب میں اپنے رسالے لیتی ہوں۔ اب تو میرے دن نہیں گزرتے جب تک ان کو نہ پڑھوں۔ ان سے مجھے بہت سبق حاصل ہوتا ہے۔"

2۔ دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟

"ہر مسلمان کی طرح فجر کے وقت میری صبح ہوتی ہے۔ میرے بابا کو صبح سویرے اٹھنے کی عادت ہے تو وہ اپنے لیے چائے ناشتہ خود تیار کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں امی، بڑی بہنیں اور پھپھو نماز نہیں پڑھتیں۔ ایک چھوٹا بھائی ہے جو کہ بالکل چھوٹا ہے تو بس پھر میں اور بابا ہی اٹھتے ہیں۔"

3۔ افسانوں کی دنیا کیسی لگتی ہے؟

"ویسے اگر سچ بتاؤں تو اپنے گھر کا ماحول دیکھا جائے تو میں کہانیوں (افسانوں) کی دنیا میں رہنا پسند کروں گی ویسے حقیقت پسند بھی ہوں۔ پر کبھی کبھی افسانوں میں رہنا پسند کرتی ہوں۔"

4۔ خامیاں اور خوبیاں؟

''خامیاں یہ ہیں کہ حد سے زیادہ حساس ہوں۔ اور ہر کسی پر جلدی اعتبار کر لیتی ہوں، چاہے کوئی چھوٹا بچہ بھی ہو، اور خوبی یہ کہ شعاع پابندی سے پڑھتی ہوں ہاہاہا..... معاف جلدی کر دیتی ہوں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ —— تو دن میں بہت سوتی ہوں ہاہاہا.....''

5۔ شعاع میں پسندیدہ تحریر؟ کسی کردار میں اپنی جھلک؟

''ارے پسندیدہ تحریریں تو بہت سی ہیں۔ وہ نازنین، کوری تجھ پہ ہنستا چاند، میری طلب کا چاند، چاند دسترس میں ہے، وہ نازنین فرح بخاری کی جو حال ہی میں اختتام پذیر ہوئی ہے باقی یہ تینوں فرح بھٹو، سحرش بھٹو کی ہیں اور تم سے تم تک ام طیفور کی اور اک دیار رہنے دیا۔ نگہت سیما جی کی، اور زرتاشیہ گل ارباب کی یہ مجھے بہت پسند ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت ہیں لیکن یاد نہیں آ رہی ہیں۔''

6۔ بارش سے لگاؤ۔

''ہاں ہے تو سہی لیکن جب ہم سب کزنز اکھٹے ہوتے ہیں تو۔ باقی اپنے گھر میں جب ہوتی ہوں تو دعا اور سندس والوں کے ساتھ والی بارش یاد آ جاتی ہے، اپنے گھر میں تو بس یادیں ہی آتی ہیں۔ تو بارش اپنے گھر میں اداس لگتی ہے۔''

7۔ پسندیدہ اقتباس؟

اقتباس مکمل (نمرہ احمد)

''اللہ تعالیٰ میں اکثر دیکھتا ہوں لوگ میوزک منعقد کرتے ہیں۔ چیرٹی جمع کرتے ہیں اب کوئی مانے یا نہ مانے اللہ نے موسیقی کی اجازت نہیں دی۔ انسانوں کو نیک کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ اصول کے مطابق ہیں یا نہیں ہیں۔

جو آنا چاہو تو ہزار راستے نہ آنا چاہو تو عذر ہزاروں مزاج برہم، طویل رستہ، برستی بارش، خراب موسم سعدی کا لازوال کردار۔''

8۔ پسندیدہ رائٹر؟

''نگہت سیما، سائرہ رضا، ام طیفور، عمیرہ احمد، فرح بخاری، فرح بھٹو، سحرش بھٹو۔''

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

شائع ہو گئے ہیں

☆ فصل غم کا گوشوارہ — رضیہ جمیل — قیمت: -/300 روپے

☆ زرد موسم — راحت جبیں — قیمت: -/1000 روپے

☆ حساب دل رہنے دو — نبیلہ عزیز — قیمت: -/400 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

1 اچاری آلو

ضروری اشیا:

آلو	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
ٹماٹر	ایک پاؤ
ہری مرچیں	چھ عدد
لہسن، ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت زیرہ	دو چائے کے چمچے
رائی	ایک چائے کا چمچہ
سونف	دو چائے کے چمچے
میتھی دانہ	ایک چائے کا چمچہ
لونگ، کالی مرچ	چند عدد
ثابت دھنیا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
تیزپات	ایک عدد
کلونجی	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچیں	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

سب سے پہلے آلو کاٹ کر مناسب چوکور ٹکڑے کرلیں۔ اب تیل گرم کرکے اس میں رائی ڈال کر کڑکڑائیں پھر زیرہ ڈال دیں لال ہوجائے تو پیاز کے سلائس کرکے ڈالیں جب لائٹ براؤن ہوجائے تو اس میں آلو ڈال کر ہلکا سا تل لیں اس کے بعد ٹماٹر اور ہری مرچیں کاٹ کر ڈالیں ساتھ ہی باقی کا تمام مسالا اور پانی ڈال کر ڈھک دیں جب آلو گل جائیں تو بھون لیں چاہیں تو گریوی رکھ کر دم دے دیں۔

مزیدار اچاری آلو تیار ہیں، ان آلوؤں کو پوریوں اور پراٹھوں کے ساتھ کھایا جاتا ہے اور رائتہ، دہی میں ثابت لال مرچ اور زیرہ ایک ساتھ بھون کر، پیس کر ڈالیں۔ ذرا سا نمک ملا دیں۔ بہت ہی مزہ دیتا ہے۔

2 انڈا گریوی

ضروری اشیاء:۔

انڈے	آٹھ عدد
پیاز	دو عدد
لہسن کے جوے	چار عدد
ادرک	ایک ٹکڑا
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
لونگ	تین عدد
کالی سیاہ مرچ	آٹھ عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
چھوٹی الائچی	دو عدد
دہی	آدھا کپ
ہرا دھنیا	گارنش کے لیے
تیل	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

پیاز، لہسن، ادرک، لال مرچ، نمک، پسی ہلدی، دھنیا، لونگ، سیاہ مرچ، دار چینی، الائچی، دہی ڈال کر اچھی طرح پیس لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کرکے انڈے فرائی کرکے نکال لیں۔ بچا ہوا تمام مسالا تیل میں ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ دو کپ پانی ڈال کر پکائیں حسب پسند مسالا تیار ہوجائے تو ڈش میں انڈے رکھ کر سالن ڈالیں۔ ہرا دھنیا چھڑک کر سرو کریں۔

3 چنا کلیجی مسالہ

ضروری اشیاء:۔

مرغی کی چھاتی	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب پسند
سفید چنے	ڈیڑھ کپ
ٹماٹر	دو عدد
قصوری میتھی	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	تین، چار عدد
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

دیگچی میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز فرائی کریں۔ اس میں لہسن، ادرک ڈال کر بھونیں۔ اب اس میں نمک، لال مرچ اور ہلدی ڈال کر فرائی کریں۔ دہی، ٹماٹر ڈال کر ڈھکن ڈھک کر پکائیں کہ ٹماٹر نرم ہو جائیں۔ چھولے، ایک کپ پانی، قصوری میتھی زیرہ، دھنیا ڈال کر پانچ منٹ پکائیں۔ آخر میں ہرا دھنیا، پسا گرم مسالا اور ہری مرچیں ڈالیں۔ نان کے ساتھ چنا بھجی مسالا پیش کریں۔

مینگو کریم ڈیزرٹ

اشیاء:۔

آم	دو عدد
چینی	چار کھانے کے چمچے
فریش کریم	ڈھائی سو ملی لیٹر
جیلی	ایک پیکٹ
اشرفیاں اور آم	گارنشنگ کے لیے

ترکیب:۔

آم کراش کر لیں یا پھینٹ لیں۔ پیالے میں کریم اور چینی ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹ کر فریج میں رکھیں۔ جیلی بنا کر جما لیں۔

سرونگ ڈش میں پہلے جیلی کی تہ بچھائیں، اس پر آم کے پیسٹ کی تہ لگائیں۔ کریم کی تہ اس طرح لگائیں کہ پورا آم کا پیسٹ کور ہو جائے اور اشرفیوں اور آم کے سلائس سے گارنش کریں۔ مزے دار مینگو کریم ڈیزرٹ تیار ہے، ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

دھواں دہی گوشت

ضروری اشیاء:۔

بکرے کا گوشت	آدھا کلو
ادرک لہسن	تین چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
دھنیا پسا ہوا	دو چائے کے چمچے
تیل یا گھی	ایک چوتھائی کپ
پیاز	چار عدد
دہی	آدھا کلو
سفید الائچی	چار، پانچ عدد
پودینہ	آدھی گڈی
لال مرچ	دو چائے کے چمچے

ترکیب:

دو عدد پیاز کو پیس کر گوشت میں مکس کر لیں۔ اس کے بعد ادرک، لہسن، نمک، لال مرچ اور پسے ہوئے دھنیے کو مکس کر لیں۔ پھر اس میں چار کپ پانی ڈال کر اس کو پکائیں اور گلا لیں۔ تیل ڈال کر گوشت فرائی کریں۔ یہاں تک کہ تیل اوپر آ جائے۔ دہی کو پھینٹ لیں اور اس میں ایک چوتھائی چائے کا چمچہ نمک ملا دیں۔ بقیہ پیاز کو پھولوں کی شکل میں کاٹ لیں۔ دھنیا اور پودینہ بھی کاٹ لیں۔ گوشت کو ایک علیحدہ ڈش میں ڈالیں اور اس پر دہی کی تہ جما دیں۔ پھر پیاز کے پھول ڈال دیں۔ پودینہ کے پتے اور پھر دہی کی تہہ ڈال دیں۔ اس کے بعد پیاز اور پودینہ بچھا دیں۔ اس پر روٹی کا ٹکڑا رکھ کر اس پر کوئلہ گرم کرکے رکھ دیں اور اس کے اوپر تیل ڈال کر ڈھک دیں۔ نان اور تافتان کے ساتھ سرو کریں۔

نرم ملائم، خوب صورت، چمک دار جلد ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے، موسمی اثرات جلد پر تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

اپنی جلد کو صاف ستھرا رکھیں۔ باقاعدگی سے کلینزنگ، ٹوننگ موائچرائزنگ اور مساج کریں۔ ہمارے ہاتھ چہرہ اور گردن کی جلد سب سے زیادہ توجہ چاہتے ہیں۔ اس لیے باقاعدگی سے جلد کی صفائی آپ کی جلد کو چمک دار بنانے کے ساتھ آپ کو تروتازہ اور جوان رکھتی ہے۔

خشک جلد

خشک جلد کو سب سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے، خشک جلد پر جھریاں جلدی پڑتی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں یہ مزید خشک ہوجاتی ہے اور کھنچنے لگتی ہے۔

☆ خشک جلد والی خواتین صابن کے بجائے سوپ فری فیس واش استعمال کریں۔ صابن کے استعمال سے چہرے کا موئچرائز ختم ہوجاتا ہے۔

☆ بادام یا زیتون کے تیل کا مساج خشک جلد والوں کے لیے بہترین ہے۔

☆ ایک چائے کے چمچے شہد میں آدھا چائے کا چمچہ عرق گلاب ملائیں اور چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد دھولیں۔ شہد خشک جلد والوں کے لیے بہترین موائچرائزر کا کام دیتا ہے۔

نارمل جلد

نارمل جلد کی دیکھ بھال آسان ہے۔

☆ نارمل جلد کو بھی موئچرائز کرنے کی ضرورت ہے ورنہ باریک لکیریں اور شکنیں پڑنے لگتی ہیں۔

☆ نارمل جلد کے لیے کیلے کا ماسک بہترین ہے۔ کیلے مسل لیں اور دس منٹ کے لیے چہرے پر لگالیں۔ سادے پانی سے دھولیں۔ یہ جلد کے مردہ خلیات کو ہٹادیتا ہے۔

ملی جلی جلد

ایسی جلد جو بعض حصوں پر روغنی اور دیگر حصوں پر نارمل یا خشک ہو اسے ملی جلی جلد کہتے ہیں۔

☆ ملی جلی جلد کے خشک حصے کو موئچرائز اور چکنے حصے کو صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ کمبی نیشن جلد کے لیے عرق گلاب بہترین ٹانک ہے۔ دن میں کئی بار عرق گلاب کا اسپرے چہرے کو تروتازہ رکھتا ہے۔

☆ پپیتے کو لے کر مسل لیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ پندرہ منٹ کے لیے چہرے پر لگائیں اور سادے پانی سے دھولیں۔ اس سے جلد میں چمک آجاتی ہے۔

چکنی جلد

چکنی جلد کو صفائی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ چکنی جلد دیگر جلدوں کے مقابلے میں دیر سے عمر رسیدگی کی جانب بڑھتی ہے۔ قدرتی آئل چکنی جلد کو باریک لکیروں اور جھریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

☆ ہفتے میں ایک بار چہرے کی کلینزنگ کریں۔

☆ چکنی جلد پر پمپلز ہوجاتی ہے، اسے نہ چھوئیں نہ دبانے کی کوشش کریں ورنہ چہرے پر نشان رہ جائیں گے۔

☆ دن میں آٹھ سے دس گلاس پانی پئیں۔ اور اپنی غذا میں ہرے پتے والی سبزیاں شامل کریں۔

☆ ریفریجریٹر میں ایک پانی کا پیالا رکھیں اور دن میں تین سے چار مرتبہ چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے ماریں یہ چہرے کے مسامات ٹائٹ کرے گا اور آئل کنٹرول بھی ہوگا۔

☆ چکنی جلد کے لیے کھیرے کا ماسک بہترین ہے۔ کھیرا کدوکش کر کے ٹھنڈا کرلیں۔ پندرہ منٹ کے لیے لگائیں اور ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔

☆

نرم ملائم، خوب صورت، چمک دار جلد ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے، موسمی اثرات جلد پر تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

اپنی جلد کو صاف ستھرا رکھیں۔ باقاعدگی سے کلینزنگ، ٹوننگ موائچرائزنگ اور مساج کریں۔ ہمارے ہاتھ چہرہ اور گردن کی جلد سب سے زیادہ توجہ چاہتے ہیں۔ اس لیے باقاعدگی سے جلد کی صفائی آپ کی جلد کو چمک دار بنانے کے ساتھ آپ کو تروتازہ اور جوان رکھتی ہے۔

خشک جلد

خشک جلد کو سب سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے، خشک جلد پر جھریاں جلدی پڑتی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں یہ مزید خشک ہوجاتی ہے اور کھنچنے لگتی ہے۔

☆ خشک جلد والی خواتین صابن کے بجائے سوپ فری فیس واش استعمال کریں۔ صابن کے استعمال سے چہرے کا موئچرائز ختم ہوجاتا ہے۔

☆ بادام یا زیتون کے تیل کا مساج خشک جلد والوں کے لیے بہترین ہے۔

☆ ایک چائے کے چمچے شہد میں آدھا چائے کا چمچہ عرق گلاب ملائیں اور چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد دھولیں۔ شہد خشک جلد والوں کے لیے بہترین موائچرائزر کا کام دیتا ہے۔

نارمل جلد

نارمل جلد کی دیکھ بھال آسان ہے۔

☆ نارمل جلد کو بھی موئچرائز کرنے کی ضرورت ہے ورنہ باریک لکیریں اور شکنیں پڑنے لگتی ہیں۔

☆ نارمل جلد کے لیے کیلے کا ماسک بہترین ہے۔ کیلے مسل لیں اور دس منٹ کے لیے چہرے پر لگالیں۔ سادے پانی سے دھولیں۔ یہ جلد کے مردہ خلیات کو ہٹادیتا ہے۔

ملی جلی جلد

ایسی جلد جو بعض حصوں پر روغنی اور دیگر حصوں پر نارمل یا خشک ہو اسے ملی جلی جلد کہتے ہیں۔

☆ ملی جلی جلد کے خشک حصے کو موئچرائز اور چکنے حصے کو صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ کمبی نیشن جلد کے لیے عرق گلاب بہترین ٹانک ہے۔ دن میں کئی بار عرق گلاب کا اسپرے چہرے کو تروتازہ رکھتا ہے۔

☆ پپیتے کو لے کر مسل لیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ پندرہ منٹ کے لیے چہرے پر لگائیں اور سادے پانی سے دھولیں۔ اس سے جلد میں چمک آجاتی ہے۔

چکنی جلد

چکنی جلد کو صفائی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ چکنی جلد دیگر جلدوں کے مقابلے میں دیر سے عمر رسیدگی کی جانب بڑھتی ہے۔ قدرتی آئل چکنی جلد کو باریک لکیروں اور جھریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

☆ ہفتے میں ایک بار چہرے کی کلینزنگ کریں۔

☆ چکنی جلد پر پمپلز ہوجاتی ہے، اسے نہ چھوئیں نہ دبانے کی کوشش کریں ورنہ چہرے پر نشان رہ جائیں گے۔

☆ دن میں آٹھ سے دس گلاس پانی پئیں۔ اور اپنی غذا میں ہرے پتے والی سبزیاں شامل کریں۔

☆ ریفریجریٹر میں ایک پانی کا پیالا رکھیں اور دن میں تین سے چار مرتبہ چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے ماریں یہ چہرے کے مسامات ٹائٹ کرے گا اور آئل کنٹرول بھی ہوگا۔

☆ چکنی جلد کے لیے کھیرے کا ماسک بہترین ہے۔ کھیرا کدوکش کر کے ٹھنڈا کرلیں۔ پندرہ منٹ کے لیے لگائیں اور ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔

☆